

مرآۃ صدیقی

بیادِ علامہ علاء الدین صدیقی

مرتبہ

پروفیسر ڈاکٹر جمالیہ شوکت

مجلسِ فاضلین علومِ اسلامیہ

جامعہ پنجاب لاہور، پاکستان

۲۹۷۶۹۹۲
ص ۷۷ ج
۷۲۱۹۱

B
S 90
252

جملہ حقوق محفوظ

مرقع صدیقی	کتاب:
پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت	مرتبہ:
مجلس فاضلین علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور	ناشر:
محمد اکرام الحق	کمپوزر:
2003ء	سال اشاعت:
ایک ہزار	تعداد:



مرقع صدیقی

بیادِ علامہ علاء الدین صدیقی

مرتبہ
پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت

مجلسِ فاضلین علوم اسلامیہ
جامعہ پنجاب لاہور، پاکستان

قصص

بکتابخانه ملی افغانستان

کتابخانه ملی افغانستان



علامہ علاؤ الدین صدیقی (۱۹۰۷ء - ۱۹۷۷ء)

رفتید و لے نہ از دلِ ما

فہرست مضامین

9	پیش گفتار
12	علامہ علاء الدین صدیقیؒ ماہ و سال کے آئینے میں
	تاثرات
19	یاد ایام
24	علامہ علاء الدین صدیقیؒ ایک تاثر
27	علامہ علاء الدین صدیقیؒ
29	آہ ایک چراغ اور بجھا ہوا شمع
36	علامہ علاء الدین صدیقیؒ بہت یاد آئیں گے
40	علامہ علاء الدین صدیقیؒ
43	علامہ علاء الدین صدیقیؒ ایم اے
44	علامہ علاء الدین صدیقیؒ ممتاز شاہر
	تعلیم، جید عالم دین اور شعلہ نوا خطیب
47	علامہ علاء الدین صدیقیؒ مرحوم
49	علامہ علاء الدین صدیقیؒ مرحوم
52	علامہ علاء الدین صدیقیؒ مرحوم تحریک
	پاکستان کے سرگرم کارکن
54	استاذ گرامی قدر علامہ علاء الدین صدیقیؒ
60	میرے محسن، میرے استاد، میرے مربی
72	علامہ صدیقیؒ ایک نابغہ روزگار شخصیت
	جسٹس ذکی الدین پال
	پروفیسر عبدالقیوم قریشی
	جناب طالب ہاشمی
	جناب فضل حسین قریشی
	پروفیسر محمد سلیم
	پروفیسر اختر راہی
	ڈاکٹر غلام جیلانی برق
	جناب فخر الدین صدیقیؒ
	قاضی عبدالرسول
	سید طاہر علی رضوی
	سید طاہر علی رضوی
	پروفیسر افتخار احمد چشتی
	پروفیسر حافظ نذر احمد
	پروفیسر حافظ نذر احمد

- علامہ علاء الدین صدیقیؒ
- 79 پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام
- 82 علامہ علاء الدین صدیقیؒ - حضرت لاہوری
- کی عارفانہ صحبت کا ایک پروردہ ممتاز دانشور
- 90 حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ مرحوم اور شگفتگی
- 94 پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
- 99 علامہ علاء الدین صدیقیؒ - بحیثیت معلم
- ایک صاحب طرز خطیب
- 107 پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی
- علامہ علاء الدین صدیقیؒ
- 116 پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت
- علامہ صاحب - ایک مشفق استاد
- 119 خادم اسلام - علامہ علاء الدین صدیقیؒ
- 128 ڈاکٹر قاری محمد طاہر
- علامہ علاء الدین صدیقیؒ کا تحریری سرمایہ
- 141 اتحاد و اتفاق کے علمبردار
- جناب ایس ایم شریف
- 148 استاد محترم جناب علامہ علاء الدین صدیقیؒ کی نذر
- 155 استاذی محترم علامہ علاء الدین صدیقیؒ
- پروفیسر ملک محمد ظہور
- 161 بیاد علامہ پروفیسر علاء الدین صدیقیؒ
- پروفیسر راول محمد یسین خان
- 166 علامہ علاء الدین صدیقیؒ کی شاعری
- ڈاکٹر زاہد منیر عامر
- 173 عالمی اسلامی مذاکرہ
- محترمہ نوشین قدسیہ
- 182 علامہ علاء الدین صدیقیؒ
- بشیر صاحب
- 185 علامہ صاحب اور شعبہ علوم اسلامیہ
- پروفیسر سید محمد طاہر قادری
- پنجاب یونیورسٹی
- 191 علامہ صاحب اور شعبہ علوم اسلامیہ کا قیام
- پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر
- مکالمات رائٹریو
- 197 علامہ علاء الدین صدیقیؒ
- جناب الطاف حسن قریشی

نگارشات (علامہ صاحب کی تحریریں)

(الف) اردو حصہ

251	تقویٰ
255	عہد رسالت مآب میں معاشرتی نظام
259	والدین کے آداب
266	اتحاد بین المسلمین
272	خطبہ صدارت
283	پیش لفظ
285	مکاتیب

(ب) انگریزی حصہ

ABRAHAM and His Influence	3
AL-QURAN "A Guidance for Mankind"	16
RAMADAN "The Month of Fasting"	23
MUHAMMAD "The Universal Prophet"	28
The Attitudfe of Islam	35
Religion and Toleration	52

ISLAM "The Religion of Success"

60

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

64

EID-UL-FITR

68

سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحِيمٍ

71

Muharram

74

Nazul-ul-Qur'an

78

The Holy Quran

83

Islam and Knowledge

90

Muslims of the Word!! Unite

96

Road to Success

103

AL-FATIHAH "The Opening"

107

AL-KITAB (The Book)

110

Prophetic Wisdom

114

The Great Achievement

119

پیش گفتار

جس طرح انفرادی انا کا تسلسل اسی صورت میں ممکن ہے کہ فرد اپنے ماضی کو نہ بھولے، اسی طرح قومی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے اپنے پیش روؤں کے نام اور کام سے واقف رہنا بے حد ضروری ہے۔ مجلس فاضلین علوم اسلامیہ نے اسی حوالے سے بعض محترم شخصیات کو یاد رکھنے کا ایک سلسلہ جاری کیا ہے چنانچہ اسی ضمن میں محترم ملک محمد اسلم صاحب کی یاد میں ایک تقریب ۱۱ مئی ۱۹۹۶ء کو منعقد کی گئی اور بعد ازاں ان کی تصنیف Role of Tradition in Islam شائع کی۔ پھر محترم حافظ احمد یار صاحب کے ذکر خیر کے لیے ایک محفل ۱۶ نومبر ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوئی جس میں پیش کیے جانے والے مقالات و تقاریر کا مجموعہ ”حافظ احمد یار۔ شخصیت اور علمی مقام“ ۲۰۰۱ء میں شائع کر دیا گیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب ہے جس کا موضوع علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم کی ذات والا صفات ہے۔

پروفیسر علامہ علاؤ الدین صدیقی کی شخصیت جامعہ پنجاب کے شعبہ علوم اسلامیہ کے بانی اور بعد ازاں جامعہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اس قدر معروف ہے کہ ان کا کوئی رسمی تعارف پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس جامعہ کے شعبہ علوم اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہونے والے تمام فاضلین بلا واسطہ یا بالواسطہ علامہ صاحب کے تلامذہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ صاحب نے جس درد مندی اور خلوص کے ساتھ اس شعبہ کی بنیاد رکھی اور پھر شبانہ روز محنت سے اسے تقریباً ربع صدی تک چلایا اور ترقی کی اس راہ پر گامزن کر دیا جس پر وہ آج تک رواں دواں ہے۔ وطن عزیز میں دیگر جامعات کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ بھی علامہ صاحب کی قائم کی ہوئی اسی مثال پر استوار ہوئے اور خود جامعہ پنجاب کے زیر نگرانی اس وقت پورے صوبے میں سولہ سے زائد مردانہ و زنانہ کالجوں میں ایم اے کی سطح پر علوم اسلامیہ کا مستقل شعبہ مصروف کار ہے۔ غور کیا جائے تو یہ سب اس مرد قلندر کی پر خلوص مساعی کا فیض ہے۔

”مرقع صدیقی“ کے عنوان سے یہ کتاب علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب کو یاد

کرنے اور اس خراج عقیدت کو صحیحہ بنا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کاوش ہے جو ہزاروں دلوں میں ان کے لیے موجود ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ اس کتاب کے حوالے سے علامہ صاحب کا تعارف نئی نسل کے ان طلبہ و طالبات سے بھی ہو سکے گا جو معنوی اعتبار سے ان کے شاگرد ہیں لیکن جنہیں ان سے ذاتی رابطے کی سعادت میسر نہیں آ سکی۔

اس مرقع کے محتویات کو باعتبار مضامین چند حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ”تاثرات“ ان تحریروں سے عبارت ہے جو علامہ صاحب کے احباب، رفقاء کار، تلامذہ اور عقیدت مندوں نے ان کے بارے میں سپرد قلم کیے۔ ”مکالمات“ کے زیر عنوان علامہ صاحب سے دو شخصی مصاحبے (Interviews) درج کیے گئے ہیں اور آخر میں ”نگارشات“ کے تحت خود علامہ صاحب کے چند رشات قلم یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان ہی کے ضمن میں ان کی بعض ریڈیائی تقریریں اور ایک خطبہ صدارت جن کا متن تحریری صورت میں دستیاب ہو سکا، کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ انگریزی حصے میں اولین مضمون کے علاوہ باقی سب تحریریں علامہ صاحب کی ان نگارشات پر مشتمل ہیں جو ان کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہانہ رسالے The Light of Islam میں منظر عام پر آتے رہے اور جس کی 1966-1968 کی بعض فائلیں ہمیں مل سکیں۔ یہ رسالہ علامہ صاحب نے شاہ چراغ لاہور کے اسلامک سنٹر کی تنظیم World Mission of Islam سے جاری فرمایا تھا۔ اس سلسلے کی بیشتر تحریریں ان اداروں کے ذیل میں آتی ہیں جو وہ ہر ماہ اس رسالے میں تحریر فرماتے رہے۔ تاہم بعض مضامین اس رسالے میں ادارے کے علاوہ مستقل حیثیت سے شائع ہوئے۔ ان سب نگارشات کو زمانی ترتیب سے مرتب کر دیا گیا ہے۔

علامہ صاحب کے ذخیرہ سے ملنے والے کاغذات اور فائلوں کی چھان بین ایک محنت طلب کام تھا جس میں ڈاکٹر قاری محمد طاہر (فیصل آباد) نے ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ہم اس عنایت پر ان کے ممنون ہیں۔ جن حضرات محترم نے قلمی تعاون فرمایا ہم تہہ دل سے ان کے شکر گزار ہیں۔ ضروری ہے کہ اس موقع پر ان تمام خواہرات اور برادران محترم کا بھی شکریہ ادا

کیا جائے جو وقتاً فوقتاً اس قرض کی ادائیگی کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ حق صحیح طور پر ادا نہ ہو سکا۔

آخر میں علامہ صاحب کے تلامذہ میں سے ایک عظیم خاتون کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے جنہوں نے اس کتاب کے تمام مصارف طباعت اپنے ذمے لیے اور اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم سے نوازے۔

جمیلہ شوکت



علامہ علاء الدین صدیقی ماہ و سال کے آئینے میں

3 نومبر 1907ء: علامہ صاحب ۳ نومبر ۱۹۰۷ء شیرانوالہ دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔

نجیب الطرفین تھے۔ سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔
شجرہ طریقت میں سہروردیہ سلسلے سے تھے۔

1912ء: ایک اندازے کے مطابق اس سال ابتدائی تعلیم کا آغاز محلہ کے سکول سے کیا۔

1916ء: اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں داخلہ لیا۔

1923ء: اسلامیہ ہائی سکول ہی سے میٹرک پاس کیا۔ یہاں کے دو اساتذہ جناب دین

محمد اور مولانا فضل میراں سے بالخصوص متاثر ہوئے جو قرآن حکیم کے درس
تدریس سے تعلق کا سبب بھی بنے۔

1925ء: ایف سی کالج لاہور سے ایف اے (انٹرمیڈیٹ) کا امتحان پاس کیا۔

علامہ صاحب یہاں کے عیسائی اساتذہ کے مشنری جذبات و خدمات سے
بہت متاثر ہوئے۔

1928ء: گورنمنٹ کالج (موجودہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی) لاہور سے بی اے آنرز کیا۔

1928ء: امسال غالباً پنجاب گورنمنٹ میں بحیثیت کلرک ملازمت کا آغاز کیا بطور

پنجایت آفیسر ہوشیار پور تبدیلی ہوئی اور اس کے بعد پنجاب سیکرٹریٹ میں
اسٹنٹ کے عہدہ پر تعینات ہوئے۔ پنجاب روڈ ٹرانسپورٹ کے دفتر میں

بطور سپرنٹنڈنٹ بھی کام کیا۔

1928ء: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آقا بیدار بخت کے ادارے دارالسنہ شرقیہ

سے اسی سال وابستہ ہوئے اور ۱۹۳۶ء تک اس ادارے کے پرنسپل رہے۔

1929ء: پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے ایم اے کیا۔

1932ء: رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔

1935ء: ایم۔ او۔ ایل کا امتحان پاس کیا۔

1935ء: پنجاب یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔

1935ء: اندازہ ہے کہ 1935ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور تحریک

پاکستان کے پر جوش حامی و داعی اور بلند آہنگ نقیب بنے۔ قریہ قریہ، بستی بستی پھر کراچی پر جوش خطابت کے ذریعے لوگوں کو تحریک پاکستان اور نظریہ پاکستان سے متعارف کرایا۔

1935/1937ء: مسجد شاہ چراغ میں درس کا آغاز کیا۔ یہ درس بعد نماز عصر ہوتا۔
مولانا احمد علی لاہوری کے منہج پر ہوتا۔

1945ء: تحریک پاکستان کے لیے یکسوئی سے کام کرنے کے لیے حکومتی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

1945ء: اسلامیہ کالج میں بطور استاد دینیات تعیناتی ہوئی۔

1946ء: ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء میں جمعیت علمائے اسلام پنجاب کے ناظم مقرر ہوئے۔

1946ء: پٹنہ اور سندھ میں جمعیت العلمائے اسلام کے زیر اہتمام پاکستان کانفرنس کے کلیدی خطیب۔

1946ء: جامع مسجد آسٹریلیا میں درس قرآن کا آغاز کیا۔ درس قرآن مسجد شاہ چراغ میں بعد از نماز عصر ہوتا۔

1946ء: صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بنے اور مسلم لیگ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر بھی بنے۔

- 1946ء: ڈلہوزی (انڈیا) خطبہ جمعہ کے لیے تشریف لے گئے۔
- 1946ء: دین سے لگاؤ اور خدمت کے جذبے کے تحت مسجد شاہ چراغ سے متصل دو اداروں جامعہ اسلامیہ جمعیت اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔ جامعہ اسلامیہ میں درس قرآن، حدیث اور فقہ کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک شعبہ فن خطابت کا بھی تھا۔ لاہور کے قرب و جوار کے دفاتر مثلاً اے جی آفس اور ہائی کورٹ کے وکلاء حضرات پڑے شوق سے ان کلاسز سے استفادہ کرتے۔
- 1947ء: خضر وزارت کے خلاف سول نافرمانی تحریک میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔
- 1947ء: صوبہ بہار کے مہاجرین بے سروسامانی کی حالت میں آئے تو ان کی دیکھ بھال اور مدد کے لیے بہار ریلیف سوسائٹی قائم ہوئی۔ علامہ صاحب اس سوسائٹی کے سیکرٹری تھے۔
- 1948ء: مسلم لیگ صوبہ پنجاب کی صدارت کے لیے جناب ممتاز دولتانہ کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ ایک متوسط خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے ایک بااثر زمیندار، سرمایہ دار طبقہ کے فرد کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس طرح دولتانہ صاحب جیت گئے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب علامہ صاحب نے کوچہ سیاست کو خیر باد کہا اور نوزائیدہ اسلامی مملکت میں دین کی تبلیغ و ترویج اور تعلیم و تدریس کی طرف یکسوئی سے مصروف ہو گئے۔
- 1950ء: پنجاب یونیورسٹی نے ایم اے کی سطح پر اسلامیات کی تدریس کے لیے شعبہ قائم کیا۔ اس شعبہ کو قائم کرنے کے لیے وائس چانسلر جامعہ پنجاب نے اسلامیہ کالج سے علامہ صاحب کو یونیورسٹی آنے کی دعوت دی۔ علامہ صاحب اس شعبہ کے مؤسس اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ علامہ صاحب نے نہایت مختصر وقت میں نہ صرف نصابات کی تفصیل و تشکیل میں نمایاں خدمات

سرا انجام دیں، بلکہ نصاب میں شامل مضامین کی تدریس کے لیے اس وقت کے اجل علماء و اساتذہ کرام مثلاً ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، پروفیسر علم الدین سالک وغیرہ کی خدمات جلیلہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

1951ء: تحریک ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دو سال تک ہر صوبہ اور علاقہ میں منعقد کانفرنسوں اور اجتماعات میں اپنی شعلہ نوا تقریروں سے عوام کے دلوں کو گرمایا اور حب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جذبے کو بیدار کیا۔

1957ء: پنجاب یونیورسٹی میں ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا۔ علامہ صاحب نے اس مذاکرہ کے انتظام و انصرام میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

1963ء: ۱۹۶۳ء کے پر آشوب دور میں مختلف فرقوں اور گروہوں کے درمیان اتحاد کے لیے کامیاب مساعی کیں۔

1964ء: اسلامی مشاورتی کونسل (موجودہ نام اسلامی نظریاتی کونسل) کے چیئرمین متعین ہوئے۔ علامہ صاحب اس کونسل کے ۱۹۷۳ء تک چیئرمین رہے۔ اس عرصے میں کونسل کی مختلف کمیٹیوں نے حکومت کی طرف سے پوچھے گئے اہم سوالات و مسائل کے قرآن و سنت کی روشنی میں تجاویز مرتب کیں اور تنفیذی ادارے کو بھی بھیجی گئیں۔

1965ء: اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے قائم مقام صدر بنے۔

1966ء: مسجد شاہ چراغ کے ذیلی اداروں جامعہ اسلامیہ اور جمعیت اسلامیہ جو عوام میں دین کا شعور بیدار کرنے اور تعلیمات اسلامی کی ترویج میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس میں توسیع کی گئی اور ورلڈ مشن آف اسلام قائم کیا تاکہ اسلام کا پیغام دنیا تک پہنچا کر 'خیر الامۃ' کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوا جائے۔

1966ء: انگریزی میں ایک رسالہ Light of Islam جاری کیا۔ اس کا مقصد ملک

اور بیرون ملک انگریزی خواں طبقے کے لیے تعلیمات اسلامی کو پہنچانا تھا۔

علامہ صاحب اس رسالے کے چیف ایڈیٹر تھے۔ علامہ صاحب نے اس

رسالے میں ادارے اور مستقل مضامین تحریر فرمائے۔ جو ”مرقع صدیقی“

میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس رسالے کی دسمبر 1967 تا دسمبر 1968ء

تک کے شمارے مل سکے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ غالباً علامہ صاحب بے پناہ

مصروفیات کے باعث اس کی طرف توجہ نہ دے سکے اور غالباً اس کام کو

آگے بڑھانے اور جاری رکھنے کے لیے انہیں کوئی موزوں آدمی نہ ملا۔

1966ء: علامہ صاحب کی سربراہی میں ایک ”بین الاقوامی اتحاد عالم کانفرنس“ شعبہ

علوم اسلامیہ کے زیر انتظام منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ملک کے نامور

اہل علم کے علاوہ جناب عبدالقہار نے عراق اور محترمہ مریم بہنام نے ایران

کی نمائندگی کی۔

1969ء: اسلامی نظریاتی کونسل نے دیگر اہم سفارشات کے ساتھ حکومت سے سفارش

کی کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں عربی زبان کو دوسری لازمی زبان

(یعنی اردو اور اس وقت بنگلہ زبان کے بعد) قرار دیا جائے۔

1973ء: فالج کا حملہ ہوا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شفا یاب ہوئے۔

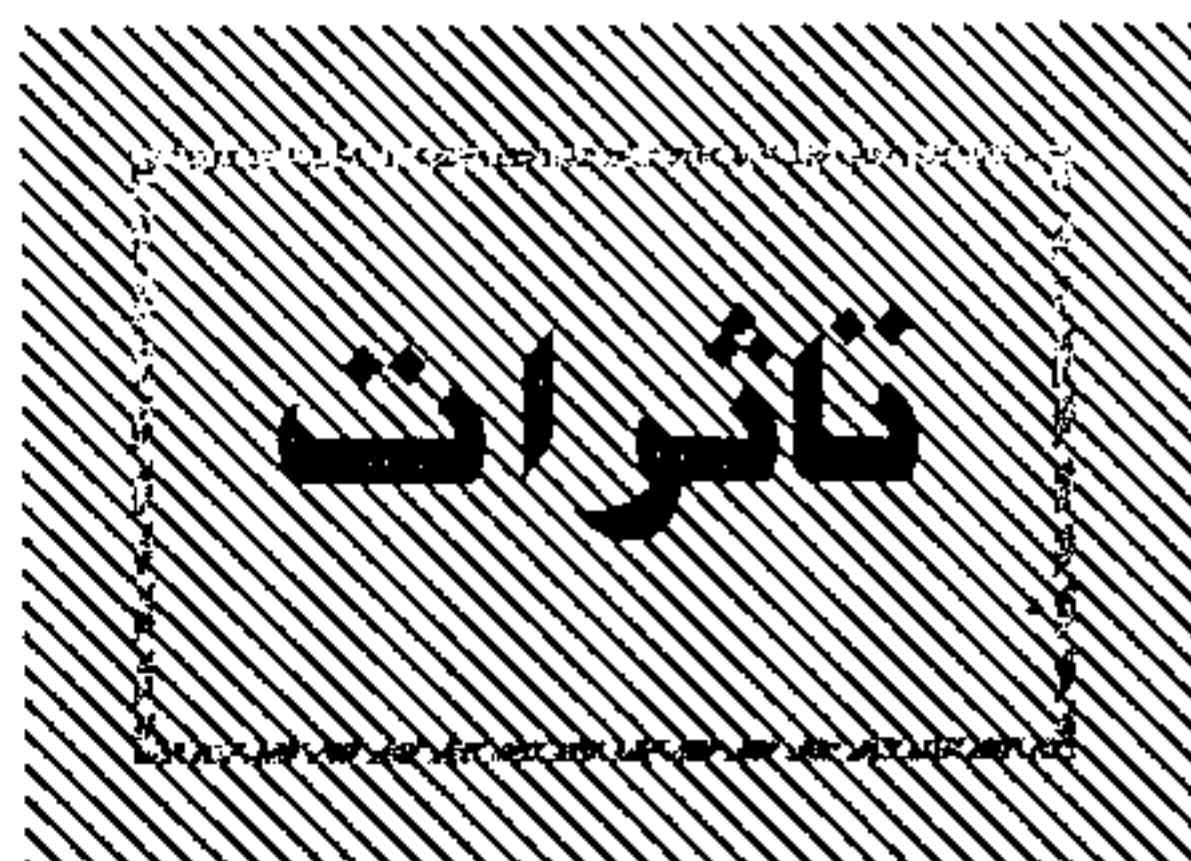
1977ء: دوبارہ فالج کا حملہ ہوا۔ میوہسپتال میں زیر علاج رہے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء کو

وہ گھڑی آن پہنچی جو ہر ذی روح کے لیے اٹل ہے۔ آپ اپنے اہل خانہ،

اعزہ واقارب احباب و شاگردوں کو غمگین اور اداس چھوڑ کر ابدی زندگی کی

طرف روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ کریم ان کو درجات عالیہ

سے نوازے۔ (آمین)



یادایام

جسٹس ذکی الدین پال

۲۳ مارچ کا دن ہماری تاریخ، بلکہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی تاریخی دن نے تحریک پاکستان کو جنم دیا اور اسی تحریک کے دوران فکری و عملی سیاست کے محاذوں پر متعدد قابل ذکر شخصیات نمودار ہوئیں۔ انہی میں سے ایک نہایت معتبر اور نامور شخصیت علامہ علاؤ الدین صدیقی کی تھی۔ ۱۹۵۷ء کا المیہ مغلیہ دور کا منطقی نتیجہ تھا۔ اسے جنگ آزادی اور جہاد کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ تمام کوشش ان لوگوں نے شروع کی تھی جو حقیقی آزادی کے آرزو مند تھے۔ مگر ان کے ساتھ کچھ طالع آزمایا بھی شامل ہو گئے تھے کیونکہ مغلوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور انگریز متعدد علاقوں کا انتظام سنبھال چکا تھا۔ اس مقامی معززین اور خصوصاً مصبدار جو برسر اقتدار تھے انگریزوں نے انہیں خرید کر اپنے دام میں پھانس لیا تھا۔ مغلوں کا اقتدار اگرچہ ہر جہت سے محیط تھا، تاہم انہوں نے مذہبی ریاست قائم نہیں کی تھی یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کی اکثریت کو مسلمانوں سے کسی بے جا دباؤ کی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ سرکار کے دربار میں ان کی پذیرائی برابر کی سطح پر ہوتی تھی۔ مگر مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ مغلیہ سلطنت ہی ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ مسلمان من حیث القوم ختم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مغلوں کے جانے کے بعد انگریز رفتہ رفتہ مضبوط ہوتا چلا گیا اور ہندوؤں یا دیگر عناصر نے انگریز کا ساتھ دے کر نہ صرف اس کی حکومت کو مستحکم کیا بلکہ مختلف انداز سے انگریز کی نوازشات سے بہرہ مند ہوتے رہے۔ مغلیہ دور میں کوئی مرکزی فوج نہیں ہوتی تھی۔ صرف جاگیردار یا حکومت کے پسندیدہ منصب دار سرکاری مراعات کے بدلے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق فوجی دستے تیار کرتے تھے، جو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر بلائے جاتے تھے۔ مغلیہ دور کی اس فوجی حکمت عملی کی وجہ سے مغلوں کے

پاس سلطنت کے شایان شان کوئی فوج نہیں تھی۔ اس کے مقابلے پر انگریز نے باقاعدہ فوج کا شعبہ قائم کیا۔ چھاؤنیاں بنائیں اور ان کا انتظام انگریز فوجی افسروں کے سپرد کیا گیا۔ اگرچہ ہندوستان کے وفادار فوجی افسر بھی ان کی اعانت کرتے تھے۔ ہندوستانی لوگ مختلف قبیلوں سے نکل نکل کر انگریزی فوج میں داخل ہوتے رہے۔ اور یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ انگریز نے دو عالمی جنگیں اپنی اسی حکمت عملی کی وجہ سے جیتی تھیں کہ اس نے فوج کو محض وردی اور پریڈ کا نام نہیں دیا تھا۔ بلکہ بڑے ماہرانہ اور شاطرانہ انداز سے فوج کو دفاعی حکمت عملی کے لیے اعلیٰ تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا۔ انگریز کی اسی حکمت عملی نے اس کے پاؤں مضبوط کیے اور اس کی حکومت کو استحکام بخشا۔

انگریز کے جانے کے بعد دینی حلقوں نے جدید تعلیم کی ضرورت کو نہ صرف نظر انداز کر دیا، بلکہ اس کی شدید مخالفت کی۔ ان حالات میں سرسید احمد خان نے بے پناہ اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے علی گڑھ تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو اس طرف راغب کرنے کے لیے ملک کے کونے کونے میں اپنا پیغام پہنچایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملی احساس رکھنے والے مسلمان لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے اور طلبہ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا اور علی گڑھ کا تعلیم یافتہ طبقہ فخریہ انداز میں اپنے نام کے ساتھ ”علیگ“ لکھنے لگا۔ علاوہ ازیں بہت سے خاندانوں نے اپنے ہونہار بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ میں بھیجنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود مسلمان علماء کی ایک بڑی اکثریت نہ صرف انگریزی تعلیم کے خلاف تھی بلکہ انگریزی تہذیب و تمدن کی ترقی کو دیکھ دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں انگریز کے لیے نفرت کا بیج بو رہی تھی۔ مسلمانوں کی اس صورت حال کے پہلو بہ پہلو ہندوؤں کی اکثریت انگریز کے جانے کے بعد ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مسلمان چونکہ ہندوستان کا حکمران رہ چکا تھا، اس لیے انگریز کی نظر میں معتب تھا اور ہندو، جو انگریز کی شاطرانہ چال سمجھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اس کی ترجیحات کا محور تھا۔ دینی حلقوں کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود علی گڑھ تحریک کو قبولیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ علی برادران کی علیحدگی اور جامعہ ملیہ کا قیام ایک متوازی تحریک دکھائی دیتی تھی اور دینی لوگوں کو کسی حد تک ہندو کانگریس کی تائید بھی حاصل

تھی، مگر سرسید اور ان کے مخلص ساتھیوں کی بدولت علی گڑھ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ اس وقت سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی کوئی ٹھوس تنظیم موجود نہیں تھی۔ اس لیے کہ مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں ہوا تھا اور سرسید ۱۸۹۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اس لیے سیاسی افق پر کانگریس ہی غالب تھی۔ ایک مرحلے پر قائد اعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا پیغامبر کہا گیا، مگر اس کے باوجود قائد اعظم نے ۱۹۲۰ء میں کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔ کیونکہ وہ کانگریس لیڈروں کی جانبداری گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ سیاست کو خیر باد کہہ کر برطانیہ جا کر پریوی کونسل میں وکالت شروع کر دی۔ اس مرحلے پر علامہ اقبال کا درد مند دل دھڑک اٹھا۔ انہوں نے قائد اعظم سے قلمی رابطہ کیا اور برطانیہ میں مقیم بعض مسلمان بزرگوں کے ذریعے قائد اعظم کو وطن آنے کے لیے راضی کیا گیا۔ چنانچہ قائد اعظم واپس آ کر دوبارہ سیاست میں مشغول ہو گئے۔ اسی دور میں ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اپنا تاریخی خطبہ الہ آباد کے مسلم لیگ تاریخی اجلاس میں پیش کر کے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ اب مسلم لیگ کو قائد اعظم کی قیادت و صدارت مل گئی، اس لیے اس نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء کا وہ تاریخی دن یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء پہنچا۔ جس میں قرارداد پاکستان بالاتفاق منظور کی گئی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور مسلم لیگ کی سرگرمیوں اور قائد اعظم کی مثالی قیادت کے طفیل ایک مثالی دور قرار پایا۔ اگرچہ اس دور کی ریشہ دوانیاں اور بعض اپنوں کی نامہربانیاں عروج پر تھیں، مگر پھر بھی مسلمانوں کے ایک کثیر طبقے نے قائد اعظم کی قیادت پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی تمام تر توانائیاں حصول پاکستان کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ایسے لوگوں کا تذکرہ طویل ہے اور اس مختصر سے مضمون میں ان کے نام گنونا بھی مشکل ہے۔ ہاں اس گروہ میں ایک نمایاں اور ابھرتی ہوئی شخصیت علامہ علاؤ الدین صدیقی کی تھی، جنہیں ہمیشہ قدم قدم پر اپنے برادر اکبر شاہ دین صاحب صدیقی کی معاونت اور رہنمائی حاصل رہی۔ اس دور میں دینی اور مذہبی حلقے متحدہ قومیت کے جال میں پھنسے ہوئے تھے اور تو اور خود مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور بعض دیگر اکابر بھی متحدہ قومیت کے حق میں رطب اللسان تھے۔ بعض تو اتنے متشدد تھے کہ وہ پاکستان کی ”پ“ کا بننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، بلکہ ”پاکستان“ کو خاکم بدہن ”پلیدستان“ کے نام سے پکارتے تھے۔ ادھر مسلم لیگ میں

اگرچہ دین اور مذہب کا تذکرہ ہوتا تو تھا، مگر یہ تاثر بھی زوروں پر تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت مسلمانوں کے دینی ورثے کا تحفظ نہیں کر سکتی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ہم مسلمان ہندوستان میں محض اشاعت دین کے لیے آئے تھے۔ مگر ہم اپنا یہ دینی فریضہ ادا نہیں کر سکے۔ اس لیے الگ وطن کا مطالبہ خلاف حقیقت ہے۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی مشرقی و مغربی علوم سے بہرہ ور تھے۔ وہ اپنی دفتری زندگی میں بے داغ کردار اور سیاسی ادراک کی وجہ سے اپنے حلقہ احباب میں کافی مقبول تھے۔ یہ وہ دور تھا، جب مسلمان ہندوستان میں ایک نازک موڑ پر کھڑے تھے۔ ادھر انگریز اور ہندو باہم شیر و شکر ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کا ایک معتبر طبقہ کانگریس کے جال میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اب تحریک پاکستان کا چرچا زوروں پر تھا۔ قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ تحریک کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ اس لیے جولیڈر بھی مسلم لیگ سے وابستگی رکھتا تھا وہ کھل کر میدان میں آتا گیا اور اس نے قدمے، سنے، درمے اور قلمے مسلم لیگ کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ اسی گروہ سے علامہ علاؤ الدین صدیقی بھی نکلے اور انہوں نے متعدد شہروں اور دیہات کے دورے کیے۔ سرحد میں ریفرنڈم کے تاریخی موقع پر علامہ صاحب خود صوبہ سرحد پہنچے اور خدمات بجالائے۔ راقم الحروف مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی رابطہ عوام مہم کے تحت صوبائی الیکشن کے دوران فیروز پور بذریعہ ریل جا رہا تھا کہ اچانک علامہ موصوف سے مجھے ہم سفری کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارے ساتھ ایک باریش مولوی صاحب اور دو ہندو تاجر بھی سفر کر رہے تھے۔ ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ مولوی صاحب کی توجہ ہماری باتوں کی طرف مبذول ہوئی۔ انہوں نے فوراً مداخلت کی اور فرمایا ”محمد علی جناح جیسا بابو اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی اور حفاظت کیونکر کر سکتا ہے؟ یہ فرض تو صرف جمعیت العلماء ہند ہی بجالا سکتی ہے“۔ مولوی صاحب مذکور کی یہ بات سن کر علامہ مرحوم نے فرمایا: جمعیت نے بہار اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں کا تحفظ کیوں نہیں کیا؟ کیا ہندو اکثریت نے اس صوبے کی وزارت بنانے کے بعد ان پر مظالم نہیں ڈھائے۔ کیا ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرتے ہوئے ان کے حقوق غصب نہیں کیے؟ کیا وہاں قتل و غارت کا بازار گرم نہیں ہوا؟ حتیٰ کہ پنڈت نہرو مسلمانوں کی اشک شوقی کے لیے خود وہاں جانے کے لیے مجبور ہوئے۔ اس پر وہ ہندو تاجر

بولے کہ اگر رواداری سے کام لیا جاتا، تو فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہی نہ۔ علامہ صدیقی نے کہا ”رواداری اور برداشت کی خاطر مسلمان لیڈروں نے کانگریس سے آخر تک تعاون کیا، مگر ہندو جاتی نے برتری کے نشے میں مسلمان اقلیت کو ہر اعتبار سے مغلوب کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں نے غیر ضروری چشم پوشی سے کام لیا۔ مسلمانوں نے اپنے رضا کاروں کے جذبے سے انگریزوں کو چلتا کیا۔ اگرچہ نہرو رپورٹ میں برائے نام طفل تسلیاں دے کر مسلمانوں کو خاموش کرنے کی کوشش کی گئی۔“ اس پر کانگریسی مولوی صاحب اور ان کے تاجر ساتھی چپ سادھ گئے اور بات یہیں ختم ہو گئی۔ علامہ مرحوم قیام پاکستان کے بعد دس سال تک اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین رہے۔ انہوں نے اسلام کی سر بلندی کے لیے متعدد تجاویز پیش کیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے صدر رہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وہ تحریک پاکستان کے ساتھ نمودار ہونے والی ممتاز شخصیات میں سے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر پاکستان کے اساسی نظریے کی اشاعت و ترویج کی، حالانکہ ان کے بعض ہم سفر و ہم عصر پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش رہے اور انہوں نے ہر طور پر قیام پاکستان کی راہ میں روڑے اٹکانے سے بھی گریز نہ کیا۔ مگر علامہ مرحوم پر کوئی تعلق اور کوئی ہم سفری اثر انداز نہ ہو سکی۔



علامہ علاء الدین صدیقی - ایک تاثر

پروفیسر عبدالقیوم قریشی

علامہ علاء الدین صدیقی اور میں قدیم لاہور کے ایک ہی علاقے میں بدتوں رہتے رہے۔ مگر چونکہ ہماری عمر میں قریباً بیس سال کا فرق تھا اس سے علامہ کا شمار بزرگوں میں ہوتا تھا اور میرا لڑکوں میں۔ جب علامہ نے اسلامیہ کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو میں بھی ایک جونیئر استاد کی حیثیت سے کالج کے شعبہ فزکس سے منسلک ہو چکا تھا اور ہم نے تحریک پاکستان کے ولولہ انگیز دور میں کئی معرکوں میں اکٹھے حصہ لیا۔ اس وقت جو واقعہ میرے ذہن میں ابھر رہا ہے وہ علامہ کی اس تقریر کا نقشہ ہے جو انہوں نے اسلامیہ کالج کے طالب علموں عبدالملک کی شہادت پر حبیبیہ ہال میں کی۔ یہ تحریک پاکستان کے عروج کا زمانہ تھا۔ نو جوان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہو چکے تھے۔ قائد اعظم کی طرف سے بھی حصول مقصد کے لیے سردھڑکی بازی لگا دینے کا اشارہ مل چکا تھا اور ایک ساتھی کی شہادت نے نو خیز جذبات میں وہ اشتعال پیدا کر دیا تھا جو کسی صورت قابو میں نہ آتا تھا۔ دشمنوں کی سازش بھی یہی تھی کہ مسلمان خون خرابے پر اتر آئیں اور اپنے موقف کو خود ہی دفن کر دیں۔ اب ایک شعلہ بیان مقرر کے لیے جذبات کو ابھارنا تو بڑی آسان بات ہے مگر مشتعل جذبات کو صحیح ڈگر پر لے آنا نہایت مشکل کام ہے لیکن علامہ نے یہ کام ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ پھرے ہوئے نو جوان نظم و ضبط کا پیکر بن گئے اور دشمنوں کی توقعات خاک میں مل گئیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ علامہ جس نظم و ضبط کی تلقین کر رہے تھے اس پر وہ خود بھی سختی سے عمل پیرا تھے۔

علامہ موصوف کی وائس چانسلری کا دور وہ پر آشوب زمانہ تھا جب کھر صاحب نئے نئے گورنر بنے تھے اور سقوط ڈھاکہ کا زخم ابھی تازہ تھا۔ معاشرے کے ہر طبقے کی طرف سے مطالبوں کی بھرمار تھی طلبہ تھے اپنے مطالبات لیے پھرتے تھے، اساتذہ تھے تو ان کے اپنے

مسائل تھے اور کلیئر یکل سٹاف تھا تو وہ بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔ پھر اس وقت کی حکومت بھی نظم و ضبط کی دلدادہ نہ تھی بلکہ ہيجان و انتشار کو اپنا طرہ امتیاز سمجھتی تھی طلبہ کے مابین گولیاں عام چلتی تھیں۔ اساتذہ بھی مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور یہی جال ایڈمنسٹریٹو اور ٹیکنیکل سٹاف کا تھا۔ اس وقت میں یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا ممبر تھا اور علامہ صاحب وائس چانسلر کی حیثیت سے سنڈیکیٹ کی صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ میٹنگوں میں ان کا رویہ ایک بالکل غیر جانبدار پریذائڈنگ آفیسر کا ہوتا تھا جس کا کام فیصلوں پر اثر انداز ہونا نہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے انہیں متفقہ طور پر طے کرانا تھا۔ چنانچہ میں نے کم و بیش تین سال کے دوران علامہ کو کسی ایک موقع پر بھی کسی معاملے میں اثر انداز ہوتے نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ یونیورسٹی کے ایک استاد کی ترقی اور تقرری کا مسئلہ سنڈیکیٹ میں پیش ہوا۔ ضابطے کے مطابق سلیکشن بورڈ نے مجوزہ ترقی کی سفارش کی تھی۔ مگر سنڈیکیٹ کے بعض ممبران ترقی کے حق میں نہ تھے اس لیے انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ میں ان چند ممبروں میں سے تھا جو اس تقرری کے حق میں تھے کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ جب سلیکشن بورڈ نے دونوں امیدواروں کو (جن میں سے ایک خارجی اور ایک داخلی امیدوار تھا) جانچ پرکھ کر ایک امیدوار کی تقرری کی سفارش کی ہے تو ہم سلیکشن بورڈ پر عدم اعتماد کا اظہار کیے بغیر اس تقرری کو رد نہیں کر سکتے اور ہمارے پاس سلیکشن بورڈ پر اعتماد نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ چنانچہ کافی بحث و تمحیص کے بعد مجوزہ تقرری منظور کر لی گئی۔ مگر علامہ حسب عادت بالکل خاموش، ممبروں کی نوک جھونک سنتے رہے۔ میٹنگ کے بعد علامہ نے مجھے تحسین کے لہجے میں فرمایا کہ آپ نے بہت اچھا نکتہ اٹھایا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو شاید یہ تقرری نہ ہوتی اور ایک حق دار اپنے حق سے محروم ہو جاتا۔ میں نے حیرانی کے لہجے میں علامہ سے پوچھا کہ اگر آپ یہ سمجھتے تھے کہ کسی حق دار کے حق کے چھن جانے کا احتمال ہے تو آپ نے میٹنگ سے پہلے مجھ سے بات کیوں نہ کر لی تاکہ میں اس معاملے کا زیادہ تفصیل سے مطالعہ کر لیتا اور چونکہ میری اس وقت ایک اور میٹنگ تھی اس لیے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں حاضر ہی نہ ہوتا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں میٹنگ سے پہلے آپ سے بات کرتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ میں اس معاملے میں اثر انداز ہو رہا ہوں جو میرے

اصول کے خلاف ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ صاحب جن کی ترقی اور تقرری کا مسئلہ درپیش تھا علامہ صاحب کے ساتھ مجھ سے بھی زیادہ قریبی روابط رکھتے تھے مگر علامہ موصوف نے ایسی اصول پرستی کا مظاہرہ کیا جو قائد اعظم کے کردار کا خاصہ تھا اور شاید انہیں سے یہ وصف انہیں ورثے میں ملا تھا۔ اب اگر آپ یہ اندازہ کرنا چاہیں کہ علامہ علاؤ الدین صدیقی کس حد تک کامیاب وائس چانسلر تھے تو یہ اندازہ اس امر سے کیجئے کہ ان کے عہدے کی معیاد کا زیادہ حصہ پاکستان کی تاریخ کے بدترین دور پر منطبق تھا جب شرافت و نجابت کی تمام اقدار پامال ہو چکی تھیں اور اخلاقی گراؤٹ اور بے راہ روی کا دور دورہ تھا اور حکومت خود بھی غنڈہ عناصر کی پشت پناہی کرتی تھی مگر ان حالات میں بھی کبھی کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ سنڈیکیٹ کی کسی میٹنگ میں کوئی ہنگامہ آرائی ہوئی ہو یا کوئی مسئلہ متفقہ طور پر طے نہ پایا ہو یا علامہ موصوف کو کسی معاملے میں دخل دینا پڑا ہو۔ میرے خیال میں عمدہ ایڈمنسٹریشن کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ مورخہ ۷ جنوری ۱۹۷۸ء)



علامہ علاؤ الدین صدیقی

☆ جناب طالب ہاشمی ☆

یہ کوئی ترین چون سال پہلے کی بات ہے کہ لاہور میں علامہ علاؤ الدین صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ لاہور ہائی کورٹ سے متصل مسجد شاہ چراغ میں نماز جمعہ سے پہلے تقریر کیا کرتے تھے اور اپنے علم و فضل کی بناء پر عامۃ المسلمین میں علامہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ (اہل لاہور بڑے مردم شناس تھے اور علامہ کا لقب شاذ ہی کسی کو دیتے تھے) حسن اتفاق سے راقم الحروف اس زمانے میں پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور کے دفتر میں ملازم تھا۔ یہ دفتر جنرل پوسٹ آفس (G.P.O) لاہور کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ مسجد شاہ چراغ ہمارے دفتر کے بالکل قریب تھی اس لیے دفتر کے تمام مسلمان ملازمین جمعہ کی نماز مسجد شاہ چراغ میں ادا کیا کرتے تھے۔ (یہ انگریز کی حکومت کا زمانہ تھا۔ جمعہ کو پورے دن کام ہوتا تھا، ۱۰ بجے سے چار بجے تک، البتہ مسلمان ملازمین کو نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے دو گھنٹے کی چھٹی دی جاتی تھی) علامہ علاؤ الدین صدیقی نہایت شریف النفس اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ بالفاظ دیگر اگلے وقتوں کی شرافت کا سچا نمونہ تھے۔ وہ دینی اور دنیوی دونوں طرح کے علوم میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ قدیم و جدید علوم پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ بڑے جوش، روانی اور بلند آہنگی سے تقریر کیا کرتے تھے۔ مجال ہے کہ دورانِ تقریر میں کہیں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے۔ تقریر ہمیشہ اردو زبان میں ہوتی تھی اس میں وہ قرآن و حدیث سے بکثرت استدلال کرتے تھے اور عربی و انگریزی جملے مناسب موقعوں پر بے تکان استعمال کرتے تھے۔ ان کا اسلوب خطابت بڑا منفرد اور پرتاثر

☆ آپ علوم اسلامیہ بالخصوص تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ متعدد موقع تالیفات کے مؤلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے۔

ہوتا تھا۔ سامعین میں ہائی کورٹ کے مسلم جج صاحبان اور دوسرے ملازمین کے علاوہ نزدیکی دفاتر کے سینکڑوں اہلکار بھی شامل ہوتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ علامہ صاحب بول رہے ہوں اور لوگ اکتا جائیں، وہ تو یوں ساکت و صامت ہوتے تھے گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔ اگر ہم علامہ صاحب کو علوم و معارف کا آفتاب کہیں یا بحرِ خار، اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے خطبے نہ صرف ولولہ انگیز ہوتے تھے بلکہ ان میں وسعت نظر اور روشن ضمیری بھی بدرجہ اتم موجود ہوتی تھی اور پھر گداز قلب اس پر مستزاد۔ آج بھی جب وہ یاد آتے ہیں تو زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ جاتے ہیں:

ع ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
یہ ہمہ صفت موعوف ہستی جب اس دنیا سے رخصت ہوئی ہوگی تو امید ہے کہ خلد
بریں کی فضاؤں نے اس نشید جانفزا کے ساتھ اس کا استقبال کیا ہوگا:
سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا



آہ۔ ایک چراغ اور بجھا

(سانحہ ارتحال علامہ علاؤ الدین صدیقی)

فضل حسین قریشی ایم۔ اے

۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کو جناب علامہ علاؤ الدین صدیقی ہمیں داغ مفارقت دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اس دور قحط الرجال میں آپ کی شخصیت روشنی کی درخشاں قندیل تھی، جواب بجھ گئی۔ چار برس آپ فالج کے موذی مرض میں مبتلا رہے۔ خدا کے فضل و کرم سے حواس اور ذہنی توانائی بدستور قائم تھی۔ آپ کلمہ طیبہ اور درود پاک کا ورد کرتے ہوئے خندہ پیشانی سے ہدیہ جان جہاں آفرین کے حوالے کر کے ابدی نیند سو گئے۔ آپ نے اپنے پیچھے جو عظیم کام اور مشن چھوڑا ہے اس کے ساتھ آپ زندہ جاوید رہیں گے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اپنی زندگی کے ابتدائی ایام سے لے کر حیات مستعار کے آخری لمحات تک آپ نے تبلیغ اسلام اور تدریس قرآن کا مشن پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رکھا۔ اس فریضہ کی بجا آوری میں سرمؤ فرق نہ آنے دیا۔ معالجین کی ہدایت کے علی الرغم اپنے مشن کی تکمیل میں ہمہ وقت کوشاں رہے۔ جب تک جسم میں توانائی رہی آپ منبر مسجد سے الہام ربانی کی دعوت کو مستقل طور پر مسلم عوام و خواص تک پہنچاتے رہے۔ آپ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے شاگرد خصوصی تھے۔ علوم قرآنی میں ان کی اجازت اور ہدایت کے موجب تقریباً چالیس برس مسجد شاہ چراغ ہائی کورٹ میں دعوت اسلام اور درس قرآن اور اس کے بعد خطبہ جمعہ دیا۔

معارف قرآنی اور علوم دینی میں اکتساب خصوصی آپ نے جنگ آزادی کے مایہ ناز قائد حضرت مولانا سندھی علیہ الرحمہ اور مولانا احمد علی لاہوری مرحوم سے کیا۔

آزادی وطن کی چنگاری نے آپ کے احساسات باطنی کو زیادہ سنجیدہ کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے تحریک آزادی وطن کی خاطر ۱۹۴۵ء میں ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور قافلہ حریت میں بطور سپاہی شامل ہو گئے۔ قیام پاکستان سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک استحکام پاکستان کے لیے جہاد کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں خضر حیات ٹوانہ کی حکومت میں آپ کو فیروز پور جیل جانا پڑا۔ تحریک آزادی کی خاطر آپ نے دن رات ملک کے دورے کیے اور کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے۔ آپ کو پاکستان سے ایمان کی حد تک محبت اور الفت تھی۔ ناموس ارض پاکستان کے لیے ہر باطل قوت سے ٹکرا جاتے تھے۔ پاکستان کی عظمت پر گرد نہ آنے دیتے تھے۔ یہ آپ کی طبیعت کا عجیب میلان تھا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد آپ نے اسلام کی انقلاب آفریں اور عالمگیر دعوت فکر کو بطریق احسن پیش کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی کا مردم خیز میدان منتخب کیا۔

استاد مکرم جناب علامہ علاؤ الدین صدیقی قبلہ پہلے مسلمان سکالر ہیں جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں علوم اسلامی کا بطور شعبہ تعارف کرایا، بانی کی حیثیت سے سنگ بنیاد رکھا، جو موجودہ صورت میں نہ صرف قائم ہے بلکہ متلاشیان حق کو فیضیاب کر رہا ہے۔

آپ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک جامع پنجاب کے شعبہ علوم اسلامی کے سربراہ رہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت آپ کے قائم کردہ شعبہ علوم اسلامی کے چشمہ علم و عرفان سے فیضیاب ہو چکی ہے۔ آج یہ طلباء پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے کالجوں میں بھی علوم اسلامی کے استاد اور صدر شعبہ ہیں۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزند

اسلام کی سربلندی کے لیے جناب علامہ صاحب قبلہ اکثر اپنے طلباء اور عقیدت

مندوں کو مفکر پاکستان علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے اس شعر کی طرف توجہ دلایا کرتے تھے:

زانکہ در تکبیر بانکہ راز تست

حفظ و نشر لا الہ مقصود تست

جناب علامہ صدیقی ایک شعلہ بیان خطیب اور تبحر عالم دین تھے۔ تقابل ادیان عالم کے شعبہ میں آپ کو سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس خصوصی مضمون میں آپ کی شخصیت منفرد تھی۔ اپنے پرائے سب ہی آپ کی اس انفرادیت کے قائل تھے۔ آپ مسیحیت، یہودیت، بدھ مت، سکھ مت، اور دوسرے مذاہب عالم پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے محترم علامہ صدیقی اپنی معرکہ الآرا تقریروں میں اکثر علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے دل پذیر اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آپ کلام اقبال پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ آپ نوجوانوں کو تجسس اور شوق دلانے کے لیے فرماتے تھے کہ علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا کلام مؤثر اور پرتاثر ہے، حیات آفرین اور انقلاب انگیز ہے۔ علامہ صدیقی علیہ الرحمہ کہا کرتے تھے:

”میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کلام نوجوانوں کو اسلام اور سیرت نبوی ﷺ کے قریب تر لانے کے لیے ذریعہ سمجھتا ہوں۔“

علامہ صاحب سچے عاشق رسول ﷺ تھے۔ حضور اکرم ﷺ کا نام نامی، اسم گرامی زبان پر آتے ہی آپ کی آنکھیں پر نم ہو جاتی تھیں۔ علامہ صاحب نے لاہور کی قدیم جلسہ گاہ باغ موچی دروازہ میں بارہا خطاب کیا ہے اور اہالیان پنجاب کے قلب و ایمان کو گرمایا ہے۔

تحفظ ختم نبوت کی کانفرنسوں میں شعلہ نوا تقریریں کر کے بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ وجہ تخلیق کائنات اور شاہکار منشائے ربانی حضور اکرم ﷺ سے والہانہ عشق کا نتیجہ تھا کہ حق بات بر محل کہہ دیتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت ملک گیر صورت اختیار کر گئی۔ بے شمار طلبہ صدائے اللہ اکبر پر پروانہ دار فدا ہوتے چلے گئے اور لاتعداد نوجوانان وطن نے جام شہادت نوش کیا۔ لاہور میں مارشل لاء نافذ ہو گیا، خود مجھے بھی جنون تھا، جمعہ کا دن تھا، قدرت خدا کہ میں بھی مسجد شاہ چراغ پہنچ گیا۔

استاد گرامی جناب علامہ علاء الدین صدیقی قبلہ پہلے سے ہی مسجد میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے ختم نبوت کے موضوع پر حد درجہ پر جوش خطاب شروع کر دیا کہ اتنے میں

اچانک گھوں گھوں کی سی آواز سنائی دی، یہ آواز جنرل اعظم خان کی مشین گنوں سے مسلح جیپ کی تھی جو جی پی او کے چوک میں آ کر رکی تھی۔ جناب علامہ صدیقی علیہ الرحمہ خطابت میں معمول سے زیادہ جوش میں تھے۔ حاضرین نے نعرہ ختم رسالت بلند کیا۔ اس وقت فضا بالکل ساکن تھی۔ اس آن علامہ صدیقی نے جنرل اعظم کو مخاطب کر کے کہا:

”تمہاری بندوق کی گواہیاں اگر نعرہ تکبیر لگانے والوں کے سینوں کو چھید سکتی ہیں تو پہلے میرے سینے پر گولی لگنی چاہیے۔“

کچھ توقف کے بعد جنرل اعظم کی جیپ چلی گئی۔ لاہور کی خون آلود سڑکیں اہل لاہور کو خوب یاد ہیں۔ شہدائے ختم نبوت کے خون کا نقشہ آج بھی زندہ جاوید ہے اور ابد الابد تک زندہ رہے گا۔

۱۹۶۳ء میں علامہ صاحب اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین منتخب ہوئے تو بحیثیت چیئرمین اسلامی تعزیرات پر قرآن و سنت کی روشنی میں حکومت کو وقتاً فوقتاً تجاویز اور مفید مشورے دیتے رہے۔ آپ اس عہدہ جلیلہ پر مسلسل نو برس تک ان تھک کام کرتے رہے۔ غلام نبی میمن اس دوران وزیر قانون تھے۔ میمن صاحب نے اسمبلی میں بڑی تمکنت سے کہہ دیا تھا کہ ”اسلامی مشاورتی کونسل کے مشوروں اور آرا کو رد بھی کیا جاسکتا ہے۔“

درحقیقت یہ تجاویز شراب، سود اور رریس پر پابندی عاید کرنے سے متعلق تھیں۔ جب یہ رپورٹ علامہ صاحب کو پہنچی تو آپ نے مسجد شاہ چراغ میں جمعہ کے اجتماع عام میں فلک شگاف انداز میں غلام نبی میمن کو لٹکارا اور فرمایا:

”غلام نبی میمن تم کون ہوتے ہو اسلام کے احکام کو رد کرنے والے، ان احکام کو قرآن حکیم نے ممنوع فرمایا ہے، تم کو رد کیا جاسکتا ہے، ان احکام کو رد نہیں کیا جاسکتا۔“

خدا کی قدرت دیکھئے کہ کچھ عرصہ بعد ہی وزیر قانون غلام نبی میمن قلمدان وزارت سے مستعفی ہو گئے۔

۱۹۶۹ء میں علامہ صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۲ء

تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہے اس دور میں بالخصوص جامعہ پنجاب کی وائس چانسلری کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی بلکہ کانٹوں کی باڑھ تھی۔

آپ حسن تدبیر اور معاملہ فہمی سے اپنی ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہوتے رہے تھے۔ یونیورسٹی کے پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی اپنی روایتی اعلیٰ ظرفی اور لطائف سے فرمادیتے تھے۔ یونیورسٹی طلباء کی یونین کے الیکشن ہوئے تو کچھ مشتعل طلباء نے حملہ کر کے آپ کی رہائش گاہ کا ذاتی فرنیچر توڑ پھوڑ دیا تھا۔ علامہ صاحب کی شفقت پدرانہ دیکھئے کہ مارشل لاء عدالت میں اپنی بے لاگ شہادت دے کر تمام طلباء کو چھڑا لائے تھے۔ یہ تھی علامہ صاحب کی انسان دوستی کہ کسی سے کوئی انتقام نہ لیا۔

یونیورسٹی میں ہڑتال ہوئی تو پولیس اور طلباء میں خوب مقابلہ ہوا۔ چاروں طرف آگ پھیل گئی۔ انتظامیہ لرزہ بر اندام تھی، یہ علامہ صاحب قبلہ کی ذات تھی کہ سینہ تان کر فریقین کے روبرو خطرہ کے آگے کھڑے ہو جاتے تھے اور گرجدار آواز میں بھرے ہوئے نوجوانوں کو خطاب کرتے اور چند لمحوں میں طلبہ کے مشتعل جذبات پر قابو پا لیتے تھے۔

بھٹو دور حکومت میں ایک مرتبہ جامعہ پنجاب کی تقریب میں مختار اعوان صوبائی وزیر بحالیات مہمان خصوصی کے طور پر مدعو تھے۔ اجلاس کی صدارت خود علامہ صاحب بحیثیت وائس چانسلر کر رہے تھے۔ وزیر موصوف نے اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے ہوئے کہا:

”ایشیا سرخ ہے، بھٹو کا دور عوامی دور ہے، اب افسر شاہی کے آداب

اور پہرے ختم ہو گئے ہیں، یونیورسٹیوں کے دروازے ہر خاص و عام

کے لیے یکساں کھلے ہوئے ہیں، استحصالی نظام بالآخر دم توڑ چکا ہے۔“

”ایشیا سرخ ہے“ کی تکرار سے علامہ صاحب علیہ الرحمہ کی حساس طبیعت اور

اعصاب پر خاصا اثر پڑا، آخر میں خطبہ صدارت کے لیے جب علامہ صاحب کھڑے ہوئے تو سلسلہ کلام اس طرح شروع کیا:

خود واقف نہیں ہے نیک و بد سے

بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

اس کے بعد آپ نے تاریخ اسلام کے بعض نامور شہداء کا ذکر کیا اور فرمایا:
 ”کہ صرف ایشیا ہی سرخ نہیں ان حضرات کا خون بھی سرخ ہے اور یہ
 خون ہی ہمیں اس بات کا سبق دیتا ہے کہ اس دنیا میں حکم و حاکمیت
 صرف اللہ کے لیے ہے۔“

ملک مختار اعموان کے چہرے پر ہوا بیاں اڑنے لگیں:

عطا اسلاف کا جذب دروں کر

شریک زمرہ لا پھرنوں کر

۱۹۷۱ء میں جب سقوط ڈھاکہ کا اعلان ہوا تو جمعۃ المبارک کے دن علامہ صاحب
 مسجد شاہ چراغ میں حسب معمول تشریف لائے۔ چہرے پر غم اور افسردگی کے آثار نمایاں
 تھے۔ منبر رسول ﷺ سے ابھی چند کلمات ادا کیے تھے کہ دل گرفتہ ہو گئے۔ حادثے کا پس منظر
 دہرانے لگے تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہو گئے۔ جسم پر شدید رقت طاری ہو گئی
 اور آواز بھرا گئی۔ سلسلہ خطابت رک گیا، میری اپنی زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ مسجد میں تمام
 کے تمام نمازی آہ و فغاں کرنے لگے۔ فضا میں اس وقت کہرام مچ گیا تھا۔

علامہ صدیقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے آخری سفر سے کچھ عرصہ قبل تبلیغ
 اسلام کے لیے عالمی ادارہ تبلیغ اسلام قائم کیا۔ اس مشن کو چلانے کے لیے ایک جمعیت بھی تیار
 کی اور ساتھ ہی ایک انگریزی ماہنامہ "The Light of Islam" جاری کیا۔ یہ ماہنامہ
 اندرون اور بیرون ملک خوب کامیاب ہوا کیونکہ علامہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بے پناہ
 خوبیوں کی متحمل تھی۔

آپ مسلمانوں کے اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ آپ اسلام کو دین رحمت سمجھ کر ہر
 ایک سے پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ خوش خلقی اور
 خدا خونی کا مجسم نمونہ تھے۔

بحیثیت ایک طالب علم اور شاگرد خصوصی کے علامہ صاحب قبلہ سے ۱۹۵۰ء سے
 طویل روحانی تعلق خاطر رہا ہے۔ یہ چند وردات قلبی ہیں جو سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔ علامہ

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محاسن و معارف، حسن اخلاق اور خوش خلقی کے بارے میں ہمہ گیر طور پر لکھنے کے لیے وقت دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ آپ کے پیچھے ہزاروں طلباء اور عقیدت مندوں کی بڑی کھیپ ہے۔

پسماندگان میں چھ دختران اور ایک فرزند ارجمند ہے۔



علامہ علاء الدین صدیقی بہت یاد آئیں گے

پروفیسر محمد سلیم

یہ اواخر ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے۔ بی، اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ کچھ دوستوں کا مشورہ تھا کہ بی، ٹی کر لو اور کسی سکول میں معلم بن جاؤ۔ اعجاز حسین قریشی جو اس زمانے میں روزنامہ ”تسلیم“ کے مینجر تھے اور ابھی ”ڈاکٹری“ سے برسوں دور تھے اصرار کرنے لگے کہ ایم اے اسلامیات میں داخلہ لے لو، کیونکہ اس مضمون میں ایم اے کی کلاسیں پچھلے سال ہی شروع ہوئی تھیں اور اس نئے مضمون میں ایم اے کرنے کے بعد ملازمت کے مواقع زیادہ تھے۔ وہ خود بھی اس کلاس میں داخلہ لے چکے تھے۔ وہ مجھے شعبہ اسلامیات میں لے گئے اور داخلہ فارم پر کر کے صدر شعبہ کے حضور پیش کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں علامہ علاء الدین صدیقی سے متعارف ہوا۔ پھر دو سال تک پڑھنے پڑھانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تعارف انس میں تبدیل ہو گیا اور انس نے محبت کے لیے جگہ خالی کر دی۔ میں طبعاً کم آمیز اور دیر آشنا ہوں اور دیاداری کے معاملات میں پھسڈی، اس لیے تعلیم سے فراغت کے بعد جب ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، تو علامہ صاحب سے ملاقاتوں کا تناسب کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو گیا، لیکن یونیورسٹی میں دو سالہ قیام کی یادیں آج بھی لوح دل پر کندہ ہیں۔

اس زمانے میں اسلامیات کے شعبے میں نابغہ روزگار ہستیاں شامل تھیں۔ ڈاکٹر مولوی شفیع مرحوم، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم، مولانا علم الدین سالک مرحوم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ڈاکٹر شجاع ناموس جزوقتی اور ہمہ وقتی اساتذہ کی حیثیت سے لیکچر دینے آتے تھے، لیکن زیادہ تر پیریڈ خود علامہ صاحب لیتے تھے۔ طالب علموں میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ ان میں کٹر مذہبی، قدامت پسند اور اپنے فقہی مسلک میں

Allauddin Siddiqui dead

BY A STAFF REPORTER

Alama Allaudin Siddiqui, a former Vice-Chancellor of Punjab University and Chairman, Advisory Council of Islamic Ideology, died of heart attack at Mayo Hospital, on Tuesday morning. He was 70.

Born in Lahore in 1907, Allauddin Siddiqui received his M.A. degree from F.C. College, and after he completed his studies in law.

He joined Islamia College, Lahore as a lecturer. He helped create the Chair of Islamic Studies at the Punjab University in 1952 and served as the Head of the Department for eight years.

A black and white portrait of Allauddin Siddiqui, an elderly man with a white beard and mustache, wearing a dark suit and a light-colored shirt with a dark tie. He is looking slightly to the right of the camera.

Allama Abd-
ul-Hamid Siddiqui
served as Vice Chancellor of the
Punjab University from 1969 to
1973.

In 1964 he was appointed Chairman of the Advisory Council of Islamic Lifeology. He had also been actively associated with politics for some time. He became Secretary-General of Mubtashil Muslim League in 1945. He, however, bid farewell to politics in 1962.

He has been giving Darsat Quran at Masjid Shah Chiragh till he suffered first attack of paralysis. Allama Allauddin was considered an authority in the field of comparative study of religion. He went on lecture tours on Islam around the world.

Attorney Allaeddin Siddiqui has left behind a wife, five daughters and a son, Norman Siddiqui of PITAC. His family will be taken care from his residence at 25 Main Street at 10 a.m. on Wednesday (today).

Public Safety officers will remain closed on Wednesday, April 23, as a mark of respect.

AFP report from Islamabad says. A meeting of the Council of Islamic Ideology was held in Islamabad today under the Chairmanship of Mr. Justice Mohammad Afzal Khewaja to consider the Draft of Alama Abuddin Siddiqui former Chairman of the Council and Vice-Chancellor, Punjab University.

Speaking at the occasion Mr. Gouveia said that the Council under the Chairmanship of Maria Salis did a lot of concrete work in the transformation of laws in accordance with Brazil and Somalia. The Council obtained very important results in the Government.

Feeling his morale and mind to be well put straight and firm, he was responsible for the matter. He went out to

Alfred Auland, 51, 14th St. S., has left behind a wife, five daughters and a son, Norman, 16, 14th St. S. He was taken out from his residence at 11:45 a.m. Wednesday (today).

British University officers will remain closed on Wednesday (today) as a mark of respect.

ALP report from Islamabad says: A meeting of the Council of Islamic Ideology was held in Islamabad today under the Chairmanship of Mr. Justice Muhammad Afzal to provide the duty of Attorney Ahmadul Haque, former chairman of the Council of Islamic Ideology, Punjab.

Speaking at the occasion the speaker said that the Government of China had done a lot of work for the transportation of liquor in accordance with treaty and through the United Nations in successful manner to the Government.

Warranted the company and should
be the end of all discussion and
concern by its representatives. I am
a firm believer in the right of every

[illegible][illegible]

پیشہ کے طاق و عاقل جوانوں کو اس لیے روک دیا کہ وہ اس کے لیے
 بے حال نہ بنیں اور ان کے لیے ان کی زندگی بھر کے لیے

نوائے وقت

طهارة نكاح الركن جنسها اوله كذا

[illegible][illegible]

29-12-1977

پاکستان
کامیاب
کراچی
نوائے وقت
پاکستان



A black and white photograph showing a close-up of a highly textured surface. The texture is composed of many small, dark, rectangular or square-like elements arranged in a somewhat regular, grid-like pattern. The overall appearance is grainy and complex, resembling a woven fabric or a wall made of small tiles or bricks. The lighting is somewhat uneven, with brighter areas in the center and darker areas towards the edges.

(The following page contains handwritten Urdu text, which appears to be bleed-through from the reverse side of the document.)

۱۲۸

۱- در این کتاب، علاوه بر بیان کلیات و اصول، به بیان جزئیات و تفصیلات نیز پرداخته شده است. این امر باعث می‌شود که خواننده بتواند به راحتی و بدون نیاز به راهنمایی، به فراگیری این علم بپردازد.

۱- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۲- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۳- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۴- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۵- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۶- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۷- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۸- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۹- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه
 ۱۰- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه

[illegible]

علامہ صاحب کی وفات ایک عظیم قومی نقصان تھی۔ اس موقع پر مختلف اخبارات نے اس خبر کو جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور ان کی خدمات کو سراہا۔

29-12-1977

22 Nov 97
 Authors: & Murphy
 1 Apr 97

ایسے وقت

ایسے وقت

مجلسه شورای عالی معارف و اوقاف و صنایع مستظرفه
در روز شنبه ۱۳۰۲/۱۲/۲۵
در جلسه ۱۳۰۲/۱۲/۲۵
در جلسه ۱۳۰۲/۱۲/۲۵
در جلسه ۱۳۰۲/۱۲/۲۵

یاد

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں
اسی وقت تک رہوں گا جب تک کہ
میری زندگی اس حال میں ہوگی
کہ میں اسے نہ چھوڑ سکوں۔

۱۔ جو کہ ہوا کی تپان سے
 ۲۔ جو کہ ہوا کی تپان سے
 ۳۔ جو کہ ہوا کی تپان سے
 ۴۔ جو کہ ہوا کی تپان سے
 ۵۔ جو کہ ہوا کی تپان سے

THE UNIVERSITY OF CHICAGO

بنا ہے۔ یہاں پر ان کی بڑی تعداد ہے۔ ان کی

تعداد بڑی ہے۔ ان کی بڑی تعداد ہے۔ ان کی

1890

علامہ علاؤ الدین صدیقی کا انتقال

[illegible]

[illegible]

ممتاز اور بہرِ علم علاء الدین صدیقی مفت سال کر کے

[illegible][illegible]

سابقہ وائس
چیمائٹر کے
سوگ میں
پہنچایا
یونیورسٹی
آج بند
رہے گی



علاء اللہ علیہ السلام سے مدد بھی کی ہے۔ دیکھو کہ کون سا

[illegible]

مشرق

بقية بـ عالمه علما والميراث

[illegible]

28-12-1978

شرق



۱۱۔ ایب یونیم جیسی گے سابقہ روسی چھ گھنٹہ علاقہ افریقہ میں بھی کما صغیراً عرب سے

سلامہ علامہ الدین صدیقی کو سپردِ خاک کر دیا گیا

خاندان میں ج. پیوٹیسر، دانشور، تعلیم اور سرکاری افسر شریک ہوئے۔

الحق، علامہ محمد الدین

فرض کر لیجئے۔ کہ اگر وہ عمارت کے تمام کمرے بکریوں کے لئے استعمال کیے جائیں تو ان کے لئے کھانا پینا وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ یہی صورت حال ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں قائم ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم
الحمد لله الذي جعل القرآن الكريم آية للذين آمنوا، والذين آمنوا هم خير البرية.

الملك الناصر المنصور

علامہ صاحب ہمیشہ طلباء کے لیے سربا شافقت رہے۔ مرتز

غلو کی حد تک تشدد لوگ بھی شامل تھے اور ایسے نوجوان بھی جو مذہب کے بارے میں بڑے لبرل تھے۔ سیاسی جماعتوں سے متاثر طلبہ کی بھی کمی نہ تھی۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے لٹریچر سے متاثر طلبہ خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ دو چار طلبہ ایسے بھی تھے جو سوشلسٹ رجحان رکھتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ طالب علمی میں طلبہ کی اکثریت منہ زور اور سرکش نوجوانوں پر مشتمل ہوتی ہے اور کوئی نوجوان اپنے نقطہ نظر کے خلاف ہلکی سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر سیاسی اور مذہبی انتہا پسند مفاہمت کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں اپنے موقف کی سچائی کا یقین اور اپنی بات منوانے کا جنون اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اس سے سرمو انحراف منافقت اور کمزوری ایمان پر محمول کیا جاتا ہے، لیکن جب طبائع میں اعتدال اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے تو پھر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا رویہ کس قدر بچکانہ اور غیر حقیقی رہا ہے۔

علامہ صاحب سے پہلی ملاقات کا تاثر میرے لیے بڑا مرعوب کن تھا۔ ایک خوبصورت ناک نقشے کا آدمی گٹھا ہوا، سڈول جسم، سر پر خوبصورت جناح کیپ، سلیقے سے ترچھی ہوئی چھوٹی سی داڑھی، صاف ستھرا بے داغ لباس، سجا سجا یا دفتر، غرضیکہ ان کی ذات اور گرد و پیش پر سلیقے کی حکمرانی تھی۔ وہ بڑے جامہ زیب نظر آتے تھے۔ خواہ انگریزی سوٹ پہنیں یا اچکن شلوار ان کے جسم پر ہر لباس خوب پھبتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ باقاعدہ ورزش کرتے تھے یا نہیں، لیکن ان کا جسم ورزشی نظر آتا تھا۔ ان کی پُر شکوہ میز کے ساتھ ہی کتابوں کا ایک ریک پڑا ہوتا تھا جس میں خوبصورت مجلد کتابیں نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ٹیلی فون ہو یا قلم دان، ہر چیز اپنی جگہ فٹ نظر آتی تھی۔ کچھ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو ماحول کی خوبصورتی مجروح ہو جائے گی اور اس ماحول میں خود ان کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔

علامہ صاحب بڑی دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ ان کی مادری زبان پنجابی تھی، لیکن اردو بولتے ہوئے وہ شین قاف کو درست کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انگریزی میں بھی شین قاف کا احساس موجود تھا۔ لطائف و ظرائف سے کام لینا وہ خوب جانتے تھے۔ اس لیے سننے والے ان کی گفتگو سے اکٹاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے ان کا

بیضوی چہرہ اور زیادہ خوبصورت ہو جاتا تھا۔ اسی بنا پر ایک مرتبہ مجھے ان سے ہلکی سی ڈانٹ بھی سننا پڑی۔ ہوا یہ کہ وہ لیکچر دے رہے تھے اور تمام طلبہ نوٹ لینے میں مصروف تھے۔ لیکن مجھے ان کی گفتگو کے سحر نے کچھ ایسا مسحور کر رکھا تھا کہ میری نگاہیں ان کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ لیکچر کے دوران ان کی نگاہ ساری کلاس پر اس طرح گھومتی رہتی تھی جس طرح راڈار کا انٹینا چاروں طرف چلر لگاتا ہے۔ انہوں نے جب دو تین مرتبہ میری نگاہوں کو اپنے چہرے پر مرکوز پایا تو کسی قدر سختی سے پوچھا کہ تم کیوں نہیں لکھ رہے ہو؟ احساس ندامت سے خود بخود میری نگاہ نیچی ہو گئی۔ میں انہیں ایک اچھا (Conversationalist) سمجھتا رہا ہوں اور ان کی کامیابی میں بہت حد تک ان کے اس آرٹ کا بھی دخل ہے۔

وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے اور اپنی اسی خوبی کی بنا پر تحریک پاکستان کے ہر دلعزیز لیڈر بن گئے۔ میں نے ان کی تقریریں موچی دروازے کے جلسوں میں بھی سنی ہیں اور مسجد شاہ چراغ کے جمعہ کے اجتماعوں میں بھی۔ وہ بڑی شستہ اور مدلل تقریر کیا کرتے تھے اور جہاں عوام ان کی تقریر سے پورا لطف اٹھاتے تھے، خواص بھی کچھ کم محظوظ نہیں ہوتے تھے۔ تقریر میں بھی وہ لطائف و ظرائف کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ مسجد شاہ چراغ میں جمعہ کے روز خاصا بڑا اجتماع ہوتا تھا جس میں پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ہوتی تھی۔ چونکہ وہ مذہبی تنگ نظری سے پاک اور فرقہ وارانہ تعصب سے بالا تھے اس لیے پڑھا لکھا طبقہ ان کے جمعہ کے خطاب کو دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ یہی رواداری کا جذبہ ان کے سیاسی مسلک میں بھی کارفرما نظر آتا تھا۔ وہ اگرچہ مسلم لیگی اور تحریک پاکستان کے سرگرم مجاہد تھے، لیکن دوسری جماعتوں کے بارے میں ان کی زبان سے کبھی نازیبا کلمات سننے میں نہیں آئے۔ ان کے مداحوں اور دوستوں کی تعداد ہمیشہ غالب رہی۔ وہ صوفیا کی طرح دنیا سے مستغنی نہیں تھے۔ ان میں بھی عہدہ اور منصب کی خواہش اسی طرح موجود تھی جس طرح ہم سب میں ہے۔ وہ بھی ان کے لیے اسی طرح کوشش کرتے تھے جس طرح باقی لوگ کوشش کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس دوڑ میں ان سے پیچھے رہ جاتے تھے وہ انہیں پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اس میں ان کا کیا قصور تھا؟ ایک مرتبہ موچی گیٹ میں سیاسی جلسہ ہو رہا تھا۔ اثنائے جلسہ میں عصر کی نماز کا

وقت آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سٹیج پر ہی مولانا داؤد غزنوی اور علامہ صاحب کھڑے ہوئے، چادر بچھائی اور نماز ادا کرنے لگے۔ جلسہ جاری رہا۔ میرے قریب ہی دل جلا بیٹھا تھا۔ وہ اس نماز پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ لوگ فتویٰ دینے میں کس قدر جلد بازی سے کام لیتے ہیں؟ جن معاملات کا تعلق صرف اللہ اور بندے کے درمیان ہے، ان پر بھی ہم اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کا دم واپس تھا کہ ایک روز صبح سویرے اخبار کے پہلے صفحے پر ایک مختصر مضمون کی تصویر پر نظر پڑی۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ اب وہ صحت اور عمر کے اس مقام پر تھے جہاں شریف لوگ اخبار کا عنوان بننا چھوڑ دیتے ہیں۔ معاً منہ سے انا اللہ وانا الیہ راجعون نکل گیا۔ خبر پڑھنے پر خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ واقعی علامہ علاؤ الدین صدیقی اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے تھے۔

(ہفت روزہ زندگی لاہور۔ ۶ تا ۱۲ جنوری ۱۹۷۸ء)



علامہ علاء الدین صدیقیؒ

☆ پروفیسر اختر راہی

علامہ علاء الدین صدیقی بن فیروز الدین ۳ نومبر ۱۹۰۷ء ۲۷ رمضان ۱۳۲۵ھ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان چھ سات پشتونوں سے لاہور میں مقیم ہے اور کئی پشتونوں سے علم و فن کی روایت ان کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ عہد مغلیہ میں ان کے بعض بزرگوں کو شہزادوں کی اتالیقی کا شرف حاصل تھا۔ اور اکثر بزرگ علم و فن کی خدمت میں مصروف رہے۔ علامہ صدیقی کے والد ماجد ایرانی طرز کی مصوری اور نقاشی میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور اس فن کے استادوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علامہ موصوف کے چار بھائیوں نے مصوری و نقاشی کا فن سیکھا البتہ انہوں نے علمی شغل کو ترجیح دی۔

علامہ موصوف نے اسلامیہ ہائی سکول (شیرانوالہ دروازہ) مدرسہ قاسم العلوم (شیرانوالہ دروازہ) فارمین کرپن کالج لاہور (ایف۔ سی کالج) اور لاء کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں ملک عبدالقیوم پرنسپل لاء کالج، مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا عبید اللہ سندھی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

علامہ موصوف کو بدوئے شعور سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ عمدہ کتابیں خریدتے اور زیر مطالعہ رکھتے تھے قیام پاکستان سے پہلے مقرر اور خطیب کی حیثیت سے دینی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ غلبہ اسلام کی ہر ملی تحریک میں بقدر حیثیت و استطاعت حصہ لیتے رہے۔ تحریک آزادی میں مسلم لیگ کے پرچم تلے کام کیا۔ مسلم لیگ میں شمولیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

☆ پروفیسر اختر راہی (ڈاکٹر سفیر اختر سینئر ایڈیٹر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)

”سب سے پہلے بہار کے خونی واقعات کے زخم خوردہ مہاجرین کی خدمت کے لیے مسلم لیگ میں شریک ہوا اور جو بن پڑا، کیا۔ پھر بعض احباب کے حسن ظن نے صوبائی مسلم لیگ کا سیکرٹری بھی چن لیا۔“

(ماہنامہ ”اردو ڈائجسٹ“ لاہور۔ فروری ۱۹۶۵ء، ص ۲۳)

تحریک پاکستان میں ان کی خدمات ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہیں۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد سیاسی دنیا سے واپس علمی دنیا میں آئے اور ملک کے بہت سے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے صدر رہے اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ اسلامی مشاورتی کونسل میں انہوں نے اہم خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ بیسیوں دینی و تبلیغی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ رہے۔

علامہ صدیقی مسجد شاہ چراغ (ہائی کورٹ لاہور) میں خطبہ جمعہ دیتے تھے اور مستقل طور پر عصر کے بعد درس قرآن دیا کرتے تھے۔ ان کے درس قرآن میں مولانا احمد علی لاہوری کا مخصوص انداز فکر نمایاں تھا۔ تقابل ادیان کے فن پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس لیے قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کی کتابوں کا ذکر بھی ان کے درس میں ہوتا تھا اور اسلامی تعلیمات کی برتری واضح کرتے تھے۔

علامہ موصوف گفتگو کے بادشاہ تھے:

”وہ جس محفل میں ہوتے سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، قادر الکلامی، شگفتگی اور بے تکان گفتگو کی قدرت سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔“

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ ۱۲ جنوری ۱۹۸۰ء)

ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر طبقے کی زبان اور لب و لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ انہیں عوام کی زبان میں بات کرنے کا سلیقہ تھا اور ایوانوں میں رہنے والوں کے بھی رمز شناس تھے۔ وہ محبت کے انداز بھی جانتے تھے اور دیوانوں کی سی بے باکی اور تندہی سے بھی آشنا تھے۔ ان کی سیرت و کردار کا نمایاں اور غالب پہلو ”اعتدال پسندی“ تھی۔ وہ خود ایک مسلک کے

داعی تھے مگر دوسرے ہر مسلک و مشرب کے بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔
 علامہ موصوف جامع الحیثیات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ خوش بیان خطیب، درد دل
 کے مالک مبلغ، بلند پایہ استاد اور سیاست دان تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء / ۱۶ محرم ۱۳۹۸ھ کو
 میوہپتال میں انہوں نے آخری سانس لیا۔ شہیم صبا متھراوی نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا:
 چھپا اک اور سورج آسمانِ علم و دانش کا
 ہوئے جب دہر سے رخصت علاؤ الدین صدیقی
 سروشِ خلد نے تاریخِ رحلت یوں کہی ان کی
 بنے ہیں رہبرِ جنت علاؤ الدین صدیقی
 نیز ”علامہ علاؤ الدین صدیقی باغِ ارم میں جا بے“ سے سالِ عیسوی ۱۹۷۷ء برآمد
 ہوتا ہے۔



علامہ علاء الدین صدیقی ایم اے

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

میں جب ۱۹۳۳ء میں ہوشیار پور پوسٹ ہوا تو چند روز کے بعد کسی محفل میں صدیقی صاحب سے ملاقات ہو گئی، ان دنوں کالج کے مسلمان پروفیسروں اور بعض دیگر علم دوست حضرات کی مساعی سے مجلس قرآن کی تشکیل ہوئی تھی، اس کا اجلاس مہینے میں دو بار کسی پروفیسر کے گھر پر ہوتا تھا۔ ان میں قرآن کے متعلق تحقیقی مقالات پڑھے جاتے اور تبادلہ افکار ہوتا تھا۔ ایک دن صدیقی صاحب اس مجلس میں آ گئے انہوں نے ایسے فاضلانہ انداز میں اپنے خیالات پیش کیے کہ سب نے بے ساختہ داد دی۔ رفتہ رفتہ صدیقی صاحب سے میری راہ و رسم بہت بڑھ گئی، وہ اس وقت وہاں پنچایت آفیسر تھے، جب ۱۹۴۰ء میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا تو نواب ممدوٹ کے کہنے پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مسلم لیگ کے صوبائی جنرل سیکرٹری بن گئے۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی تشکیل ہوئی تو صدیقی صاحب کو ان کی ملی خدمات کے پیش نظر پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کا ریکس لگا دیا گیا۔ چند سال کے بعد آپ وائس چانسلر بن گئے۔ ۱۹۶۵ء کے قریب آپ وفات پا گئے۔ صدیقی صاحب کو خطابت میں وہ کمال حاصل تھا کہ بعض نقاد انہیں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بعد دوسرا درجہ دیتے تھے، باوجود فاضل ہونے کے آپ نے کوئی کتاب تصنیف نہ کی۔

(”میری داستان حیات“ خود نوشت لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۱)

علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم ممتاز ماہر تعلیم، جید عالم دین اور شعلہ نوا خطیب

☆ فخر الدین صدیقی ☆

بیسویں صدی عیسوی نے جو گراں مایہ ہستیاں برصغیر پاک و ہند کو عطا کیں ان میں علامہ علاء الدین صدیقی ستارہ امتیاز مرحوم و مغفور بجا طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی زندگی کا ایک باب بلکہ ایک ایک ورق بصیرت افروز ہے۔ طالب علمی کا زمانہ اگر طالب علموں کے لیے نمونہ تھا تو مدرسے کا عہد اساتذہ کے لیے مشعل راہ ہے۔ بظاہر آپ ایک استاد تھے لیکن انہوں نے جس جذبے سے قوم و ملت کی خدمت کا حق ادا کیا اس کی مثال ملنی محال ہے۔

ابھی پچھلے برس یعنی ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء میں ان کی ذات والا صفات ہم میں موجود تھی لیکن قضائے الہی نے وہ سال بھی پورا نہ ہونے دیا اور بالآخر آپ کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف جانا پڑا۔ آپ کے جنازہ میں کثیر تعداد میں عدالت عالیہ کے جج صاحبان و کلاء، سیاست دان، اساتذہ اور آپ کے لاتعداد شاگرد شامل تھے۔

علامہ مرحوم ۵ نومبر ۱۹۰۷ء میں لاہور میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد مولوی فیروز الدین مرحوم نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فرزند عطا کیا تو اسے اسی کی راہ میں وقف کر دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر کے علمی ماحول میں حاصل کی۔ ایف اے، ایف سی کالج، بی اے گورنمنٹ کالج اور ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ایم، او، ایل، ایل، بی اور بے ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ دینی تعلیم حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ لاہوری سے حاصل کی اور ایک عرصہ تک مسجد شیرانوالہ میں درس قرآن بھی دیتے رہے۔

☆ ملک کے نامور وکیل علامہ صاحب مرحوم کے بھتیجے

علامہ مرحوم نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد برصغیر ہند میں مسلمانوں کی حالت زار کا عمیق مطالعہ کیا اور مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آزادی کی بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں ہندوستان میں دو قومی نظریے کی خاطر مسلم لیگ انگریزوں اور ہندوؤں سے نبرد آزما تھی۔ علامہ مرحوم اسلامیہ کالج کی سٹیج سے طلباء کو متحد کرنے اور ان کے اندر جذبہ حریت بیدار کرنے کے لیے کوشاں تھے اور جدوجہد آزادی میں مسلمان قوم کو ہوشیار و خبردار رہنے کے لیے شعلہ دھار تقریروں سے کام لے رہے تھے۔ اس دور کا ایک واقعہ قاضی عبدالقیوم قریشی وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاول پور نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان دنوں ایک طالب علم عبدالملک کی یاد میں حبیبہ ہال میں ایک جلسے کا اہتمام ہوا اس وقت تحریک پاکستان بھی اپنے عروج پر تھی۔ نو جوان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہو چکے تھے۔ قائد اعظم کی طرف سے بھی حصول مقصد کے لیے سردھڑکی بازی لگا دینے کا اذن عام تھا۔ اس پر ایک ساتھی کی شہادت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک بڑے خون خرابے کا خدشہ تھا۔ ایسے عالم میں ایک شعلہ بیان مقرر کے لیے جذبات کو ابھارنا تو بڑا آسان ہوا کرتا ہے لیکن مشتعل جذبات کو صحیح ڈگر پر لے آنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن علامہ مرحوم نے یہ کام ایسی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کہ پھرے ہوئے نو جوان نظم و ضبط کا پیکر بن گئے اور دشمنوں کی توقعات خاک میں مل گئیں۔

۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبہ اسلامیات کا اجرا ہوا تو علامہ مرحوم کو صدر شعبہ منتخب کیا گیا۔ آپ نے شعبہ اسلامیات کی صدارت اور علمی خدمت کو اپنا شعار بنالیا اور سیاست سے ہمیشہ کے لیے غلیجہدگی اختیار کر لی۔ ۱۹۶۹ء تک آپ صدر شعبہ اسلامیات کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم نے اپنے آخری ایام میں علامہ مرحوم کو جامعہ پنجاب کا وائس چانسلر مقرر کر دیا۔ یہ کٹھن ذمہ داری بھی آپ نے بطریق احسن نبھائی۔ ۱۹۶۳ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے علامہ مرحوم کو اسلامی مشاورتی کونسل کا چیئرمین نامزد کر دیا۔ آپ نے لاہور کو خیر باد کہنے سے معذوری ظاہر کی۔ جس پر اسلامی مشاورتی کونسل

شعبہ اسلامیات کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا

کا دفتر سمن آباد لاہور میں آپ کی رہائش گاہ کے قریب ہی منتقل کر دیا گیا۔ آپ ۹ سال تک مسلسل اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین رہے اور اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین میں نمایاں کام کیا۔ آپ نے ۱۹۶۴ء میں کونسل کے پہلے ہی اجلاس میں سود اور شراب کو حرام قرار دلایا۔ جملہ اراکین کونسل نے آپ کی تائید کی۔ لیکن ڈاکٹر فضل الرحمن نے اپنا اختلافی نوٹ لکھا۔ آپ نے اپنے عہد میں اسلامی قانون کو مرتب کرنے کے لیے جو عظیم خدمات سرانجام دیں ان کی تصدیق واضح طور پر علامہ مرحوم کی وفات پر موجودہ چیئرمین اسلامی مشاورتی کونسل جسٹس محمد افضل چیمہ نے کی۔

(روز نامہ مشرق لاہور۔ مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۸ء)





بحیثیت سیکرٹری جنرل پنجاب مسلم لیگ



مشہور سیاستدان اور خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی کے ساتھ

علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم

قاضی عبدالرسول

دور قحط الرجال میں علامہ علاء الدین صدیقی گوہر نایاب کی مانند ایک انسان تھے جس نے عصر حاضر میں قدیم روایات و اقدار کا بوجھ اٹھائے رکھا۔ علامہ موصوف کی زندگی کا طویل عرصہ تبلیغ اسلام اور فہم قرآن کے فروغ و ترویج کے مشاغل میں گزرا۔ قدرت نے انہیں طرح طرح کی نعمتوں اور خوبیوں سے نوازا رکھا تھا۔ آپ نے اپنے فہم و تدبر، علم و حکمت اور ذہانت و قابلیت کے بل بوتے پر ملک کے طول و عرض میں بہت جلد اپنا ایک مقام بنالیا۔ اخلاق و عادات کے معاملے میں علامہ صدیقی ایک مثالی انسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ملت کے اعتدال پسند حلقوں میں انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ بڑے وسیع المشرب اور بالغ نظر مدبر تھے۔ کسی کی دل آزاری یا دل شکنی کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے اور اگر بادل نخواستہ زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ درپیش آ بھی گیا تو آپ اس قسم کے مواقع پر خوف خدا کے تصور سے اکثر گھبرا جاتا کرتے تھے۔ اسی لیے علامہ اپنے دوستوں میں انتہائی ہر دل عزیز اور مقبول رہے۔

تحریک پاکستان کے حصول اور جہد و مساعی کے ضمن میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ حصول آزادی کے لیے آپ نے شب و روز کام کیا اور دورے کیے۔ ۱۹۴۶ء میں خضر حیات ٹوانہ کے دور حکومت میں سول نافرمانی کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان، سلامتی وطن اور نظریہ پاکستان کے تحفظ و بقا کے لیے مسلسل کام کرتے رہے۔ علامہ صدیقی کو حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ والہانہ حد تک لگاؤ اور محبت تھی۔ حضور کا نام نامی اسم گرامی زبان پر آتے ہی ان کی کیفیت بدل جاتی اور آواز فوراً بھرا جاتی۔ علامہ صاحب عرصہ دراز تک مسجد شاہ چراغ میں درس قرآن اور خطبہ جمعہ کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

علامہ صاحب کی آواز میں بلا کا سحر اور لہجے میں انتہا درجے کا اثر پایا جاتا تھا۔ آپ بلند پایہ مفکر اور صاحب طرز خطیب تھے۔ آپ کے انداز خطابت کے سحر کے اپنے اور بیگانے سبھی معترف تھے۔ خصوصاً تقابل ادیان علام کے موضوع پر تقاریر کرنے میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔ مسیحیت، یہودیت، بدھ مت اور دیگر مذاہب عالم پر محققانہ اور عالمانہ نظر تھی۔ اپنی معرکہ الآراء تقاریر میں جوش بیان کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے اشعار کا موزوں اور خوبصورت استعمال کر کے حاضرین سے خراج تحسین حاصل کرتے۔ تحریک ختم نبوت کے مسئلہ پر، اپنے جنون عشق کی آبیاری میں خوب دھواں دھار تقریریں کیں اور شہرت پائی۔

ایوبی دور میں آپ کو اسلامی مشاورتی کونسل کا چیئرمین نامزد کر دیا گیا۔ بحیثیت چیئرمین کے اسلامی تعزیرات پر قرآن و سنت کی روشنی میں ایوب حکومت کو وقتاً فوقتاً تجاویز اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ پھر ایک دور آیا کہ آپ کو جامعہ پنجاب کا سب سے اہم عہدہ (وائس چانسلر) تفویض کر دیا گیا۔ ۱۹۷۲ء تک اس منصب پر کام کیا جن حالات میں جامعہ پنجاب کی وائس چانسلری علامہ کے سپرد ہوئی وہ دور علامہ کے لیے بڑی کڑی آزمائش کا وقت تھا۔ علامہ اپنے ذاتی مشاہدے، وسیع تر عملی تجربے، حسن اخلاق اور فہم و تدبیر کے بل بوتے پر دگرگوں حالات سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک موقع پر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹ یونین کے انتخابات ہوئے تو طلباء کے ایک گروپ نے علامہ کی رہائش گاہ پر حملہ کر کے ہر شے کو تہس نہس کر دیا۔ خصوصاً ان کے ذاتی فرنیچر اور دوسرے سامان وغیرہ کو زبردست نقصان پہنچایا۔ علامہ کی زندگی میں اس سے بڑی انسان دوستی کی اور کیا مثال ہوگی کہ آپ نے کسی سے کوئی بدلہ نہیں لیا۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۰ء)



علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم

سید طاہر علی رضوی

انسان کی عظمت کا دار و مدار اس کے عمل اور جدوجہد پر ہے۔ دنیا میں جتنی بھی قد آور ہستیاں گزری ہیں ان کی زندگیاں جدوجہد اور محنت سے عبارت ہیں۔ علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم کی زندگی بھی اسی جدوجہد اور عمل پیہم کا نمونہ تھی۔ ان کی ولادت لاہور جیسے علم و ادب کے شہر میں اس وقت ہوئی جب کہ مسلمان گھرانے ابھی دنیاوی راحتوں میں زیادہ ملوث نہ ہوئے تھے۔ بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح اسلام کے شیدائی اور رسول اللہ ﷺ کے فدائی تھے۔ مرحوم کا بچپن اور جوانی اندرون شہر کے اس حصہ میں پروان چڑھے جہاں مولانا احمد علی لاہوری ایسے ذیendar، عالم باعمل اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب نے اس چشمہ فیض سے استفادہ کیا۔ انہوں نے بظاہر دنیاوی تعلیم حاصل کر کے فکر معاش سے بے نیازی بھی حاصل کر لی، لیکن لگن اور جستجو جو ایک صحیح اور سچے مسلمان کے لیے ایمان کا درجہ رکھتی ہے جاری رکھی۔ ملازمت اور اس کے ساتھ ساتھ علم سے وابستگی ایک ایسا مشغلہ تھا جو انہی کے شایان شان تھا۔ انہوں نے دہلی دروازہ کے باہر دارالابنہ شرقیہ میں آقا بیدار بخت کے ساتھ درس لیا۔ وہاں تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ علم و ادب سے وابستگی کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد میں بھی دل و جان سے حصہ لے کر قائد اعظم کی مخلصانہ قیادت کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اسلام سے والہانہ عقیدت اور ملت اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کے علمبردار کی حیثیت سے ان کا شمار برصغیر کے مسلمانوں میں بالخصوص ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک کئی بے شمار ایسی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو ان کی درد مندانہ خدمات کے اعتراف کے طور پر بیان کی جاسکتی ہیں۔ اسلام کے مبلغ اور استاد کی حیثیت سے ان کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن ان کی یہ خدمات جو انہوں نے اتحاد بین المسلمین کے لیے انجام

دیں وہ روز روشن کی طرح عیاں رہیں گی۔

جون ۱۹۶۳ء میں لاہور جیسے عظیم شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہم سب کے لیے ایک حادثہ سے کم نہیں تھا۔ دوستانہ ماحول میں کشیدگی روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی نے ایک درد مند پاکستانی کی طرح اس اثر کو محسوس کیا انہوں نے نہایت جرأت و بیباکی اور عزم کامل سے اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ بھائی دروازہ کے اندر جہاں پر یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ نہایت بلند اور جامع الفاظ میں اتحاد بین المسلمین کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ فتنے اسلام اور پاکستان کے وجود کے منافی ہیں۔ ہم نے پاکستان اس لیے نہیں حاصل کیا تھا کہ یہاں پر ہم قتل و غارت کے بازار گرم کریں۔ بلکہ اس لیے حاصل کیا تھا کہ امن و سلامتی کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کر سکیں۔ میرے خیال میں پوری قوم علامہ صاحب کی اس قومی و دینی خدمت کی احسان مند ہے۔

ایک سچے اور دیندار مسلمان کی طرح خدمت انسانیت بھی مرحوم کے فریضوں میں سے ایک فریضہ تھا۔ اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے جہاں آپ نے اسلامی قانون کی تصریحات و تفسیرات سرانجام دیں وہاں پر اراکین کونسل کے ساتھ محبت و اخلاص کا جذبہ بھی کارفرما رہا۔ علامہ حافظ کفایت حسین مرحوم جو کہ ملک کے ممتاز عالم دین تھے اور کونسل کے رکن تھے، جب فالج کے عارضہ سے صاحب فراش ہو گئے تو علامہ مرحوم ہر ماہ خود ان کے گھر تشریف لا کر اپنے سامنے حافظ صاحب کو تنخواہ کی ادائیگی کرتے۔ میں نے ایک دن علامہ صاحب سے اظہار تشکر کے طور پر ان کی اس سعادت کو سراہا تو فرمانے لگے بھائی وہ ایک مفسر و عالم دین ہیں۔ یہ وقت مجھ پر بھی آ سکتا ہے اور میں تو حافظ صاحب کا معتقد خاص ہوں۔ اسی طرح اور کئی اہم خوبیاں ہیں جو علامہ صاحب مرحوم میں مجتمع ہو گئی تھیں۔

اسلام سے محبت اور رسول اللہ ﷺ سے عشق ان کی آخرت کا عظیم ترین سرمایہ تھا۔ ملک کے کسی حصہ میں کوئی ایسی تقریب منعقد ہوتی جس میں دین کا تذکرہ ہوتا علامہ صاحب اس محفل میں شرکت کو ثواب تصور کرتے۔ ۱۹۶۴ء کی سیرت کانفرنس جو لاہور کے موچی دروازہ کے باغ میں منعقد ہوئی اس کا سہرا بھی علامہ صاحب کے سر پر ہے۔ پنجاب یونیورسٹی

کے وائس چانسلر کا عہدہ کانٹوں کی سیج سے کم نہیں لیکن انہوں نے اس عہدہ پر متمکن ہو کر نہایت تدبیر و فراست اور حکمت و دانش سے اس دانشکدہ کا انتظام کیا، حلیم الطبع، خلیق، عجز و انکسار، تبسم ریز چہرہ اور اس پر نرم شیریں گفتگو یہ ایسی خصوصیات تھیں جو ملنے والے کو علامہ صاحب کا گز ویدہ بنا لیتی تھیں۔ ربع صدی میں علامہ صاحب نے اپنے علم و فضل سے نئی نسل کو اسلام کی تعلیمات سے جس طرح روشناس کرایا وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوا ہوگا۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ آج ہر فرد علامہ صاحب کی رحلت پر اشکبار ہے کیونکہ جہاں ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے وہاں ان کے دوستوں مذاحوں کا بھی ایک جم کثیر نظر آتا ہے۔ علامہ صاحب کی یاد ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ بنی رہے گی کیونکہ ان کی زندگی سے جو سبق ملا ہے وہ یہ ہے کہ عظمت و بڑائی محنت اور جدوجہد سے نصیب ہوتی ہے۔

علامہ علاء الدین صدیقی دور حاضر کی ایک ایسی شخصیت تھے جن میں شرفائے متقدمین کی تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت، اصول پسندی اور وضع داری، علم سے عشق کی حد تک لگن، گفتار، کردار اور بود و باش میں سادگی اور نفاست ان کا طرہ امتیاز تھا، ان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ ایک صحیح مسلمان سے ملاقات ہوئی ہے اور اس ملاقات کا خوش گوار تاثر عمر بھر قائم رہتا تھا۔ دراصل انسان کی یہی خوبیاں ہیں جو اس کی یاد کو دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھتی ہیں، یہ علامہ صاحب کی ہر دلعزیزی کی دلیل ہے کہ وہ دنیا سے اس حال سے رخصت ہوئے ہزاروں افراد خلوص دل سے ان کو ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے لیے موجود ہیں۔

(روز نامہ مشرق۔ مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۷ء)



علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن

سید طاہر علی رضوی

پاکستان کے حصول اور ملت اسلامیہ کے لیے دردمندی کا جذبہ رکھنے والے مسلم زعماء و علماء اور کارکن ایک ایسے لازوال تاریخ کے صفحات ہیں جن سے ہماری آنے والی نسلیں استفادہ کر سکیں گی۔ ملت کے ہی خواہوں اور تحریک پاکستان کے ممتاز کارکنوں میں ایک نام علامہ علاء الدین صدیقی کا بھی ہے جو اپنی بے پناہ محنت، لگن اور علم و عرفان کی آگہی سے پورے ملک میں محترم و مکرم شمار ہوئے۔ گوان کو ہم سے جدا ہوئے تین سال کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن ان کا حلیم الطبع اور مشفق چہرہ آج بھی نظروں کے سامنے ہے۔ آپ صرف ایک ماہر تعلیم ہی نہ تھے بلکہ آپ کا شمار ملک کے معتبرین علماء میں ہوتا تھا۔ لاہور میں کیا بلکہ پورے ملک میں آپ کی شرکت اور تقاریر پورے انہماک سے سنی جاتی تھیں۔ جوانی کے عالم میں اپنی تعلیمی و قومی سرگرمیوں کا آغاز لاہور جیسے علم و عمل کے شہر سے شروع کیا اور اسی شہر میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ مولانا احمد علی مرحوم کی مسجد کے قریب سبحان لائن میں اپنے مکان پر اس وقت بھی شعراء اور ادباء کا جگمگھٹا رہتا تھا، جب مرحوم صرف علاء الدین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ برصغیر کے ممتاز شعراء جن میں جگر مراد آبادی بھی شامل ہیں مرحوم کے مہمانوں میں شامل تھے۔ سرکاری ملازمت سے منسلک رہنے کے باوجود علم کے حصول اور اس کے فروغ کے لیے آقا بیدار بخت کے دارالسنہ شرقیہ دہلی دزواڑہ میں درس و تدریس کرتے رہے اور آہستہ آہستہ آپ اسلام آباد کالج لاہور میں اسلامیات کے لیکچرار کی پوسٹ تک پہنچ گئے۔ اسلام آباد کالج تقسیم سے قبل برصغیر کے مسلم طلباء کا مِلّاد ماہ تھا۔ تحریک پاکستان قائد اعظم کی قیادت میں شروع ہو چکی تھی۔ ہر مرد و زن، بچہ بوڑھا، جوان مسلمان پر دانہ دار اپنے قائد کے حکم پر نثار تھا۔ علامہ

علاؤ الدین صدیقی بھی انہی پروانوں میں شامل تھے اور انہوں نے نہایت جاں سوزی اور خلوص سے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی بنے لیکن سیاست سے زیادہ لگاؤ نہ رکھتے ہوئے اپنے پرانے شعبہ تعلیم میں دلچسپی لینے لگے۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے اور اس کے بعد وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی حیثیت سے انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مسجد شاہ چراغ میں علم و عمل کی ایک قندیل روشن کی اور جب تک ہمت رہی اس کو روشن کیے رکھا۔

علامہ صاحب فرقہ وارانہ اختلاف کے سخت خلاف تھے۔ اتحاد بین المسلمین کے زبردست موید تھے اور آخری دم تک اس میں کوشاں رہے۔ آخری دنوں میں جب کہ فالج کی وجہ سے خاصے معذور تھے ایک ایسے جلسے میں شرکت کی جو اتحاد بین المسلمین کے لیے اسمبلی میں منعقد ہوا۔ مرحوم ایک نابغہ روزگار شخصیت کے حامل تھے۔ مسلمانوں کے ہر فرقہ میں محترم تھے۔ حلیم الطبع، اخلاق، عجز و انکساری، شیریں اور جامع گفتگو سونے پر سہاگہ کا کام دیتی تھی۔ جو بھی آپ سے ملتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ آپ کی شخصیت ایسی تھی جن میں شرفائے قدیم و جدید کی تمام خوبیاں جلوہ گر تھیں۔ بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت و مہربانی، علم سے لگن، سیرت و کردار میں اسلامی تہذیب و تمدن کی جھلک، سادگی اور نفاست ان کی جامع زندگی کی صفات میں شامل تھی۔ وہ اس وقت دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کا طرز عمل ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ پاکستان کی بقا اور اسلام کی سر بلندی اسلام کے اعلیٰ اور ارفع اصولوں میں مضمر ہے۔ ان کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد ملنے والا یہ تاثر لے کر جاتا تھا کہ میں واقعی ہی ایک ایسے مسلمان سے ملا ہوں جو ظاہر و باطن میں ملک و ملت کا خیر خواہ اور سچا خادم ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور ہمیں بھی توفیق عطا فرمائے کہ ہم بھی اسلام اور پاکستان کے سچے خادموں میں شمار ہوں۔

(روز نامہ مشرق۔ مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۰)

استاد گرامی قدر علامہ علاء الدین صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

☆ پروفیسر افتخار احمد چشتی

قیام پاکستان سے قبل میں اپنے آبائی شہر دینا نگر ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب ہندوستان) میں سکول ٹیچر تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ڈلہوزی گیا۔ وہاں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے ایک مرکزی مسجد میں گیا۔ پہنچا تو خطاب ہو رہا تھا۔ دور سے دیکھا تو قمیص، شلوار، اچکن، جناح کیپ میں ملبوس ایک صاحب خطاب کر رہے تھے۔ صورت بھی پیاری اور خطاب بھی پیارا، دل میں اتر جانے والا انداز بیان، فصاحت و بلاغت، قرآن و حدیث کے حوالے، علامہ اقبال کے اشعار، اسلامی ریاست (پاکستان) کے قیام کی اہمیت، اتنا محو ہو گیا کہ اب کچھ یاد نہیں۔ انداز شوخ بھی مگر دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا۔ جمعہ کے بعد کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ انہوں نے بتایا یہ علامہ علاء الدین صدیقی صاحب ہیں، لاہور کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سیکرٹریٹ میں ملازم ہیں۔ جمعہ میں وہاں خطاب بھی کرتے ہیں۔ بس انگریزی محاورہ کے مطابق وہ پہلا تاثر آج بھی قائم ہے بلکہ قوی تر ہے۔ اب وہ صورت بظاہر موجود نہیں ہے مگر ابھی تک آنکھوں میں اور دل میں سمائی ہوئی ہے:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت

ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

وہ صورت چشم و گوش کے ذریعے دل میں اتری اور گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ اس

☆ ایم اے اسلامیات کی پہلی کلاس کے طالب علم تھے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ علامہ صاحب سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں جب ایم اے کی کلاس کا اجرا ہوا تو جناب چشتی صاحب مرحوم نے اول آنے والے طالب علم کے لیے علامہ علاء الدین صدیقی گولڈ میڈل جاری کیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو درجات عالیہ سے نوازے۔

کی تلاش میں رہا۔ یہاں تک کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ ہمارا اہم ترین ضلع ہندوستان کا حصہ بن گیا اور ہم رات کی تاریکی میں وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان میں داخل ہوئے اور لاہور پہنچ گئے۔

لاہور پہنچنے کے بعد قسمت مجھے جلد ہی حضرت علامہ صاحب کی خدمت میں لے گئی۔ آپ اس وقت لاہور ہائی کورٹ کے عقب میں مزنگ روڈ پر ایک رہائش گاہ میں قیام پذیر تھے۔ جمعہ ہائی کورٹ کی مسجد شاہ چراغ میں پڑھاتے تھے۔ اسلامیہ کالج میں پروفیسر تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے غالباً سیکرٹری تھے۔ ابتدا سے ہی تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور استحکام پاکستان کے لیے نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آباد کاری میں مصروف تھے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ وہاں جمعہ پڑھنے لگا۔ وہیں جمعہ کے بعد آپ کی محفل میں بیٹھتا اور گفتگو سنتا۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک دفتر تھا اور ایک کتب خانہ۔ دفتر میں محفل جہتی تھی، تمام مسائل پر کھل کر گفتگو ہوتی اور حاضرین محفل فیض حاصل کرتے۔ وہیں آپ اساتذہ، علماء، طلبہ اور مہاجرین کے مسائل حل کرتے۔ اسی محفل میں میرا تعارف جناب حافظ نذر احمد صاحب سے ہوا جو اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے اور حضرت علامہ صاحب کے نائب و معتمد تھے۔

پنجاب یونیورسٹی نے شعبہ اسلامیات کے قیام کا ارادہ کیا۔ اس کا ابتدائی خاکہ تیار کرنے کے لیے علامہ محمد اسد صاحب کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ انہوں نے ابھی اپنا کام مکمل نہیں کیا تھا کہ وہ اس فریضہ سے دستبردار ہو گئے۔ علامہ محمد اسد صاحب حکومت پنجاب کے قائم کردہ محکمہ Department of Islamic Reconstruction کے ڈائریکٹر تھے مگر محکمہ ختم ہو جانے کے بعد آپ ملک سے باہر چلے گئے۔ میں نے بھی اس محکمہ میں ان کے ساتھ ایک سال کام کیا تھا، ان کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ

۲۔ Islam at the Cross-Road

۳۔ Road to Mecca

۴۔ Principles of state and government in Islam

اسی مذکورہ محکمہ سے وہ ایک انگریزی ماہنامہ Arafat کے نام سے بھی نکالتے تھے۔ جب علامہ محمد اسد نے شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی کا کام نامکمل چھوڑ دیا تو یونیورسٹی نے یہ کام علامہ صاحب کے سپرد کیا۔ آپ کی شب و روز کی محنت سے تمام امور جلد مکمل ہو گئے اور ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کا شعبہ علوم اسلامیہ (Department of Islamic Studies) قائم ہو گیا۔

اس شعبہ کے لیے چند کمرے پنجاب یونیورسٹی فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے اوپر دیئے گئے۔ انہیں کمروں میں دفتر، علامہ صاحب، سٹاف اور طلبہ بیٹھتے تھے۔ ایک کلرک ایک نائب قاصد تھا مگر سٹاف نہیں تھا۔ علامہ صاحب صدر شعبہ بھی تھے اور پروفیسر بھی۔ بعض دفعہ کلرک بھی، لائبریرین بھی۔ پہلے peon محمد شفیع صاحب تھے۔ علامہ صاحب زیادہ تر کام خود کرتے تھے۔ میزیں درست کرنا، کرسیاں لگانا، خط و کتابت کرنا۔ ایک دفعہ بجلی خراب ہو گئی تو خود ہی درست کرنے لگے۔ بجلی کا جھٹکا لگا اور بازو یا ہاتھ زخمی ہو گئے۔ گاڑی پرانی تھی، بڑی مشکل سے سٹارٹ ہوئی۔ بعض دفعہ ہم بھی دھکا لگاتے۔ بہر حال اپنی وضع کے خاص قسم کے درویش صفت صدر شعبہ تھے:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

خود بر سر آں کوزہ خریدار بیاد

ہمارے زمانہ میں اس شعبہ کو باقاعدہ مزید سٹاف نہ مل سکا۔ علامہ صاحب نے یونیورسٹی سے منظوری لے کر مقامی کالجوں سے لیکچرر دینے کے لیے پروفیسر صاحبان کا انتخاب کیا۔ ان اساتذہ کرام میں سے چند نام یاد ہیں:

علامہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب، ہم ہفتہ میں دو یا تین دن نماز فجر کے بعد ان سے پڑھنے کے لیے لارنس روڈ پر ان کے دولت کدہ پر جاتے۔

جو پروفیسر صاحبان شعبہ میں آکر پڑھایا کرتے تھے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب، گورنمنٹ کالج

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، اورینٹل کالج

مولانا علم الدین سالک صاحب، اور نیل کالج

ڈاکٹر برہان الدین فاروقی

غالباً ڈاکٹر بشارت صاحب

غالباً سید نذیر نیازی صاحب

ظہیر الدین قریشی صاحب

غالباً ڈاکٹر عابد صاحب (گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ریٹائرڈ پرنسپل)

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب

قرآن و حدیث کا پرچہ علامہ صاحب خود پڑھاتے تھے۔ فقہ کا یاد نہیں۔ عربی ادب

مولوی محمد شفیع صاحب، اردو ادب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، فارسی ادب، ترکی ادب خود علامہ صاحب نے پڑھایا۔ اسلام اور فنون لطیفہ و اسلامی فن تعلیم ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب نے پڑھایا۔

جب اگلے سال نئی کلاس ففٹھ ایئر میں داخل ہوئی تو کچھ باقاعدہ شاف بھی ملا۔

ہمارا ایم اے کافائنل امتحان ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ یہ کلاس نکلی تو یہ پورے پاکستان میں

پہلی ایم اے اسلامیات کی کلاس تھی۔ سارے کے سارے Select ہو گئے اور مختلف کالجوں میں اسلامیات کے لیکچرار ہو گئے۔ اس پہلے گروپ کے نام کچھ تو یاد ہیں:

۱۔ آفتاب احمد صاحب

۲۔ حبیب اللہ حسینی صاحب

۳۔ حافظ صاحب

۴۔ ظفر اللہ صاحب

۵۔ طاہر قادری صاحب

۶۔ جناب ضیاء الدین صاحب صدیقی

۷۔ جناب حسام الدین صاحب

۸۔ محترمہ ساجدہ صاحبہ

ہم نے شعبہ میں پہلی بار مجلس علوم اسلامیہ قائم کی، جس کے اجلاس باقاعدہ ہوتے تھے۔ پہلی کلاس کا گروپ فوٹو بھی ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں پہلا سالانہ اجلاس ہوا۔

علامہ صاحب نے قرآن و تفسیر کی تعلیم حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے شیرانوالہ مسجد کی صفوں پر بیٹھ کر حاصل کی۔ کالج کی تعلیم ایف سی کالج سے، دیگر علوم بھی حاصل کیے۔ خطابت کا ملکہ خداداد تھا۔ آپ کی شخصیت قدیم و جدید کا حسین ترین امتزاج تھی۔ انگریزی پر خوب عبور تھا۔

ہمارے زمانہ میں اہی غالباً پنجاب یونیورسٹی نے انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کرایا۔ علامہ صاحب کی نگرانی میں شعبہ اسلامیات نے سارا کام سنبھالا۔ یہ کلوکیم بہت اہم تھا۔ اس کا ریکارڈ مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

جب یونیورسٹی کے نیوکیپس کی بنیاد رکھی گئی تو ایک خاص تقریب ہوئی۔ علامہ صاحب بھی موجود تھے۔ غالباً سکندر مرزا نے سنگ بنیاد رکھا۔ تلاوت علامہ صاحب نے کرنی تھی اور ترجمہ ایف سی کالج کے پرنسپل نے غالباً انگریزی میں کرنا تھا۔ علامہ صاحب نے فرمایا میں ترجمہ دیکھنا چاہتا ہوں جب دیکھا تو فرمایا اللہ کا ترجمہ God نہیں کرنے دوں گا۔ اللہ کا ترجمہ اللہ ہی ہوگا۔ کافی بحث کے بعد اسے ماننا پڑا۔

علامہ صاحب ایک بار کر سچین جلسہ میں گئے اور تقریر کی۔ بعض نے اعتراض کیا۔ آپ نے فرمایا یہ بتاؤ وہاں میں نے اسلام کی بات کی یا اور۔ اگر اسلام کی بات کی ہے تو پھر کیا اعتراض ہے۔ یہ تو میں نے سنت رسول پاک ﷺ ادا کی۔

آپ علماء، مشائخ، وکلاء، پروفیسرز، طلبہ سب میں مقبول تھے۔ سب آپ کی عزت کرتے تھے۔ مختلف مسالک کے علماء بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔ سب طبقوں میں ہر دلعزیز تھے۔ آپ کی اولاد ذی وقار میں دختران کے علاوہ ایک ہی بیٹا ہے، نعمان صدیقی نام ہے اللہ ان کی عمر دراز کرے اور بزرگوں کے نقش قدم پر چلائے۔

آپ کی ذاتی لائبریری بہت قیمتی تھی۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند نے شعبہ اسلامیات کو دے دی تھی۔ آپ کچھ عرصہ بیمار رہے۔ میوہپتال میں زیر علاج بھی رہے آخر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ تا رفتہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علامہ علاؤ الدین صدیقی کا انتقال

تحریک پاکستان کے ایک ممتاز کارکن اور ملک کی مشہور تعلیمی شخصیت علامہ علاؤ الدین صدیقی کا بڑی بھرپور اور سرگرم زندگی بسر کرنے کے بعد ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ: قیام پاکستان کے بعد مرحوم بڑے اہم مناصب پر فائز رہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں کافی عرصے تک شعبہ اسلامیات کے بانی سربراہ رہنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں وہ اس دانش گاہ کے وائس چانسلر بھی بن گئے اور اس دوران میں اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ بھی مقرر ہو گئے، لیکن انہیں اصل اور منفرد عزت و شہرت تحریک پاکستان کے زمانے میں اس وقت حاصل ہوئی، جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے استاد تھے۔ اس کالج کے طلباء نے مسلم لیگ اور قائد اعظم کے پیغام کو دور افتادہ دیہات تک پہنچانے میں جو ناقابل فراموش کردار ادا کیا، اس میں اس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر عمر حیات ملک کے ساتھ علامہ صاحب کا حصہ سب سے زیادہ تھا اور اس بنا پر تحریک پاکستان کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ وہ مدت العمر تبلیغ دین کا فرض بھی ادا کرتے رہے اور مسجد شاہ چراغ میں خطبہ جمعہ کے ساتھ درس قرآن بھی دیتے رہے۔ وہ ایک مرنجان مرنج انسان اور صاحب علم ہستی تھے اور مذاہب کے تقابلی مطالعے میں خصوصی مہارت کے حامل تھے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد وہ مسلسل علالت کے باعث خاموش اور خانہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

میرے محسن، میرے استاد، میرے مربی علامہ علاء الدین صدیقی

۱۹۰۷ء - ۱۹۷۷ء

پروفیسر حافظ نذرا احمد ☆

استاد گرامی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنا ہم سب کا ایک فریضہ تھا جو بوجہ ٹلتا رہا۔ اب ان کی شاگرد عزیز محترمہ جمیلہ شوکت صاحبہ صدر شعبہ کی کاوشوں سے انجام پا رہا ہے۔ محترمہ کے شدید اصرار پر بندہ نے قلم اٹھایا تو بینائی ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ بیتی ہوئی باتیں اور خوشگوار لمحے ذہن میں کسی نہ کسی طور پر محفوظ ہیں لیکن احباب کے نام اور ماہ و سن مستحضر نہیں۔ امید ہے قارئین کرام استاد گرامی کے اس ۸۰ سالہ خادم کی اس کوتاہی پر اسے معذور تصور فرمائیں گے۔

حضرت علامہ علاء الدین صدیقی میرے محسن، میرے استاد، میرے مرشد اور میرے مربی تھے۔ لیکن وہ اکثر میرا تعارف ”چھوٹا بھائی“ کہہ کر کراتے تھے۔ یہ ان کی عالی ظرفی اور خورد نوازی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں شناسائی ہوئی۔ ابتدائی سالوں میں گاہ بگاہ ملاقات اور درس قرآن میں شرکت کے طور پر رہی۔ بعد ازاں ۱۹۴۴ء سے جمعیت اسلام اور جامعہ اسلام کے ناظم ادارہ کے طور پر تعلق قائم ہوا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں بندہ اسلامیات کا ایک لیکچرار تھا اور حضرت علامہ کئی سال صدر شعبہ رہے۔ ان کے ساتھ میزبانی رفاقت کی مدت کم و بیش چالیس سال پر محیط رہی۔ اس طویل مدت میں ایسا دور بھی آیا کہ تیرہ چودہ گھنٹے ساتھ رہا۔

الحمد للہ میرا یہ تعلق استاد محترم کی زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا۔ اس ناچیز کو ان

کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ یہ جنازہ میری زندگی کا مشکل ترین کام تھا۔ آگے استاد گرامی کی میت اور پیچھے نمازیوں کا جم غفیر، ان میں علماء، عمائدین شہر، اساتذہ اور طلباء کے علاوہ دوسرے احباب اور اعزہ بھی تھے۔ یہ بھابھی صاحبہ کے ارشاد کی تعمیل میں ہوا۔ میں عزیزِ نعمان صدیقی کی امی کو بھابھی کہتا ہوں اور وہ ازراہ شفقت مجھے ”بھائی“ کہہ کر یاد فرماتی ہیں۔

حضرت علامہ کا درسِ قرآن

استاد گرامی کے شب و روز کا اہم ترین پہلو اور زندگی بھر کا مستقل عمل ان کا شغف بالقرآن تھا۔ ان کے ایامِ حیات کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی صورت میں خدمتِ قرآن میں بسر ہوا لہذا اسی عنوان سے اپنی تحریر کا آغاز کر رہا ہوں۔

اس عملِ پیہم کی آبیاری ان کے استاد گرامی حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری نے کی۔ حضرت شیخ التفسیر نہ صرف اپنے شاگردوں سے یہ عہد لیتے تھے بلکہ اپنے ساتھ ہر تعلق رکھنے والے کو بطور وصیت فرمایا کرتے تھے کہ وہ روزانہ دوسروں تک قرآنِ کریم پہنچانا اپنا فریضہ حیات اور زندگی کا معمول بنائیں گے۔ خواہ ایک آیت ہی ہو، علامہ صاحب ان کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت علامہ اپنے استاد گرامی کا حد درجہ احترام فرماتے تھے۔ سیاسی نظریات میں شدید اختلاف کے باوجود آپ نے کبھی ایک لفظ بھی ان کے خلاف زبان سے نہیں نکالا۔ احترام اور عقیدت کا یہ حال تھا کہ آپ نے پہلی موٹر کار خریدی تو گھر لے جانے سے قبل پہلے استاد گرامی کے آستانے پر حاضر ہوئے۔ بعد ادب اور بعد اصرار انہیں کار میں بٹھایا، کچھ سیر کرائی اور ان کی دعائیں لے کر اپنے گھر گئے۔ ان دنوں آپ کی رہائش اپنے آبائی مکان بنگلہ ایوب شاہ اندرون شیرانوالہ دروازہ میں تھی۔

درس قرآن کریم کی ابتداء

علامہ صاحب نے اپنے مستقل درس قرآن کی ابتداء پنجاب سول سیکرٹریٹ کی مسجد

سے کی یہاں وہ باقاعدگی سے بعد نماز عصر قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ برطانوی اقتدار کے عروج کا دور تھا۔ جب درس میں جہاد کی آیات پر پہنچے اور افسران بالاتک یہ بات پہنچی تو انہوں نے گوارا نہ کیا۔ اس سے قبل کہ کوئی ناخوشگوار صورت سامنے آتی۔ شرکاء درس اور احباب کے مشورہ سے درس ہائی کورٹ سے متصل مسجد شاہ چراغ میں منتقل ہو گیا۔

مسجد شاہ چراغ شاہراہ قائد اعظم پر ہائی کورٹ سے متصل واقع ہے۔ اس کے نام کی نسبت معروف بزرگ شاہ چراغ علیہ الرحمۃ سے ہے۔ مسجد ان کے مزار کے پہلو میں ہے۔ انگریزوں کے دور میں یہ مسجد سیشن کورٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مسجد شہید گنج کے قضیہ کے نتیجہ میں ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ واگزار ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد انجمن اسلامیہ لاہور نے اس کی تعمیر نو کی۔

مسجد شاہ چراغ کا درس قرآن بھی بلا ناغہ بعد نماز عصر ہوتا تھا۔ اپنی ناگزیر دفتری مصروفیات کے سبب حضرت علامہ کبھی لیٹ ہو جاتے، لیکن شرکاء درس گھنٹوں انتظار کرتے۔ ان میں ہر طبقے کے افراد ہوتے تھے۔ ہائی کورٹ کے وکلاء، ملحقہ دفاتر خصوصاً اے جی آفس، جی پی او کے افسران اور ملازمین، مزنگ اور شہر کے دوسرے حصوں سے آنے والے حضرات، نوجوانوں میں غالب تعداد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلباء کی ہوتی تھی۔ ان میں سے کچھ کے نام اب بھی ذہن میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر نفیس الاسلام، ڈاکٹر رفیق مرزا، ڈاکٹر رشید چوہدری، ڈاکٹر محمد علی وغیرہ۔ درس کے شرکاء میں ایک خاص شخصیت قاضی محمود عارفی کی تھی۔ وہ مختصر نویس تو نہ تھے، اپنے خاص انداز میں حضرت علامہ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک فقرہ نوٹ کر لیتے تھے۔ درس قرآن پر کیا منحصر ہے، استاد محترم کی تقریر کہیں ہوتی وہ سایہ کی طرح وہاں موجود ہوتے اور نوٹ ضبط تحریر میں لاتے۔ ناواقف انہیں ”کار خاص“ کا آدمی سمجھتے تھے۔ اللہ اللہ کیسے مشتاق تھے۔

درس قرآن کا انداز

حضرت علامہ علاؤ الدین صدیقی جتہ جتہ آیت کی بجائے مسلسل درس قرآن دیتے تھے۔ آپ پہلے متعلقہ آیت کی تلاوت فرماتے۔ اس کا سلیس ترجمہ کرتے۔ بعد ازاں

قرآن کریم کے اس زیر نظر حصے کی توضیح و تشریح فرماتے۔ ربط آیات اور تفسیر قرآن بالقرآن آپ کا ایک خاص انداز تھا۔ تقریر میں جوش اور عمل بالقرآن کی تحریک آپ کی منفرد خصوصیت تھی۔ اسرائیلیات سے ہمیشہ گریز فرماتے۔ نفس مضمون سے ہٹ کر نکتہ آفرینی کو اوج قرآن مجروح کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ آپ شان نزول ضرور بیان کرتے کہ اس سے قرآن فہمی میں مدد ملتی ہے۔ آپ شرکاء درس کو اکثر مشورہ دیا کرتے تھے کہ اگر کبھی کسی آیت کا ترجمہ اور مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آئے تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمے سے رجوع کرنا چاہیے۔

درس کے آخر میں آپ مضامین کا اعادہ اور درس کا خلاصہ ضرور بیان فرماتے۔ یہی انداز آپ کے دیگر خطبات اور تقاریر کا تھا۔

درس قرآن کے ساتھ حضرت علامہ کے والہانہ شغف اور انہماک کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کئی بہنوں کے بھائی آپ کا اکلوتا بیٹا محمد عارف صدیقی شدید بیمار تھا۔ بچہ کی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ اس حالت میں آپ دفتر آگئے بعد عصر دفتر سے اٹھ کر مسجد شاہ چراغ میں درس قرآن شروع کر دیا۔ اسی دوران گھر سے ایک عزیز غم کی خبر لے کر آئے سامنے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ آپ کا جوش خطاب دیکھ کر انہیں درس کے دوران ٹوکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

غم کی خبر لانے والے کا مغموم چہرہ دیکھ کر آپ خبر کی نوعیت سمجھ گئے۔ لیکن نہ درس قرآن درمیان میں چھوڑا، نہ مختصر کیا۔ درس مکمل کرنے پر احوال دریافت کیا حادثہ فاجعہ کی خبر سن کر صرف انا اللہ وانا الیہ راجعون کہا اور گردن جھکا کر ان کے ساتھ ہو لیے۔ عزم و استقامت کا یہ مثالی جذبہ دیکھ کر ہم سب دم بخود رہ گئے۔ آج عزیمت کے یہ پیکر کہاں ہیں۔ کم لوگوں کو علم ہو گا کہ حضرت علامہ شعر بھی کہتے تھے۔ بیشتر آپ مشق سخن فارسی زبان میں کرتے تھے۔ عارف تخلص تھا جو غالباً اس مرحوم بچہ کی نسبت سے اختیار کیا تھا۔

درس کی دو تقاریب

(۱) درس قرآن کے دوران سورۃ البقرہ ختم ہوئی تو طے پایا کہ اس موقع پر ایک خاص تقریب منعقد کی جائے۔ تاریخی عمارت مقبرہ جہانگیر میں شرکاء درس اور دوسرے احباب کو جمع کیا گیا۔ یہیں شب ب سری ہوئی۔ کام و دہن کے لیے ایک گائے ذبح کی گئی۔ یہ ایک یادگار اجتماع تھا۔

میوہسپتال کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالحمید ملک بھی درس کے شرکاء اور حضرت علامہ کے قدیم رفقاء میں سے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ نے سورۃ البقرہ کے ختم پر ذبح بقرہ کی خبر سنی تو ڈاکٹر صاحب سے کہا سورۃ النساء کے ختم پر کیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ کہا ایک اور ”نسا“ (عورت) کا اضافہ۔

(۲) سورۃ یوسف ختم ہوئی تو اس کے اختتام پر مسجد شاہ چراغ میں ایک یادگار علمی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ درس کے شرکاء کے علاوہ شرکت کی دعوت عام تھی۔ اس موقع پر لاہور کے مقتدر علماء نے سورۃ یوسف کے متعدد عنوانات اور مختلف پہلوؤں پر خطاب فرمایا۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے ان حضرات میں مولانا محمد بخش مسلم، مولینا عبدالحمید مرزا اور مولینا محمد یوسف سلیم چشتی شامل تھے۔ ان حضرات کے ارشادات سے ہم سب نے خوب خوب استفادہ کیا۔

حضرت علامہ اور مسجد شاہ چراغ

(۱) خطبہ جمعہ

حضرت علامہ نے ایک طویل عرصہ جامع شاہ چراغ میں جمعہ کا خطبہ دیا بلکہ اگر یوں کہوں تو درست ہوگا کہ مدت العمر یہ خدمت انجام دی۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے ۱۹۴۲ء میں خطبات جمعہ کا آغاز ہوا اور جب تک آپ کی صحت بحال رہی، کہیں بھی ہوتے جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے ضرور مسجد تشریف لاتے۔ اس طویل عرصے میں آپ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسلامیہ کالج کے صدر شعبہ

علوم اسلامی رہے۔ جامعہ پنجاب کے صدر شعبہ بنے کئی سال جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ ریٹائر ہوئے لیکن خطبہ جمعہ بدستور دیتے رہے۔

اگر کبھی آپ تشریف نہ لاتے تو ملک امانت علی صاحب یا بندہ کو خطابت کا فریضہ ادا کرنا ہوتا۔ آپ خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن کریم کی کوئی آیت تلاوت فرماتے۔ آیہ مبارکہ کا انتخاب گہرے غور و فکر کا نچوڑ ہوتا تھا کہ یہی آیت تقریر کا سرعنوان ہوتی تھی۔ یہ خطبہ جمعہ صحیح معنوں میں گزرے ہفتے کے حالات کا محاکمہ اور آنے والے ہفتے کے لیے پیغام عمل ہوتا تھا۔ آپ کا خطبہ جمعہ سیاست، معاشرت، معیشت اور اخلاقی موعظت کا ایک حسین امتزاج ہوتا تھا۔

علامہ صاحب کا خطبہ جمعہ کیا تھا زندگی کا ایک پیغام، وقت کی پکار اور اسلامی تعلیمات کا نچوڑ۔ خطبہ سننے کے لیے دور نزدیک سے، بلکہ شہر کے ہر گوشے سے پیر و جوان آتے تھے اور زندگی کا ایک نیا ولولہ لے کر واپس ہوتے تھے۔

خطبہ جمعہ کے بعد مسجد ہی میں یا ملحقہ جامعہ اسلامیہ کے دفتر میں سوال و جواب کی ایک مجلس نماز عصر کے وقت تک ہوتی۔ آپ کی اس مجلس میں شرکت کے لیے کوئی قید نہ تھی۔ احباب، اراکین جمعیت اسلامیہ اور جمعہ کے نمازی ایک کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔

اس موقع پر ایک غیر معروف لیکن پر جوش اور ناقابل فراموش بزرگ کا ذکر ضرور کروں گا۔ دراز قامت، سادہ مزاج، سادہ لباس، معمولی خواندہ، لیکن پُر جوش اور با غیرت مبلغ اسلام تھے بابا دین محمد ان کا نام تھا۔ اپنے قد جتنا لمبا عصا ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ بالعموم ہر دوسرے تیسرے جمعہ کو شہر پور سے آتے تھے۔

اس زمانے میں مسیحی مکتی فوج کالاہور میں بڑا زور تھا کونز روڈ پر اس مسیحی ادارے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ مکتی فوج والے بینڈ باجے کے ساتھ شہر کا گشت کرتے اور چوراہے پر کھڑے ہو کر مسیح کا پیغام پہنچاتے۔ مولوی دین محمد ان کے خلاف اسلام کی یہ باتیں برداشت نہ کر سکے۔ لیکن بینڈ باجے کی دھن میں ان کی آواز دب جاتی۔ آخر انہوں نے ایک ڈھول والے کو ساتھ لیا۔ سڑک کے ایک طرف مکتی فوج کا بینڈ اور دوسری طرف آپ کے ڈھول کی گونج راہ چلتے اس کیفیت کو دیکھ کر جمع ہو جاتے۔ آپ بلا توقف اسلام کی حقانیت پر بلند آواز میں تقریر شروع کر

دیتے۔ اس طرح آپ نے مکتی فوج کو پسپا کر دیا۔

(۲) حضرت علامہ کے زمانے میں مسجد شاہ چراغ ایک فعال مرکز کی حیثیت رکھتی تھی ہر سال ماہ رمضان میں تین تقاریب منعقد ہوتی تھیں۔ اشتہارات کے ذریعے اور اخباروں میں باقاعدہ ان کا اعلان ہوتا، اور حاضرین کی ایک بڑی تعداد ہر تقریب میں شریک ہوتی یہ اجلاس اتوار کو صبح کے وقت ہوتا تھا۔

روزہ اور یادگار نزول قرآن

غزوہ بدر۔۔ اعلان جہاد

فتح مکہ۔۔ اسلامی ریاست کا قیام

اس دور کے مقتدر علمائے کرام ان تقاریب میں خطاب فرماتے۔

(۳) رمضان المبارک کے آخری حصے میں ہر سال ایک اجتماعی افطار پارٹی ہوتی۔ اس میں اراکین جمعیت، شرکاء و درس کے علاوہ دوسرے احباب بھی مدعو ہوتے تھے۔

اس اجتماعی افطار پارٹی میں خصوصیت سے دوسرے ماکولات و مشروبات کے علاوہ قیمے والے نان اور سبز چائے خاص طور پر تیار کرائی جاتی تھی علامہ صاحب اس موقع پر ہر سال ایک جامع خطاب بھی فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علامہ ایک ادارہ ساز شخصیت

حضرت علامہ علاؤ الدین صدیقی اپنے دور کے ایک انتہائی فعال فرد تھے۔ آپ زندگی بھر متعدد اداروں کے رکن اور کئی انجمنوں کے صدر رہے۔ لاہور کی واحد انجمن، انجمن اسلامیہ کے مستقل رکن رہے اس طرح انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے فعال ممبر تھے۔ انجمن خدام القرآن شیرانوالہ گیٹ سے تو آپ کا خاص تعلق تھا کہ یہ آپ کی مادر در سگاہ بھی تھی ان کے علاوہ شاید ہی شہر کی کوئی انجمن ہو جس سے کسی نہ کسی انداز سے آپ کا تعلق قائم نہ ہو۔ جمعیت اسلامیہ اور جامعہ اسلامیہ تو آپ کے اپنے قائم کردہ ادارہ تھے۔

جمعیت اسلامیہ شاہ چراغ

سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد آپ نے ۱۹۴۴ء میں جمعیت اسلامیہ قائم کی۔ اس کے اراکین و معاونین میں ہر چھوٹے بڑے فرد ملت کو شمولیت کے لیے صلائے عام تھی۔ جمعیت کے پہلے آفس سیکرٹری شیخ بشیر الدین احمد تھے اعزازی کارکنوں میں محمد عامل، ڈاکٹر محمد علی، عبدالستار خان اور کبیر احمد سٹشی اور فضل حسین قریشی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کے خاص خدام (نائب قاصدوں) میں افضل خان، عبدالرؤف اور محمد شفیع کا ذکر ضروری ہے۔

جمعیت کے اراکین میں سے مندرجہ ذیل اصحاب کے نام آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ملک امانت علی صاحب جو جمعیت کے نائب صدر تھے اور ہم انہیں علامہ کا نائب خلیفہ تصور کرتے تھے۔ عبدالحق نیاز، سعادت علی ملک، سید نور علی شاہ، نظام الدین نعمانی، میاں محمد شمیم، محمد افضل مرزا، محمد رفیق درکب، میاں محمد یوسف سہگل، چوہدری کرم الہی، عبدالستار غزنوی، خلیل الرحمن مفتی، ملک عطا محمد، شیخ محمد حسین اور میاں نور الدین وغیرہ۔

جمعیت اسلامیہ کا موٹو اس کے مقاصد اور فکر و عمل کا مکمل آئینہ دار ہے۔ ”خدا خونی خدمت خلق، خوش خلقی“، خود استاد محترم کی زندگی انہی تین جملوں کا مرکز و محور تھی۔ وہ صدر مجلس تھے اور بندہ کو سیکرٹری ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جمعیت کے عام معاونین کی تعداد سینکڑوں افراد پر مشتمل تھی۔

جامعہ اسلامیہ شاہ چراغ

جامعہ اسلامیہ گواہیک ذیلی ادارہ تھا لیکن اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے اعتبار سے اسے ایک مستقل درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ عصر کے بعد سے نماز عشاء تک مختلف شعبوں میں تعلیم و تدریس کا نظام قائم تھا۔

ان شعبوں کے نگران و استاد حسب ذیل تھے:

آ۔ قرآن حضرت علامہ علاؤ الدین صدیقی

- ۲۔ حدیث مولینا مفتی عبدالقیوم ندوی
 ۳۔ فقہ مولینا مفتی عبدالقیوم ندوی
 ۴۔ عربی مولینا فضل الرحمن ایم اے (جو بعد میں متنازعہ فیہ شخصیت ہو گئے)

- ۵۔ تاریخ اسلام مولینا فضل الرحمن ایم اے
 ۶۔ تجوید و قرأت قاری محمد طفیل امرتسری اس دور میں ان کا شمار فن قرأت کے ماہرین میں ہوتا تھا۔

۷۔ شعبہ فن خطابت اس شعبہ کے نگران ہائی کورٹ کے سینئر ایڈووکیٹ تائب تھے۔ افسوس ان کا نام حافظہ سے غائب ہے۔

یہ تدریسی ادارہ کئی سال قائم رہا اور طالبان علم و فن اس سے استفادہ کرتے رہے۔

عالمی ادارہ تبلیغ اسلام (World Mission of Islam)

مسجد شاہ چراغ میں قائم ہونے والا یہ تیسرا ادارہ تھا۔ اس کے مقاصد اس کے نام سے ظاہر ہیں۔ حضرت علامہ کی خواہش تھی کہ اس ادارہ کے تحت عالمی سطح پر تبلیغ اسلام کا انتظام کیا جائے۔ یہاں اسلام کے داعی اور مبلغین کی تعلیم و تربیت کا مرکز قائم ہو۔ یہاں سے دنیا کے مختلف گوشوں میں مبلغ بھیجے جائیں۔

اس ادارے کے تحت آپ نے انگریزی مجلہ The Light of Islam کا اجراء کیا۔ انگریزی زبان میں یہ ایک وقیع میگزین تھا۔ اس کے متعدد شمارے شائع ہوئے۔ ان کے اکثر مضامین حضرت علامہ کے فکر و کاوش کا نتیجہ ہوتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ استاد گرامی کی قلمی یادگار یہی رسالہ اور اس کے مضامین ہیں۔ اگر یہ یکجا ایک کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تو بہت اچھا ہو۔

افسوس حضرت علامہ کی شدید مصروفیات اور گرتی ہوئی صحت نے ساتھ نہ دیا اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

حضرت علامہ کی متنوع سرگرمیوں پر ایک نظر

ایک مضمون میں حضرت علامہ کی متنوع سرگرمیوں پر احاطہ کرنا ممکن نہیں تاہم محض تعارف اور ریکارڈ کے لیے اس ضمن میں چند سطور قلم بند کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

پنجاب مسلم لیگ اور تحریک پاکستان

- ☆ حضرت علامہ نے تحریک پاکستان میں پر جوش انداز میں حصہ لیا۔
- ☆ آپ خضر وزارت کے خلاف تحریک عدم تعاون کے قائدین میں شامل تھے۔
- ☆ فیصلہ کن عام انتخابات میں آپ کا کردار بہت نمایاں رہا۔
- ☆ بھارت سے آنے والے مہاجرین کی آباد کاری میں آپ نے فیصلہ کن خدمات انجام دیں۔ بطور جنرل سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ ملکی سیاسی تاریخ میں آپ کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

☆ آزاد کشمیر حکومت کا قیام جس بے سروسامانی کے ساتھ عمل میں آیا وہ تاریخ پاکستان کے طلباء سے مخفی نہیں۔ موجودہ ریڈیو آزاد کشمیر ”ریڈیو تراڑ کھل“ کے نام سے ایک ٹرک سے نشریات کرتا تھا۔ اب ابتدائی دور میں حضرت علامہ نے مسجد شاہ چراغ میں ”کشمیر ریلیف کمیٹی“ کے قیام کا اعلان فرمایا۔ آپ اس کمیٹی کے صدر پروفیسر علم الدین سالک جنرل سیکرٹری قرار پائے۔ سیکرٹری مالیات کی خدمات بندہ کے سپرد ہوئیں۔ زندہ دلان لاہور نے دل کھول کر حصہ لیا کچھ رقم جمع ہوئی تو بندہ نے صدر آزاد کشمیر کو خط لکھا کہ یہ حقیر سی رقم کس پتہ کس ذریعہ سے پہنچائی جائے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

مسجد شاہ چراغ سے ملحقہ جمعیت اسلامیہ کے دفتر میں ایک نوجوان تشریف لائے اور خود تعارف کرایا۔ ”میرا نام سردار محمد ابراہیم ہے“ یہ تھے آزاد کشمیر کے پہلے صدر جمع شدہ رقم کا چیک بعد احترام ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اللہ اللہ یہ تھا ہمارے سفر کا آغاز۔ امید کرتا ہوں کہ حضرت علامہ کی سیاسی زندگی کے اس درخشندہ دور پر کوئی صاحب قلم تفصیل سے لکھیں گے۔

ریڈیو کی نشریات

ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والی آپ کی تقریریں علم و حکمت کا ایک مخزن ہوتی تھیں اور ملت کے لیے ایک حیات آفرین پیغام۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ کا چلنا پھرنا اور ریڈیو اسٹیشن تک پہنچنا ممکن نہ رہا تو ریڈیو پاکستان کے کارکنوں نے آپ کے بستر سے تقریریں ریکارڈ کیں اور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ کوئی عزیز ان نشریات کو جمع کر کے اشاعت کا اہتمام کرتے۔

سیرت کانفرنس

حضرت علامہ کی تقاریر اور خطبات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ آپ نے ہر تقریب میں خطاب کیا اور ہمیشہ عوام و خواص سے خراج تحسین حاصل کی۔ لیکن یہاں جنرل ایوب کے مارشل لاء دور میں منعقد ہونے والی سیرت کانفرنس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ملک امیر محمد خان جیسے جابر پنجاب کے گورنر تھے یہ گھٹن کا ایک دور تھا۔ چند احباب نے سہ روزہ سیرت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ آپ اس سیرت کمیٹی کے صدر قرار پائے۔ خلیل الرحمن مفتی سیکرٹری اور داعی مقرر ہوئے۔ اس سیرت کانفرنس نے عوامی گھٹن اور جمود کو توڑا اور ملت کے مختلف مسالک کے درمیان ہم آہنگی کی ایک مثال قائم ہوئی۔ کاش کہ بعد کے ادوار میں بھی یہ فضا برقرار رہتی۔

علامہ صاحب نے سیرت کانفرنس کا منصوبہ یوں مرتب کیا:

پہلے اجلاس میں اہل سنت والجماعت حنفی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ چوٹی کے علماء نے تقاریر کیں۔ آج بھی ان کے اسمائے گرامی اور سٹیج پر ان کا بغل گیر ہونا اور ایک ہی پلیٹ فارم سے تقاریر کرنا میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مولینا احتشام الحق، مولینا محمد حامد بدایونی، مولینا محمد داؤد غزنوی اور حافظ کفایت حسین پہلے اجلاس کے گراں قدر مقررین تھے۔ اسی طرح ہر اجلاس میں چاروں مکتب فکر کے چارہم پایہ مقررین خطاب فرماتے رہے اور ہم آہنگی کا اعلیٰ نمونہ قائم کرتے رہے۔

سیرت کانفرنس کی ایک نشست نعتیہ مشاعرے کی تھی۔ موچی دروازے کے باہر اور رات میں ایک مشاعرہ کسی ہنگامے کے بغیر ہو جائے یہ ایک ناقابل فہم بات تھی لیکن حضرت علامہ نے دوائیے لیکچر دیئے جس سے کسی ہنگامے کی گنجائش نہ رہی۔ نعتیہ مشاعرے کے اشتہار اور اعلانات میں بار بار کہا گیا کہ کوئی صاحب بے وضو مشاعرے میں شامل نہ ہو اور برہنہ مشاعرے میں نہ آئیں۔ پھر سٹیج پر آپ کی موجودگی نے مشاعرے میں ایک خاص تقدس پیدا کر دیا۔

سیرت کانفرنس کا آخری اجلاس مقالات کے لیے مخصوص تھا یہ اجلاس پنجاب یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا، عین وقت پر بجلی فیل ہو گئی۔ حضرت مولینا ابوالحسن علی میاں اپنا لکھا ہوا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ جونہی آپ دھیمی آواز میں بولتے ہیں ہال حاضرین سے کچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین تک آواز پہنچنے کا کوئی انتظام نہ تھا لیکن استاد گرامی کے بار بار اعلان نے حاضرین کو کامل سکوت پر مجبور کیا۔ کسی گوشے سے کسی ہونٹنگ یا نعرے کی آواز بلند نہ ہوئی۔ واقعی حضرت علامہ کی شخصیت بڑی مسحور کن تھی۔



علامہ صدیقی - ایک نابغہ روزگار شخصیت کچھ باتیں - کچھ یادیں

پروفیسر حافظ نذر احمد

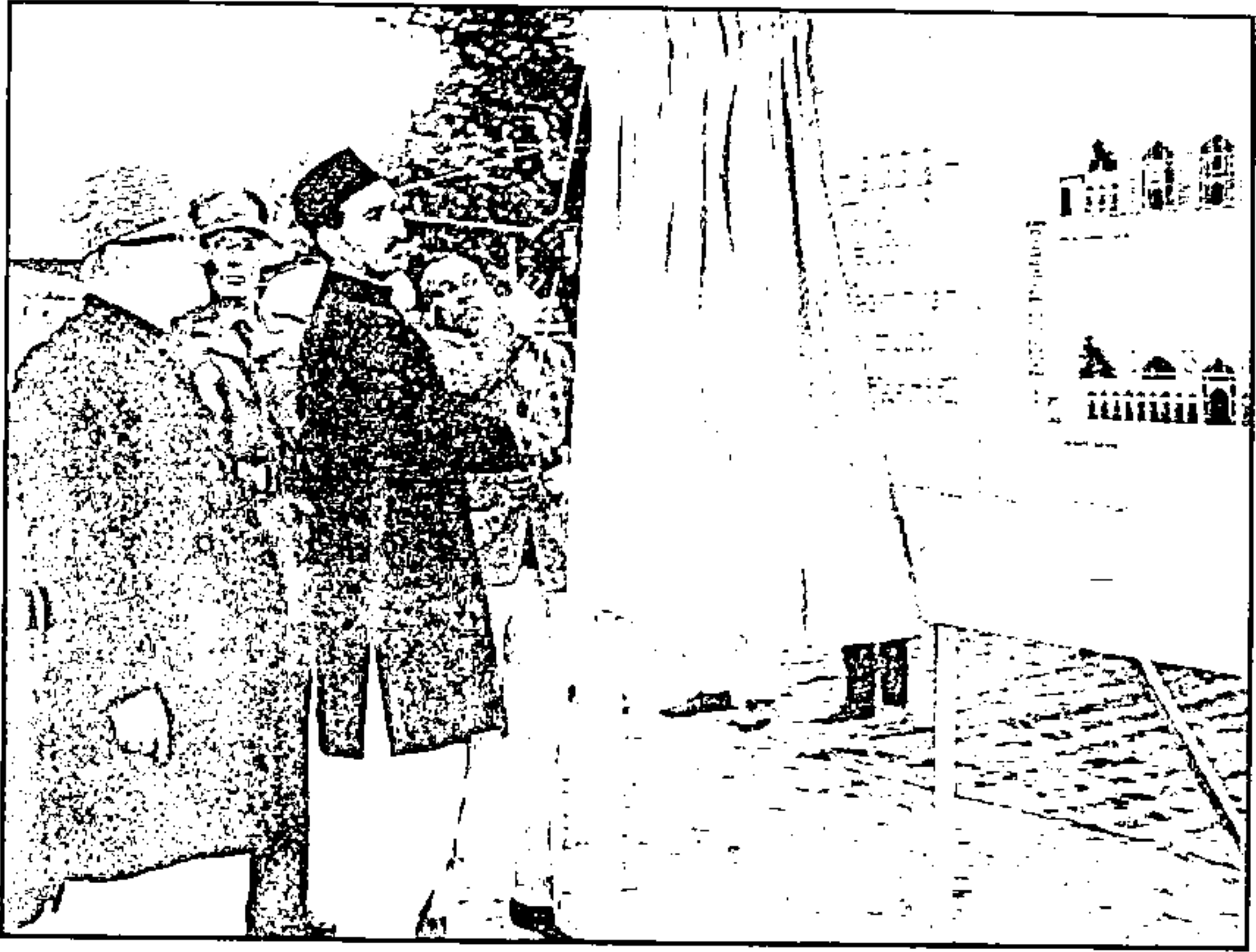
حضرت علامہ ایک جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ راست گفتار، راست رو، اور راست کردار تھے۔ ان کی راست روی کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ وہ میز کرسی میں بھی کچی گوارا نہ کرتے۔ کیا مجال کہ کاغذ پر ٹیڑھی سطر کھینچ جائے۔ دیوار پر کوئی قطعہ یا کیلنڈر ذرا بھی ٹیڑھا آویزاں ہو جائے، فرمایا کرتے تھے کہ اس سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

ذاتی کردار

استاد محترم کی ذات میں سخاوت، دریادلی، نرم روی، عفو و درگزر اور خوردنوازی کے اوصاف نہایت نمایاں تھے۔ کسی سائل کے سوال کو رد کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بڑا گھر بھول گئے، جیب میں کچھ نہ ہوا تو کسی سے ادھار لے کر بھی سائل کے سوال کو پورا کیا۔ کئی پیشہ وران کی اس ”کمزوری“ سے بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔ حقیقت حال معلوم ہونے پر بھی حضرت علامہ کی پیشانی پر شکن نہ پڑتا۔

کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ اس کی ہر ممکن امداد کرتے۔ دوسروں کو بھی پرزور انداز میں اس پر آمادہ کرتے۔ خاص طور پر نو مسلموں سے انہیں حد درجہ لگاؤ تھا۔ مقدور بھران کی خدمت کرتے۔ سول سیکرٹریٹ کے ایک اسٹنٹ برسر روزگار ہونے کے باوجود محض نو مسلم ہونے کے ناطے برسوں ان سے مالی تعاون حاصل کرتے رہے۔

استاد گرامی کی صاف گوئی کا یہ ذاتی واقعہ کبھی نہیں بھولتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ آپ عارضہ قلب کے باعث بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ گھر سے باہر نکلنا تقریباً ترک ہو چکا تھا۔ ان کے اس حقیر تلمیذ کے قائم کردہ تعلیم القرآن خط و کتابت سکول کا سالانہ اجلاس تھا۔



چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ جامع مسجد پنجاب یونیورسٹی کا افتتاح کرتے ہوئے
(۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)



ترکی کے ڈاکٹر وقار ورسان
وائس چانسلر علامہ علاء الدین صدیقی کے ہمراہ ۱۹۷۱ء

احقر نے صدارت کی درخواست کی۔ آپ نے معذوری کے باوصف قبول کر لی۔ بندہ نے اپنی روداد میں جاری شدہ کورسز کی تفصیل اور طلباء کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے عرض کیا گویا تعداد دو لاکھ سے اوپر ہو چکی ہے، لیکن اغیار کی مساعی کے مقابل کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا کہ ”یہ جھوٹ کہہ رہا ہے“ سچ جانیے میری تو جان ہی نکل گئی۔ حاضرین بھی حیران ہو گئے۔ لیکن چند ثنائے کے توقف کے بعد آگے کا دوسرا جملہ تھا ”میں زندگی بھر خواب دیکھتا رہا اس نے میرے خواب کو حقیقت کا عملی جامہ پہنا دیا یہ تھوڑی بات ہے۔“

ایک مجلسی شخصیت

حضرت علامہ کا ایک نمایاں پہلو ان کی مجلسی شخصیت تھی۔ آپ ہر مجلس میں بے تکان گفتگو کرتے۔ بات سے بات نکالنا، الفاظ سے کھیلنا Spining of the words گفتگو کو لطائف اور ہلکے پھلکے مزاحیہ جلوہ سے شگفتہ رکھنا حضرت علامہ کی انفرادیت تھی۔ اس طرح آپ ہر محفل میں میر مجلس رہتے۔ طویل نشست میں بھی کسی کی طبیعت مکر نہ ہوتی۔

استاد گرامی ہر موضوع پر اظہار خیال فرماتے۔ خوش دلی سے ہر سوال کا جواب دیتے۔ ایک اجنبی شخص بھی چند لمحوں کی نشست کے بعد محسوس کر لیتا کہ وہ ایک ہمہ داں شخصیت سے ہم کلام ہے جسے ہر علم و فن پر کامل عبور حاصل ہے۔ آپ کسی شخص کو گفتگو سے باز نہ رکھتے۔ لیکن اپنی پرکشش شخصیت اور عالمانہ گفتگو کے سبب مجلس پر چھائے رہتے۔ ایک محترم دوست نے جنہیں آپ کے خاص شاگرد اور معتمد رفیق کار ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ایک دن دوران گفتگو اس کیفیت کو اپنی سادگی سے یوں بیان کیا۔ حضرت استاد گرامی کی مثال برگد کے ایک تناور درخت کی ہے جو سب پر سایہ فلگن رہتا ہے، لیکن پودے اس کے نیچے ابھرتے نہیں۔ مثال غلط تھی، لیکن آپ نے مسکرا کر بات کو ٹال دیا۔

ایک کامیاب خطیب

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پہلی بار کب اور کس نے انہیں ”علامہ“ کہا جو ان کے اسم گرامی کا جزو لاینفک بن گیا۔ یہ ایک قابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت علامہ کو متنوع علوم پر

عبور حاصل تھا۔ وہ واقعی علامہ تھے۔ اسلام، ادیان عالم، اخلاق، معاشرت، معیشت، ادب اور ادبیات اور سیاست غرض ہر موضوع پر بے تکان اظہار خیال فرماتے۔ ہر خطاب میں علم و فضل کی چاشنی ہوتی تھی۔

تقریر مسجد میں ہوتی یا کسی یونیورسٹی کے ہال میں یا عوامی جلسہ عام میں۔ آپ اپنی ہر تقریر اور خطاب کا آغاز خطبہ مسنونہ اور کلام اللہ کی کسی آیت مبارکہ سے فرماتے۔ یہ آپ کی عادت مستمرہ تھی۔ یہ تلاوت محض تبرک کے طور پر نہ ہوتی۔ آیت کا انتخاب گہرے سوچ بچار کا نتیجہ ہوتا کہ وہ پوری تقریر کا سرعنوان ہوتی تھی۔

کلام اللہ کی تلاوت اور تقریر کا ایک خاص انداز تھا۔ آواز کے زیر و بم اور الفاظ درو بست کی نوعیت منفرد تھی۔ گھنٹوں بے تکان تقریر فرماتے، اس کے تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا۔ نکتہ آفرینی یا شعلہ بیانی کے زور میں کبھی موضوع سے ادھر ادھر نہ ہوتے۔ آپ کی مسحور کن شخصیت اور پر مغز خطاب کا یہ نتیجہ تھا کہ طویل تقریر کے باوجود حاضرین اکتاہٹ کا شکار نہ ہوتے۔ صدر شعبہ اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کے باوجود آپ ایک کامیاب عوامی مقرر بھی تھے۔

ایک قابل ذکر خطیب

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے مارشل لا کا ابتدائی پر جلال دور تھا۔ تقاریر اور جلسے جلوس خلاف قانون تھے۔ راولپنڈی میں اس دور کے غالباً پہلے جلسہ سیرۃ النبی ﷺ کا فیصلہ ہوا۔ کمشنر راولپنڈی ڈویژن اس کے مہتمم تھے۔ وہ علامہ صاحب کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ طے پایا کہ علامہ علاؤ الدین صدیقی خطاب فرمائیں گے اور جلسے کے واحد مقرر ہوں گے۔ دس پندرہ منٹ کے لیے فیلڈ مارشل شرکت کریں گے۔ (استاد گرامی نے لاہور واپسی پر بتلایا کہ میں نے ان گنت تقریریں کی ہیں لیکن میری زندگی کی یہ مختصر ترین تقریر مشکل ترین تقریر تھی۔ میں ہوٹل میں رات کا بیشتر حصہ سوچتا رہا کیا کہوں کہ موضوع کا حق بھی ادا ہو جائے اور سربراہ مملکت کو واضح پیغام بھی مل جائے۔

تقریر ہوئی، حاضرین نے پسند کی، جلسہ ختم ہوا۔ ہوٹل میں پہنچے تو کمشنر صاحب کا پیغام ملا فیلڈ مارشل نے یاد کیا ہے۔ وہ کیا کہیں گے کچھ اندازہ نہ تھا۔ حاضری ہوئی، دوران گفتگو محمد ایوب خان نے دریافت کیا ”مولوی صاحب انگریزی جانتے ہو؟“۔ جواب تھا ”ایم اے پاس ہوں، قانون میں ایل ایل بی ہوں۔“ ”کیا اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کے فرائض انجام دے سکو گے؟“۔ ”ان شاء اللہ“۔ اس طرح یہ مختصر ترین خطاب کسی سفارش یا تحریک کے بغیر اسلامی نظریاتی کونسل تک لے گیا۔

کتب بنی اور کتابوں کی جمع آوری

یہ جملہ گستاخانہ ہوگا، لیکن حقیقت ہے کہ استاد گرامی کو کتابیں جمع کر نیکاشوق جنون کی حد تک تھا۔ کوئی اچھی کتاب سامنے آ جاتی، کوئی قیمت ہو ضرور خرید لیتے۔ خصوصاً پرانی کتابیں بڑی جستجو اور اشتیاق سے حاصل کرتے۔ لاہور کے قدیم کتب فروشوں سے خاص رابطہ تھا۔ چوک لنڈا بازار، ڈیوڑھی مسجد وزیر خان، پرانی انارکلی کے فٹ پاتھ، مولوی شمس الدین مرحوم کا ذخیرہ کتب اور اندرون شہر ان کے کئی مرکز تھے۔ انہیں آپ کے ذوق کا اندازہ تھا۔ وہ حضرت علامہ کی طلب کی کتابیں ایک طرف رکھ لیتے۔ آپ تشریف لے جاتے اور منہ مانگے داموں لے لیتے۔ بجنور (یوپی) مدیر اخبار مدینہ کے بھائی ہر سال پرانی کتابیں لے کر آتے تھے۔ ان کے پہلے اور بڑے خریدار حضرت علامہ ہوتے تھے۔ چونچ جاتیں وہ ماوشا کوٹل جاتیں۔

کتابیں جمع کرنے کا شوق بہت لوگوں کو ہوتا ہے۔ مطالعہ کم ہی کرتے ہیں۔ آپ کو جمع آوری کے ساتھ مطالعہ کا شوق بھی اسی قدر تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کے تبحر علمی میں بڑا دخل کتب بنی کے بے پناہ جذبہ کار ہا ہے۔ افسوس آج کا نو جوان اس جذبے سے یکسر عاری ہو گیا ہے۔ بیشتر کے مطالعہ کا محور نصابی کتب بلکہ ان کے خلاصوں اور ترجموں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

اساتذہ کے لیے ایک قابل تقلید مثال

ایم اے علوم اسلامیہ میں ایک پرچہ شامل ہوا ”زبانوں کے رجحانات“۔ السنہ میں

عربی، فارسی، اردو کے علاوہ ترکی زبانیں بھی شامل تھیں۔ شعبہ کے قیام کا یہ ابتدائی دور تھا۔ اکثر لیکچرار بیرونی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ترکی زبان کے کوئی فاضل استاد میسر نہ آئے۔ تعلیمی سال ختم ہو رہا تھا، طلبہ پریشان تھے۔ استاد گرامی کو بحیثیت صدر شعبہ اپنی ذمہ داری کا احساس ان سے زیادہ تھا۔

آپ نے پرچہ کا یہ حصہ اپنے ذمے لے لیا جبکہ آپ خود ترکی زبان سے نا آشنا تھے۔ رات کو کئی گھنٹے متعلقہ کتابوں کا مطالعہ فرماتے، نوٹ تیار کرتے اور صبح لیکچر دیتے لیکن کسی شاگرد کو اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ عالمانہ درس ایک رات کا حاصل مطالعہ ہے۔

تقابل ادیان پر تبصر

حضرت علامہ کے تقابل ادیان کے تبصر پر چند جملے نہ لکھوں تو میرا خراج عقیدت یکسر ناقص اور ادھورا رہ جائے گا۔

جہاں تک اس بے مایہ کی معلومات کا تعلق ہے، حضرت علامہ برصغیر کے ان چند علماء میں سے تھے جو اس فن میں یکتا شمار کیے جاتے ہیں۔ لاہور میں اس فن کے فاضل اجل پروفیسر محمد یوسف سلیم چشتی تھے لیکن اس وقت وہ راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ حضرت علامہ اسلام کے ساتھ مسیحیت، یہودیت، زرتشت، بدھ ازم، سکھ مت اور دوسرے متعدد غیر معروف مذاہب پر خاص وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں اور ان کے علماء سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسلام کی حقانیت پر علی وجہ البصیرت گفتگو کر سکتے تھے۔ اس موقع پر اپنے دو مشاہدات کا ذکر ضرور کروں گا۔

(۱) گرمی کا زمانہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ بندہ شعبہ علوم اسلامی میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ ان کے کمرے میں لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے معروف پادری تشریف فرما تھے۔ مختلف موضوعات پر شگفتہ انداز میں گفتگو جاری تھی۔ اس دوران حضرت استاد گرامی نے فرمایا۔ پادری صاحب مجھے خوب یاد ہے زندگی کے ابتدائی ایام میں آپ نے اپنے والد محترم کی وفات کے بعد چچا تایا کی ناروازیادتیوں کے سبب مسیحیت کی آغوش میں پناہ لی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ

حالات بدل چکے ہیں۔ اللہ کریم نے آپ کو سب کچھ دیا ہے اب اپنے دین اسلام میں کیوں لوٹ کر نہیں آ جاتے۔

پادری صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ان کے ہونٹوں پر پڑی جم گئی۔
 لا جواب ہو کر اسی علیک سلیک کے بعد پادری صاحب نے رخصت ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔
 (۲) دسمبر کا آخری عشرہ تھا سنہ حافظہ میں محفوظ نہیں رہا۔ والی ایم۔ سی۔ اے میں دسمبر کے مہینہ لیکچر دینے کے لیے امریکہ سے ایک مشہور پادری تشریف لائے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے وہ قرآن کریم کی آیات ایک قاری کی طرح حوالے کے طور پر پڑھتے تھے۔

ان کے ایک لیکچر کا عنوان تھا "Light of all lights" "نور" من نور اللہ۔
 حضرت علامہ اس لیکچر کے صدر نشین تھے۔ دوسرے مسلمان اور مسیحی حاضرین کے علاوہ شعبہ علوم اسلامی کے اساتذہ محترم محمد اسلم ملک، حافظ احمد یار مرحوم اور ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی اور متعدد طلبہ شریک تھے۔ لیکچر انگریزی زبان میں تھا جو نہایت مدلل اور آیات قرآنی کے حوالوں سے مرصع تھا۔ ظاہر ہے مقرر کے متعدد افکار اسلام سے ٹکراتے تھے۔ لیکچر ختم ہوا، دعوت دی گئی "کوئی سوال"۔ حاضرین کی طرف سے کوئی سوال نہ آیا، مقرر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ استاد محترم کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی، لیکن صدر مجلس کے لیے کوئی سوال اٹھانا رسم کے خلاف تھا۔
 آپ صدارتی کلمات کے لیے کھڑے ہوئے ایک ایک کر کے ہر نکتہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ فاضل امریکی پادری کی یہ حالت ہوئی کہ تقریب کے اختتام پر صدر مجلس سے ہاتھ ملائے بغیر رخصت ہو گئے۔

حرف آخر

ایم اے علوم اسلامی کے "تقابل ادیان" کا مضمون استاد گرامی خود پڑھاتے تھے۔ اس معرکہ الآراء درس کے نوٹ کلاس کے تمام طلباء بڑے اہتمام سے تحریر کرتے تھے۔ ہر سال اپنے حاصل مطالعہ سے نکات کا اضافہ فرماتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ ہر سال کسی خوش نویس شاگرد کی کاپی لے کر محفوظ کر لیتے۔ اگر عزیز میاں نعمان صدیقی یہ کاپیاں جمع کر لیں،

عزیزہ محترمہ انہیں مدون کر کے کتابی شکل دے لیں تو اس مضمون کی بڑی خدمت ہوگی۔ اور حضرت علامہ کا یہ بہترین علمی ورثہ ہوگا۔ اگر وہ نہ کر سکیں تو کوئی دوسرے تلمیذ یا استاد یہ خدمت اپنے ذمے لے لیں۔

اسی طرح مجلہ "Light of Islam" میں طبع شدہ آپ کے مضامین اور دوسری منتشر تحریریں اگر زیور طبع سے آراستہ ہو جائیں تو بڑی خدمت ہوگی۔ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والی آپ کی تقاریر بھی کسی صاحب ذوق کی منتظر ہیں۔ خصوصاً وہ تقریر جو آخری علالت کے دوران آپ نے اپنے بستر پر ریکارڈ کرائی تھی۔



علامہ علاء الدین صدیقی

☆ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام ☆

علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم اپنے دور کے ایک ممتاز عالم دین، سیاسی مدبر اور عوام میں ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے خطیب تھے اور زبان و ادب اور الہیات میں گہرا شغف رکھتے تھے وہ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی تقاریر موثر اور ولولہ انگیز ہوتی تھیں۔ وکیل ہونے کے ناطے ان کی باتیں عموماً مدلل ہوتی تھیں ان کی گفتگو میں لطیف اور شایستہ مزاح بھی شامل ہوتا تھا۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے متعلق نہایت مخلصانہ رویہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کوششوں سے پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ علوم اسلامیہ قائم کیا اور وہ اس شعبہ کے سب سے پہلے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ پروفیسر حمید احمد خان کے بحیثیت وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی سکدوش ہونے کے بعد یونیورسٹی کے امور میں ایک بحرانی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے نیا وائس چانسلر منصب قبول کرنے سے متذذب تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک پروفیسر پشاور یونیورسٹی سے بلائے گئے لیکن انہوں نے یہاں کی کیفیت دیکھ کر منصب قبول کرنے سے معذرت طلب کی۔ چنانچہ علامہ علاء الدین صدیقی کو اس منصب کے لیے سب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ انہوں نے یونیورسٹی کے علمی اور انتظامی امور کو حسن اسلوب سے سنبھالا اور نظم و نسق قائم کرنے میں ایک اچھی مثال پیش کی۔ چونکہ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اس لیے کبھی کبھی خانہ فرہنگ ایران، لاہور میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں جہاں جسٹس ایس۔ اے رحمن، صوفی تبسم اور صوفی افضل فقیر جیسے شعرا اور یہ خادم شرکت کرتے تھے وہاں علامہ مرحوم بھی اپنے فارسی اشعار پڑھ کر سنا تے تھے۔ اس قسم کی شعری مجالس علامہ محمد اقبال کی فارسی شاعری کی عظیم روایت کا گویا ایک تسلسل تھیں۔ میرے ساتھ ان کا خاص مشفقانہ رویہ قائم رہا اور

ایک استاد کی عزت افزائی کے لیے انہوں نے میری شادی کے موقع پر اپنی طرف سے لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں ایک عظیم ضیافت کا اہتمام کیا اور مہماندار کی حیثیت سے بعض غیر ملکی سفراء کا استقبال کیا۔ ان کی یہ محبت میرے لیے ہمیشہ باعث افتخار رہی۔

پنجاب یونیورسٹی میں ان کا دور نظامت کامیاب رہا۔ وہ اساتذہ، طلبہ اور دیگر رفقاء کے کار کے ساتھ اخلاق اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ اس لیے ان کے منصب کے دوران میں یونیورسٹی کا نظم و نسق احسن طریق سے چلتا رہا۔



”علامہ علاء الدین صدیقی باغ ارم میں جا بسے“

چھپا اک اور سورج آسمان علم و دانش کا ہوئے جب دہر سے رخصت علاء الدین صدیقی
سروش خلد نے تاریخ رحلت یوں کہی ان کی بنے ہیں رہبر جنت علاء الدین صدیقی

(ممتاز دانشور، ماہر تعلیم، پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر
اور اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین علامہ علاء الدین
صدیقی نے ۷۰ سال کی عمر میں ۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء مطابق ۱۶ محرم
۱۳۹۸ھ بروز سہ شنبہ میواہ پتال لاہور میں انتقال فرمایا۔ ۲۸ دسمبر
کو آپ اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے)

﴿شیم صہبائی متصراوی، ماہنامہ قومی زبان، کراچی۔ مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۴۴﴾



علامہ علاؤ الدین صدیقیؒ

حضرت لاہوری کی عارفانہ صحبت کا ایک پروردہ ممتاز دانشور

لال دین اختر (ایم اے۔ بی۔ ٹی)

سید العارفین حضرت شیخ النفسیر مولانا احمد علی علیہ الرحمۃ کی بساط علم و عرفان کی خوشہ چینی میں تقریباً تمام عالم اسلام کا حصہ ہے۔ انجمن خدام الدین لاہور آپ کی دینی اور روحانی تخلیقات میں ایک نمایاں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے پنجاب کے ام القری (لاہور) میں انجمن موصوف کی بنیاد و تاسیس جن مقاصد کے پیش نظر رکھی آپ نے اپنی شبانہ روز مساعی جمیلہ سے ان مقدس اغراض کو بڑی حد تک پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ آپ چمنستان قرآن حکیم کے ان تھک باغبان تھے۔ آپ نے اس گلشن سرمدی کے ہر پودے کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی اور چند سالوں میں پنجاب، بنگال، سندھ، افغانستان، جاوا، سماٹرا، اسلامی ممالک بلکہ یورپ کی غیر مسلم آبادیوں میں بھی آپ کے مرکز رشد و ہدیٰ سے تربیت حاصل کرنے والے سفراء ربانی، شریعت زندہ و تابندہ کے ابدی پیغامات لے کر جا پہنچے۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی علیہ الرحمۃ جن کی وفات حسرت آیات پر ہم غم و اندوہ کے آنسو بہا رہے ہیں، فرماتے ہیں:

”مشرق وسطیٰ اور مغربی ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران میری حیرت و استعجاب اور دلی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا لاہوری علیہ الرحمۃ کے ارشد تلامذہ میں سے کوئی نہ کوئی مرد آگاہ کسی نہ کسی جگہ نہایت انہماک سے درس قرآن میں مصروف ہے۔“

اب ہم تعارفی ابتدائیہ کے بعد حضرت لاہوری علیہ الرحمۃ کی عارفانہ نگاہوں کے پروردہ علامہ علاؤ الدین صدیقی کی سیرت پر چند اشارات حوالہ قلم کرتے ہیں۔

ولادت باسعادت اور ابتدائی حالات

علامہ موصوف ۱۹۰۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج اور ایف

سی کالج لاہور میں اپنی طالب علمی کے ایام نہایت مستعدی، بیدار مغزی اور کامیابی سے گزارے۔ آپ نے ایم۔ اے ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی اور ازہر یونیورسٹی (مصر) سے اسلامیات کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ آپ کو ایم۔ او۔ ایل کی ڈگری بھی یونیورسٹی سے ملی۔ اس کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت بھی اختیار کی۔ لیکن فطری طور پر آپ کے دل میں ایک انقلاب تھا اور حریت فکر و عمل کا ایک سمندر موجیں لے رہا تھا۔ لہذا آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری میں بھرپور حصہ لیا۔

۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں آپ نے شعبہ اسلامیات کی بنیاد رکھی اور اس مقدس ادارہ کی سربراہی قبول فرمائی۔ یہ جگہ آپ کی دلی تمناؤں کے برآنے کے لیے بڑی حد تک سازگار تھی۔ آپ مسکراتے ہوئے چہروں اور نوخیز طلباء کی رنگین سبھاؤں میں اسلام کا پیغام لے کر جاتے اور شبانہ روز اسی فکر میں ڈوبے رہتے کہ رسول ہاشمی ﷺ کی امت مسلمہ کے نوجوانوں کو مغربیت سے نفور اور دور کر کے اسلام جیسے زندہ مذہب کے حقائق سے روشناس کرا کر ان کے قوائے عمل میں ایک انقلاب پیا کیا جائے۔ وہ طالب علمی کے لیل و نہار ایسے ماحول میں گزاریں کہ جہاں وہ علوم جدیدہ کی ڈگریاں حاصل کر سکیں وہاں اسلام کی مشعل کو اس ظلمت کدہ (مغربیت کا دور) میں فروزاں رکھنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں۔ آپ اپنے مقصد وحید کو ان تاریخ ساز الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے:

”میں ایک فوج تیار کر رہا ہوں، جس کا ہر مسلح سپاہی الحاد و زندقہ کی یلغار کو نادم واپس سینہ سپر ہو کر روکتا رہے گا۔“

اسلامیہ کالج کی پروفیسری کے دنوں میں اسلامیات اور درس قرآن مجید کا پیریڈ بلند بخت سعید روحوں کے لیے ایک علمی اور روحانی جاذبیت کا عکس جمیل لیے ہوئے ہوتا تھا۔ نیک فطرت غلبہ کو دلی طور پر اعتراف تھا کہ: ”علامہ موصوف اس بے نفسی، مبلغانہ انداز اور محنت پڑوہی سے اسلامی اقدار کے راز ہائے سربستہ کی تشریح و توضیح بیان فرماتے تھے کہ غبی سے غبی طالب علم پر بھی آپ کے زور خطابت کا سحر جلال اثر کر جاتا تھا۔ یہاں کے لیے ان پیریڈوں کی غیر حاضری ناممکن تھی۔ ہم نے اسلام کی برقی قوتوں کا احساس علامہ مرحوم کے

فرمودات میں پایا۔

علامہ علیہ الرحمۃ ۱۹۶۲ء میں اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ نو سال تک آپ اس منصب جلیلہ کے فرائض بطریق احسن سرانجام دیتے رہے۔ اس وقت آپ نے مختلف بین الاقوامی اجتماعات میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ آپ مؤثر عالم اسلامی کے اجلاس میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بطور وائس چانسلر فائز رہے۔

علامہ علیہ الرحمۃ کی زندگی کا سنہری باب

اوائل عمر میں آپ کی رہائش شیرانوالہ دروازہ لاہور میں تھی۔ یہ ایام و شہور آپ کی دینی تربیت کے شاہد ہیں۔ حضرت مولانا لاہوری علیہ الرحمۃ کے ساتھ آپ کو والہانہ عقیدت تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جب گریجویٹ حضرات کے لیے درس قرآن حکیم کا آغاز فرمایا تو علامہ مرحوم سید عبداللہ اور باقی خوش نصیب نوجوان آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا درس شروع ہوا تو علامہ موصوف ہمیشہ صف اول میں حاضری دیتے تھے۔ ان ملکوتی صحبتوں کا اثر تھا جس نے آپ کی زندگی میں اشاعت دین کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مسجد شاہ چراغ کی خطابت اور وہاں درس و تدریس کا انہماک واستغراق اور علاوہ ازیں باقیات الصالحات کے حصول کی صلاحیت شیرانوالہ لاہور کے مرکز ہدیٰ میں رہ کر ملی تھی۔ علامہ علیہ الرحمۃ اپنے روشن ضمیر استاد روحانی کے اعتراف کریمانہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کرتے تھے:

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں

دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

(راقم الحروف) نے اپنے استاد مکرم علامہ مرحوم کو پہلی دفعہ قیام پاکستان سے پہلے یوم تشکر (مجلس احرار اسلام نے منایا تھا) کی تقریب سعید کے موقعہ پر اسٹیج پر تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے سنا تھا اور دلی طور پر اعتراف کیا تھا کہ آپ کو علمی حلقوں میں جو علامہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ہر لحاظ سے بجا ہے۔ اس کے برسوں بعد آپ کو آئیڈیوٹوریم لاہور (نزد

عجائب گھر) میں حسن قرأت کے مقابلے کے اجلاس کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔
آپ نے آغاز تقریر میں فرمایا کہ:

”میں نے برسوں تک حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے زمزم ولایت
آثار سے آب زلال کی جرعه نوشی کی ہے اور جب کبھی مجھ کو کوئی سلام
کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سلام تو حضرت مولانا کو ہو رہا ہے۔“

۱۹۷۲ء میں میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی اسلامیات کی اجازت حاصل کی۔ آپ ان
دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میرا عنوان ”حضرت مولانا احمد علی علیہ الرحمہ کی
زندگی اور آپ کی دینی اور علمی خدمات“ تھا۔ اس عنوان میں علامہ مرحوم و مغفور کے لیے ایک
روحانی جاذبیت تھی۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا کہ مربیانہ شفقت کے انوار آپ کے
بشری پر تبسم کناں تھے۔ لہذا آپ نے اور آپ کے رفقاء مشاورت نے میرے مقالہ کی منظوری
میں نہایت ذرہ نوازی اور فیاضی سے کام لیا۔ اور اسی اجلاس میں علامہ علیہ الرحمہ میرے مقالہ
کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے۔

نامساعد حالات کی وجہ سے کچھ عرصہ میری طرف سے قفل رہا۔ بعد ازاں بتوفیق
ایزدی میں نے مقالہ لکھنے کی ابتداء کی اور فروری ۱۹۷۷ء تک اپنے مسودات کی تصحیح کے لیے
علامہ علیہ الرحمہ کی خدمت عالیہ میں حاضری کی سعادت حاصل کرتا رہا۔ آپ اکثر و بیشتر بیمار
ہی رہتے۔ افاقہ بھی ہو جاتا مگر وحسرتا! فالج کا موذی عارضہ آپ کے قویٰ میں سرایت کر چکا
تھا۔ اس کے باوجود آپ نہایت خندہ پیشانی سے میرے کام کی طرف التفات فرماتے اور مجھ کو
اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: ”اگر آپ کا مقالہ حضرت لاہوری کی سیرت کے متعلق نہ ہوتا تو میں
نگرانی کی ذمہ داری ہرگز قبول نہ کرتا۔ جب میری طبیعت ملول ہوتی ہے تو آپ کا مسودہ
پڑھنے لگتا ہوں۔ عہد گزشتہ کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ حضرت مولانا کے احسانات کا احساس
تیز تر ہو جاتا ہے۔ میں پڑھنے میں یوں مشغول ہو جاتا ہوں کہ مجھ کو اپنی نقاہت بھی اس انہماک
و استغراق سے مانع نہیں ہوتی۔“ میں نے ایسے موقع پر ایک دفعہ یہ شعر پڑھا تو سن کر اشک
بار ہو گئے اور مجھ کو دوبارہ پڑھنے کے لیے ارشاد فرمایا:

جب سامنے ساغر آتا ہے اک ہوک سی اٹھتی ہے دل میں!

ساتی کی ادا یاد آتی ہے محفل کا خیال آ جاتا ہے

اللہ اللہ! میں نے حضرت لاہوریؒ کے شیداؤں اور دیوانوں میں برسوں گزارے ہیں لیکن علامہ مرحوم کی محبت اور درافنگی کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ تقریباً ہر حاضری پر گفتگو کے دوران حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر خیر کے موقع پر بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتے۔ گھگھی بندھ جاتی اور خاموش ہو جاتے۔ میرے دل میں اس وقت یہ یقین اور بھی پختہ ہو جاتا کہ فی الواقع حضرت لاہوریؒ کا مکتب ہی اس شعر کا مصداق تھا۔

مکتب عشق کا دیکھا ہے نرالا دستور

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

نہایت فخر سے مسکرا کر فرمایا کرتے تھے کہ ”حضرت مجھ کو مولوی علاؤ الدین کہہ کر مخاطب فرماتے۔“

کبھی کبھی مجھ کو پیغام دیتے تھے کہ حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب کو میرا سلام کہنا اور دعا کروانا۔ ان کے والد صاحب کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ یہ کہہ کر پھر رونا شروع کر دیتے۔

محبت و عقیدت کی کرشمہ سازیاں دیکھئے کہ ایک ستر سالہ علوم جدید و قدیم کا تبحر عالم (سکالر)، فلسفہ الہیات کا راز داں، پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور ایک بین الاقوامی مسلمہ علمی شخصیت کا حامل جب اپنے محسن اور روحانی مربی کو یاد کرتا ہے تو اس کی قلبی کیفیت اس شیرخوار بچے سے مشابہت تامہ رکھتی ہے جو اپنی والدہ مشفقہ کی چھاتی سے جدا ہو کر چند ساعت کے بعد ہی نہایت بے تابی کے عالم میں رونے لگتا ہے۔

المختصر! علامہ علیہ الرحمۃ نے تادم واپس حضرت مولانا احمد علی نور اللہ مرقدہ سے اپنی عقیدت کے رشتے کو استوار رکھا اور علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ارشاد پر عمل پیرا ہے۔

پیش مرد کا ملے پامال شو!

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عہد حاضرہ کے نوجوانوں کو علماء ربانی سے مکمل گرویدگی اور حسن ارادت کی

نعمت سے نوازے۔

عزیزم نعمان صاحب کی حق تلفی ہوگی اگر میں اس موقع پر ان کا ذکر خیر کرنے میں بخل کروں۔ میری شہادت ہے کہ کم و بیش پانچ سال میں نے علامہ مرحوم و مغفور کے اس فرزند جلیل کو اس اعلیٰ فرزندانہ حسن خدمت اور تسلیم و انقیاد کا ایک پیکر دیکھا۔ یقیناً یہ ان خوش نصیب نوجوانوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جن کے والدین کی روحیں اپنی آخری آرامگاہوں میں بھی اپنی اولاد کی خدمت سے خوش ہیں۔ علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنی آخرت ملاقات میں مجھ کو فرمایا:

”رات کو نعمان کی چارپائی میرے قریب ہوتی ہے کہ میرا ہاتھ اس کے

چہرے تک پہنچ جاتا ہے۔“

اب میں کون ہوں کہ اپنے استاد واجب الاحترام سے اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔ جب کہ ملک بھر کے تمام علمی حلقوں میں آپ کے سینکڑوں دانشور تلامذہ اور احباب کرام آپ کی دائمی فرقت پر سوگوار نظر آتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو جنت فردوس کی بہاروں سے ہمکنار کرے۔

۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء کو پنجاب یونیورسٹی میں علامہ علیہ الرحمۃ کے ایصال ثواب کے سلسلہ میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ حاضرین نے آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی اور آپ کی روح پر فتوح کو خراج تحسین پیش کیا۔ ہم ان میں سے چند کلمات ہدیہ قارئین کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

”علامہ علیہ الرحمۃ نے طلبہ میں قرآن فہمی کا ایک ذوق پیدا کر دیا۔“

”آپ کے ہر شاگرد کا احساس ہوتا تھا کہ میں آپ کا خصوصی شاگرد ہوں۔“

”آپ کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ آپ زبان فارسی میں خطابت کی بڑی

مہارت رکھتے تھے۔“

”علامہ مرحوم نے علم و عمل کی کئی شمعیں روشن کیں۔ آپ تاریخ ساز

شخصیت کے حامل تھے۔ آپ شمع محفل تھے۔ ایک انجمن تھے۔ آپ

گلدستہ تھے۔ گویا کہ پورے گلشن کی بہاروں کا پتہ لگانا ہو تو گلدستہ کی

مہک سے اندازہ ہو سکتا ہے۔“

”آپ انجمن ہی نہ تھے بلکہ آپ ایک تحریک اور مشن تھے۔ درس نظامیہ اور کالج کی تعلیم میں آویزش تھی۔ مگر آپ نے ان دونوں میں آمیزش پیدا کر دی۔“

سب کے آخر میں علامہ مرحوم و مغفور کے دیرینہ رفیق زندگی اور حضرت لاہوری کے مکتب رشد و ہدیٰ کے تربیت یافتہ محترم المقام ڈاکٹر سید عبداللہ مدظلہ العالی کھڑے ہوئے اور فرمایا:

”علامہ مرحوم کے ساتھ میرے روابط کی کہانی بڑی طویل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علامہ مرحوم کو دو فضیلتوں سے نوازا تھا۔

۱۔ آپ نے اپنی والدہ محترمہ مرحومہ کی بے مثال خدمت سرانجام دی۔ ان پر جتنی برکتیں نازل ہوئیں محض اپنی والدہ محسنہ کی خدمت کی وجہ سے ہوئیں۔

۲۔ جہاں مصلحت سے کام نکلے وہاں آپ جنگ آزمائی سے گریز فرمایا کرتے تھے۔ جناب ڈاکٹر موصوف کی مختصر مگر جامع تقریر کے بعد شعبہ اسلامیات کے صدر جناب حافظ اللہ یار صاحب کھڑے ہوئے ان کی صدارت میں متفقہ طور پر چند تجاویز پر آئندہ عمل کرنے کا فیصلہ ہوا:

(۱) علامہ مرحوم کے نام کی تختیاں بنا کر یونیورسٹی کے مناسب مقامات پر لگائی جائیں۔

(۲) آپ کی یاد میں ایک ارمغاں جاری کیا جائے۔

(۳) آپ کے سوانح حیات مرتب کیے جائیں۔

(۴) ایم اے کے طلبہ بلکہ پی ایچ ڈی کے طلبہ کو آپ کی سیرت پر مقالہ نگاری کی اجازت

دی جائے۔

(۵) آپ کے تحریری، علمی کارناموں کو ترتیب دیا جائے۔

(۶) سمن آباد (مین روڈ) کا نام علامہ شاہراہ رکھا جائے۔

(۷) آپ کے نام کے میڈل بنائے جائیں۔

محولہ بالا دوسرا اجلاس نہایت عقیدت و احترام کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے

نماز عشاء سے پہلے اختتام پذیر ہوا۔

ضمناً اس واقعہ کو بھی شامل مضمون کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کشف قبور وہی عطیہ نہیں ہے بلکہ مجاہدات و کسبیات کا ثمرہ ہے۔
حضرت لاہوری کے ایک خادم خاص نے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر (واقع گھوڑا شاہ قبرستان) کے پاس مراقب ہو کر دیکھا تو جواب ملا: ”بھئی جان! مشکلات تو بڑی تھیں لیکن حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت سے اللہ تعالیٰ نے نجات کر دی۔ الحمد للہ تعالیٰ میں ہر طرح سے آرام میں ہوں۔“

ہم اس موقع پر قاری فیوض الرحمن صاحب (کاکول) کے خط کی ابتدائی سطور بھی نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

مکتوب گرامی از پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول

۱۔ رات خواب میں حضرت علامہ صاحب کے ساتھ بہت دیر تک رہا ہوں۔ ایک بات جو انہوں نے فرمائی وہ یہ تھی کہ ”میں اس قابل تو نہ تھا کہ میری تدفین مکہ مکرمہ میں ہوتی مگر یہ اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ مجھے وہاں جگہ ملی ہے۔“

۲۔ پھر یہ دیکھا کہ حضرت علامہ صاحب نے ایک شعر فارسی میں پڑھا۔ اس کے جواب میں دوسرا شعر دوسری بحر میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے سر سے پڑھا۔ بڑا لطف آیا وہ دونوں ان اشعار سے محفوظ ہوئے۔ افسوس ہے کہ مجھے جاگنے کے بعد وہ شعر یاد نہیں رہے۔
۳۔ پھر دیکھا کہ یونیورسٹی ہے کچھ چھوٹے چھوٹے بچے علامہ صاحب سے ملنے کے لئے آئے جن کو دروازہ پر روک دیا گیا لیکن علامہ صاحب نے فرمایا کہ انہیں آنے دو۔“

انجام کار ہم بارگاہ ایزد تعالیٰ میں دست بدعا ہیں۔ ”اے اللہ! ہمارے محترم علامہ علاؤ الدین صدیقی کی تمام دینی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرما اور ان کی روح کو اسلاف کرام کے ساتھ فردوسی نعمتوں میں شریک و سہیم بنا۔ آمین!“

حضرت علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم اور شگفتگی

☆ پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی

حضرت علامہ مرحوم کی شخصیت علمی، ادبی اور دینی حلقوں میں ممتاز ماہر تعلیم، مفکر اسلام، فاضل معلم اور قابل منتظم ہونے کے حوالے سے جانی پہچانی تھی، تعلیم متانت اور شفقت کا تقاضا کرتی ہے جب کہ تنظیمی شعبے میں رعب و دبدبہ کا پہلو غالب ہوتا ہے لیکن علامہ مرحوم دونوں شعبوں میں انتہائی شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ شخصیت کی تعمیر (Development of Personality) کے لیے چار عناصر بے حد اہم ہیں:

۱۔ تحسین حسن (Appreciation of beauty)

۲۔ شعر و سخن (Poetry)

۳۔ حکمت و کثانت (Wisdom)

۴۔ مزاح و شگفتگی (Humour)

خود علامہ مرحوم کی قابل صدر شک شخصیت سے ان چار عناصر کی عکاسی ہوتی تھی۔ وہ فطرت کے حسین مناظر کے دلدادہ تھے۔ متعدد بار اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ سوات کے تفریحی سفر کئے۔ تفریح کے عناصر خمسہ بیان کرتے ہوئے ایک اہم عنصر (Cosmos relation) ”کائنات سے ربط“ کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ موقع محل کے اعتبار سے تقریر میں اور عام گفتگو میں بڑے عمدہ اشعار بیان فرماتے ان کے متبسم چہرے اور نگاہ سے فطانت جھلکتی۔ ایک دفعہ کسی شخص کی ناکامی کا ذکر فرماتے ہوئے پنجابی میں فرمایا ”ایس شخص دی ہک وچ مت نہیں ہیگی“

☆ سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، صدر شعبہ اسلامیات بہاولپور، نیورسٹی، بہاول پور

(یہ شخص حکمت سے عاری ہے) باتوں ہی باتوں میں کوئی ایسا لطیف نکتہ بیان فرماتے کہ محفل و مجلس کشت زعفران بن جاتی۔ ایک دفعہ وزیر تعلیم نے آنا تھا عصر کا وقت تھا چمن میں میزوں پر انواع و اقسام کی مرغوب اشیائے خورد و نوش منتظرین کو بڑی پرکشش لگ رہی تھیں۔ وزیر تعلیم کو کچھ تاخیر ہو گئی۔ مغرب کی اذان کانوں میں رس گھولنے لگی وزیر تعلیم نے سیدھا مسجد کا رخ کیا نماز ادا کرنے کے بعد تقریب ضیافت اپنے اختتام کو پہنچی۔ شعبے میں واپسی پر میں نے علامہ مرحوم کی خدمت میں عرض کیا کہ وزیر تعلیم کی دائیں جانب ایک ایسی شخصیت کو میں نے دیکھا جس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ نماز جمعہ بھی کم ہی ادا کرتا ہے تو کیا بے وضو نماز ہو گئی؟ علامہ مرحوم نے پوری متانت سے فرمایا کہ ہاں اس کی نماز ہو گئی۔ میرے تعجب کے بے ساختہ اظہار پر علامہ مرحوم مسکرائے اور فرمانے لگے جو نماز اللہ کے لیے پڑھی جائے اس کے لیے وضو ضروری ہوتا ہے وزیر کی مصاحبت کے لیے نماز ادا کرنے کے لیے وضو ضروری نہیں ہوتا۔

علامہ مرحوم کے سامنے فائلوں کا انبار دیکھ کر ایک بے تکلف دوست نے پوچھا: ”علامہ صاحب! اتنی مصروف زندگی میں اخبار کس وقت پڑھتے ہیں؟“ مسکرا کر فرمانے لگے: ”جن سرخیوں پر زیادہ سرنخی لگی ہوتی ہے وہ صبح صبح دیکھ لیتا ہوں بقیہ اخبارات کو جملہ امور سے فارغ ہو کر پڑھتا ہوں۔“

ایک دفعہ علامہ مرحوم کو کسی دعوت میں جانا تھا۔ اگر دعوت عام ہوتی تو شعبہ کے اساتذہ کو اپنی کار میں ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ مذکور بالا دعوت ایک برطانوی پروفیسر کے اعزاز میں تھی۔ راقم الحروف کو بھی شرف رفاقت حاصل تھا۔ برطانوی پروفیسر کا تعارف علامہ مرحوم سے کروایا گیا۔ کھانے کے دوران اس نے علامہ مرحوم سے کہا کہ آپ کے ریلجن میں شادی کی زنجیریں انسان کی آزادی کو سلب کر لیتی ہیں۔ علامہ صاحب نے مسکراتے ہوئے (انگریزی میں) جواب دیا: کہ ہمارے ہاں انسان اور جانور میں یہی فرق ہے انسان شادی کی ذمہ داریوں کو قبول کرتے اور نبھاتے ہیں جب کہ جانور شادی کی زنجیروں سے آزاد ہوتے ہیں۔ (برطانوی پروفیسر کا چہرہ دیدنی تھا)

ایک بار علمی تقریب میں ایک شاگرد نے تقریر کرتے ہوئے علامہ مرحوم سے اپنی

سعادت و وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”ہم نے علامہ صاحب کے جوتے اٹھائے ہیں۔“
 اختتامی خطاب میں علامہ مرحوم نے ان کے جذبات سعادت کی تصدیق فرماتے ہوئے کہا:
 ”مجھے بھی یاد ہے کہ انہوں نے میرے جوتے اٹھائے تھے البتہ یہ یاد نہیں رہا کہ واپس کیے تھے
 یا نہیں۔“

یہاں اس امر کا ذکر بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم فکاحات کو بیان
 فرماتے ہوئے دو باتوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے:

۱۔ مخاطب میں حس مزاح ہے اور وہ واقعی نکتہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے
 بہرہ ور ہے۔

۲۔ فکاحات کا مقصد تعمیری ہوتا یعنی سننے والوں کے لیے اس میں کوئی نصیحت، تلقین
 اور علمی وادبی نکتہ ہوتا۔

ایک دفعہ کسی نے علامہ صاحب سے ایک شخص کی منگنی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ
 لڑکے سے لڑکی بہت زیادہ پڑھی لکھی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے تو علامہ مرحوم نے فرمایا: ایک دولت
 مند ایم ایم۔ ایف (میٹرک فیل) لڑکے کی ایم اے اردو پاس لڑکی سے شادی ہوگئی۔ بیوی نے
 موقع کی مناسبت سے کوئی شعر پڑھا۔ میاں کو سمجھ نہ آئی لیکن خفیف سی ہنسی کے ساتھ داد پیش کر
 دی۔ دو تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار بیوی نے شعر پڑھا اور داد طلب نگاہ سے شوہر کی طرف
 دیکھتے ہوئے استفسار کیا: ”آپ سمجھ گئے ہیں؟“ شوہر نے آج پورے جوش سے کہا: ”خوب
 سمجھ گیا ہوں“ بیوی نے سراپا شوق ہو کر پوچھا ”بھلا بتاؤ آپ کیا سمجھے ہیں“ شوہر نے جواباً کہا:
 ”مجھے سمجھ آگئی ہے کہ تیرا میرا گزارہ نہیں ہو سکتا“ (گویا دور حاضر میں کفایت میں تعلیم کو بھی
 ملحوظ رکھنا چاہیے)

ایک بار کسی لڑکے کو لمبے لمبے بال، خاص انداز میں سر پر سجائے دیکھا تو رفقاء کو
 مخاطب فرماتے ہوئے کہا: ”کسی کو بس میں سوار ہوتے دیکھ کر ایک شخص نے پکارا راشد کہاں جا
 رہے ہو، سوار ہونے والی شخصیت نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو وہی شخص کہنے لگا ”معاف کیجئے گا میں
 راشد سمجھا آپ تو راشد ہیں“ (گویا دور حاضر میں مرد شبہ بالنساء اور عورتیں شبہ بالرجال کے

فتنہ میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں)

علامہ مرحوم کے فکاحات میں ان کا عمیق مشاہدہ اور تجربہ شامل ہوتا تھا۔ علامہ مرحوم سننے والوں کو اپنے منفرد اور دلنشین انداز میں اس تجربے سے بہرہ ور فرماتے۔

ایک بار راقم الحروف نے استفسار کیا: ”علامہ صاحب! لفظ قرض مذکر ہے لیکن لوگ اکثر قرض حسنہ کہتے ہیں یہ کیوں؟“ مسکرا کر (پنجابی زبان میں) فرمانے لگے: ”جنوں قرض دتا جدوں واپس لین جائیے تے اوہ ہنسنا شروع کر دیوے تے اوہنوں قرض ہنسہ کہن لگ پئے“ (گویا لوگ اب قرض حسن کو ذمہ داری سے ادا نہیں کرتے)

ایک دفعہ راقم الحروف نے استفسار کیا ”علامہ صاحب! عذر گناہ بدتر از گناہ“ سے کیا مراد ہے؟ مسکرائے اور دو واقعات سنائے ان میں سے ایک ہدیہ قارئین ہے: فرمایا: ”ایک افسر دفتر سے واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا نوکر اس افسر کی کنگھی سے اس کے کتے کے بال سنوار رہا ہے۔ افسر نے غضبناک ہو کر نوکر سے کہا کہ میری کنگھی کتے کے لیے استعمال کر رہے ہو؟“ نوکر نے سراپا ادب ہو کر جواب دیا ”سر میں نے کنگھی کو دھولیا تھا۔“

علامہ مرحوم کی گفتگو اور شگفتہ مزاجی اس قدر دلچسپ اور جاذب ہوتی کہ سامعین میں کوئی اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ مجلس طویل ہو جاتی علامہ مرحوم بھانپ لیتے تو اٹھتے اٹھتے طوالت پر ایک لطیفہ ہو جاتا اور سامعین کی طوالت مجلس کی بنا پر تھکان دور ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل عیم سے علامہ مرحوم پر کروٹ کروٹ رحمت برسائے۔ آمین



علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم۔ بحیثیت معلم

پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی

اسلام میں علم کی اہمیت محتاج تعارف نہیں وہ دین حق جس میں:

☆ خدائے بزرگ و برتر، رحمن و رحیم، رب کائنات خود معلم ہو۔

☆ انسانیت کے سب سے بڑے محسن، سرور دو عالم محمد عربی ﷺ معلم ہوں۔

☆ صحیفہ فطرت، آخری ہدایت ربانی، قرآن حکیم کتاب علم ہو۔

☆ قرآن حکیم کے نزول کا آغاز آیات علم سے ہوا ہو۔

☆ قرآن حکیم کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے ان کی فضیلت علمی کی

بنا پر سجدہ تعظیسی کیا ہو۔

☆ قیامت تک آنے والی نسل انسانی میں علمائے ربانین کی تعریف و توصیف

”إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ“ کے ارشاد باری سے کی گئی ہو۔

ظاہر ہے کہ اس دین حق سے بڑھ کر دین علم و بصیرت کہلانے کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے!!!

علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم بفضلہ تعالیٰ انتہائی ذہین و فطین، صاحب بصیرت اور

مدبر شخصیت کے حامل تھے، حیات انسانی کے جس مؤقر شعبے سے بھی وابستہ ہو جاتے تو اس میں

کامیابی و کامرانی حاصل ہو سکتی تھی لیکن انہوں نے بجا طور پر معلم ہونے کو ترجیح دیتے ہوئے

دینی علوم سے وابستگی اختیار کی اور اپنی عمر کے آخری لمحے تک صداقت اسلام، عظمت اسلام اور

فوقیت اسلام کے داعی بن کر دینی علوم کے فروغ میں کوشاں رہے۔

علامہ مرحوم ہمہ پہلو شخصیت کے حامل تھے لہذا علم و تعلیم، معلم و متعلم، علم کے

مدارج، علوم کی اقسام، علم نافع، علم کا مقصد، اسلام کا نظام تعلیم و تربیت، معلم کے اوصاف، معلم

کا کردار، نفسیات تعلیم، طریق تعلیم، با مقصد نصاب سازی۔ ان جملہ موضوعات کے حوالے سے

ان کی بصیرت اور علمی خدمات پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن اعضاء مضمحل ہونے کی وجہ سے راقم الحروف اس کا متحمل نہیں ہو سکتا لہذا چند مشاہدات و تاثرات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔
علامہ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم و تدریس کا فریضہ ایک مشن ہے لہذا اسے خلوص، لگن اور جذبے سے انجام دینا چاہیے۔ اب بھی آپ کے تلامذہ میں کتنے ہی افراد ان کے اس جملے کو بھولے نہیں ہوں گے کہ:

"Mission and not Commission"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ تنخواہ تو دراصل گزارہ الاؤنس ہے یہ لفظ ”تن خواہ“ ہے۔
(To fulfil the physical necessities only) جس سے مقصود یہ ہے کہ معلم فکر معاش سے آزاد ہو کر مشنری جذبے سے تدریس کا فریضہ ادا کر سکے۔

۱۹۶۳ء کی بات ہے ایک روز راقم الحروف کسی کام کے لیے آپ کے دفتر میں گیا آپ کلاس میں جانے کے لیے تفسیر کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا علامہ صاحب! آپ نے تو برسوں پڑھایا ہے اب بھی مطالعہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، آپ عینک اتار کر میز پر رکھتے ہوئے مسکرائے اور فرمایا تدریس ایک امانت ہے جس موضوع پر گفتگو کرنی ہو اس کا خوب مطالعہ کر کے کلاس میں قدم رکھنا چاہیے۔ علامہ مرحوم محنت و کاوش کے ساتھ ساتھ انتہائی شفقت سے کام لیتے ہوئے تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کا اولین مقصد یہ ہوتا کہ وہ موضوع سے متعلق ضروری باتیں طلبہ کو ذہن نشین کرادیں، محض الفاظ کی شوکت سے مرعوب کرنا علامہ مرحوم کو پسند نہ تھا البتہ وہ ایسے شستہ الفاظ کا انتخاب ضرور کرتے جس سے طلبہ کے لیے مضمون کا فہم آسان ہو جائے۔

ایک دفعہ ہندو دھرم پر لیکچر دیتے ہوئے آپ نے فرمایا ہندوؤں کے چار گاف

(گ) ہیں:

گائتری منتر		بپ کے لیے
گیتا		تلاوت کے لیے
گنگا		اشنان کے لیے

اور گنو

پوجا کے لیے

سلسلہ کلام کو بڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ سکھوں کے پانچ کاف (ک) ہیں۔ کیس، کنگھا، کڑا، کچھ، کرپان۔ ایک طالب علم کھڑا ہوا اور استفسار کیا کہ آیا اسلامی شعائر کی بھرپور عکاسی کے لیے بھی کوئی لفظ موجود ہے؟ مسکرا کر فرمایا: ”ہاں چھخ“۔ خوف خدا، خوش خلقی اور خدمت خلق۔ ان چھخ میں خوئے مسلم بڑی خوشگوااری سے جھلکتی ہے۔

بظاہر تو یہ الفاظ کا انتخاب تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں خوف خدا، خوش خلقی اور خدمت خلق کا حسین امتزاج ایک صالح مسلمان کے کردار کی عظمتوں کو اجاگر کر رہا ہے۔

علامہ مرحوم کا طریق تدریس رعب پر نہیں شفقت پر مبنی تھا۔ ایک دفعہ راقم الحروف نے کسی کتاب کے حوالے سے حجم کا لفظ استعمال کیا فرمانے لگے ذرا ڈکشنری لانا۔ میں نے ڈکشنری نکالی تو لفظ حجم تھا۔ میں نے غلطی کی تصحیح پر اظہار تشکر کیا تو فرمانے لگے علم کے تین مراحل ہیں:۔۔۔ ضبط، ربط اور ضبط۔ صحیح علم وہ ہے جو تحقیق کے بعد ذہن میں منضبط ہو۔ پھر اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ وہ بستر علالت پر تھے۔ نصف شب گزر چکی تھی اچانک ذہن میں یہ خیال آیا کہ صحیح لفظ صفت ہے یا صفت (یعنی ف پر جزم ہے یا زبر) قدرے مشکل سے اٹھے۔ بلب روشن کیا۔ ڈکشنری نکالی اور صحیح تلفظ ”صفت“ کو منضبط کر لیا۔ گھر والوں کو تشویش ہوئی دوڑ کر آئے پوچھا خیریت تو ہے؟ انہیں تشفی دی کہ سب طرح خیریت ہے فقط ایک لفظ کی تحقیق مطلوب تھی۔

علامہ مرحوم غور و فکر سے الفاظ خود Coin کرتے یا ان کا ایسا انتخاب فرماتے جو طلبہ کے ذہنوں میں آسانی سے ”ذہن نشین“ ہو جاتا۔ سورہ نساء کی پہلی آیت کی تشریح میں چار وحدتوں کا ذکر فرمایا:

۱۔ وحدت تخلیق Unity of Creation

۲۔ وحدت نوع انسانی Unity of Mankind

۳۔ وحدت مقصد Unity of Purpose

۴۔ وحدت ہدایت Unity of Guidance

ان عناصر اربعہ کا باہمی ارتباط اس خوبی اور عمدگی سے فاضلانہ اور محققانہ انداز میں بیان فرمایا کہ ایمان تازہ ہو گیا۔ چالیس برس پہلے سنا ہوا یہ لیکچر آج بھی کانوں میں رس گھولتا نظر آتا ہے۔

علامہ مرحوم کا طریق تربیت بھی شفقت و خلوص پر مبنی تھا۔ ان کی آرزو ہوتی کہ ان کے تلامذہ جہاں علم کے کمال پر پہنچیں وہاں دنیوی سعادتوں سے بہرہ ور اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں۔ چنانچہ فرمایا کرتے Ph.D کرو ایک کتاب (مقالہ) لکھنے کے لیے ایک ہزار کتاب کے مطالعہ کا موقع ملے گا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ بالخصوص اور کالج کے اساتذہ بالعموم اتنا وسیع مطالعہ رکھنے والے ہونے چاہئیں کہ لوگ اپنی علمی مشکلات میں ان کی طرف رجوع کریں۔ کالجوں میں معلمین علوم اسلامیہ کو وسعت مطالعہ سے رہبر و رہنما ہونا چاہیے۔ کم ہمتی، مطالعہ سے بے رغبتی اور دیگر غلط قسم کی مصروفیات کی وجہ سے ”نگو“ نہیں بننا چاہیے۔ آپ ہمیشہ اپنے تلامذہ کو تلقین فرماتے کہ معلم کو عبوسا قسط پر انہیں ہونا چاہیے بلکہ خوش مزاج اور خوش اخلاق ہونا چاہیے۔ بعض تلامذہ کو لباس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ شیروانی پہنو۔ شیرجیسی روانی آجائے گی۔ ایک دفعہ میری موجودگی میں ایک استاد کو جس کے بال ”زلف پریشاں“ کا نمونہ پیش کر رہے تھے کنگھی عطا فرمائی اور مسکرا کر فرمایا کہ آئینے کے سامنے جا کر انہیں Set کر لو اور مجھے فوری حضور ﷺ کا بالوں کو آراستہ رکھنے کا ارشاد ذہن میں تازہ ہو گیا۔

علامہ مرحوم کا مقصد علم کے قائل تھے۔ ان کی دو نصیحتیں ابھی تک کانوں میں گونج

رہی ہیں:

اولاً: معلمین علوم اسلامیہ میں قابلیت کے ساتھ ساتھ شرافت اور سعادت ہونی چاہیے۔

ثانیاً: انہیں محض معلومات کا ایسا صندوق نہیں ہونا چاہیے جس کی چابیاں

بلکہ علم سے آراستہ ہو کر اسے دوسروں تک پہنچانا چاہیے اور ملک و ملت کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔ علامہ مرحوم نے اپنے دلنشین اور منفرد انداز میں اس بات کو ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے تین الفاظ بیان فرمائے:

MOBILITY-۳

NOBILITY-۲

ABILITY-۱

(۱) کہ طلبہ اپنے مضمون میں دسترس، قابلیت اور صلاحیت پیدا کر کے کامل مہارت

(Ability) سے بہرہ ور ہوں۔

(ب) بامقصد تعلیم و تربیت کے حصول سے اخلاص کے جذبے سے سرشار ہو کر عظمت

کردار (Nobility) پیدا کریں۔

(ج) ملک و ملت کی خدمت کے لیے نہ صرف خود متحرک اور فعال ہوں بلکہ دوسروں کو

مستعد اور سرگرم بنانے کے لیے (Mobility) پیدا کریں۔

گویا وہ اپنے تلامذہ میں تینوں اہم عناصر کا حسین امتزاج دیکھنے کے آرزو مند رہتے۔

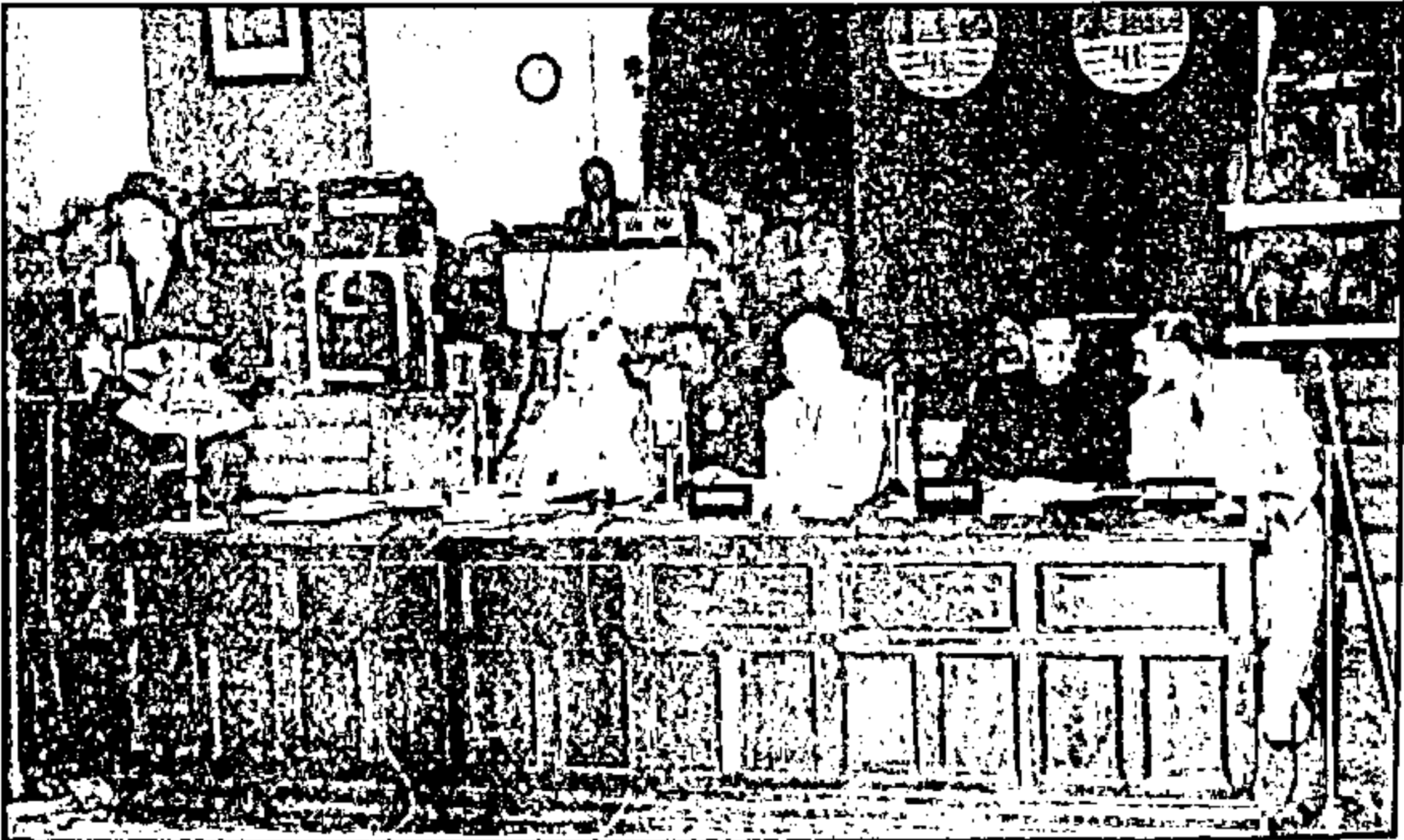
اسی طرح جیسے کہ ان کی اپنی شخصیت میں یہ تینوں عناصر ان کے پر عزم چہرے سے انتہائی حسن و خوبی سے جھلکتے تھے۔ وہ اپنے تلامذہ کو ہمیشہ ”لولہ تازہ“ دیتے رہتے اور حکیم الامت کا یہ شعر اکثر ان کی زبان پر ہوتا:

تا نہ خیزد بانگِ حق ز عالمے
گر مسلمانی نیا سانی دے





بین الاقوامی سیمینار ملائیشیا میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے۔



اسلامی کانفرنس (انڈونیشیا) میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے۔

علامہ علاء الدین صدیقی - ایک صاحب طرز خطیب

ڈاکٹر خالد علوی

علامہ علاء الدین صدیقی ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے اپنی خداداد ذہانت اور محنت سے کئی گوشوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ ایک اچھے استاد، بہترین منتظم اور حالات کا گہرا ادراک رکھنے والے انسان تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کا نہایت نمایاں پہلو ان کی خطابت تھی۔ ان کا تعلق برصغیر پاک و ہند کی اس نسل سے تھا جنہوں نے انگریز کی غلامی اور ہندو کے تعصب میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے مشکلات کا دور تھا۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ ہندوؤں کو مستحکم کیا اور وہ ان کے انتظامی ڈھانچے کا اہم حصہ تھے۔ تعلیم، سرکاری ملازمتیں اور تجارت سب میں ہندو اور سکھ مسلمانوں سے کئی گنا آگے تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان زمیندار اور جاگیردار تھے وہاں بھی عام مسلمانوں کی حالت خراب تھی جاگیردار اپنے علاقے میں سکول قائم نہیں ہوتے دیتے تھے۔ ان کے اپنے بچے اپنی سن اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے اور عام مسلمانوں کے بچوں کو سکولوں تک بھی رسائی مشکل ہوتی۔ شہری آبادیوں میں البتہ حالات بہتر تھے وہاں تعلیم کے مواقع تھے۔ مجموعی حالات خراب تھے۔

ان حالات میں متوسط اور نچلے متوسط طبقوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی راستے مسدود تھے اس لیے غیر سرکاری اور پرائیویٹ طریقوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے راستے نکالے گئے۔ ایک راستہ مشرقی زبانوں کے امتحانات کا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے امتحانات کے بعد صرف انگریزی مضمون میں ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد ایم اے یا ایل ایل بی کیا جاسکتا تھا۔ اس دور میں کئی لوگوں نے یہ راستہ اختیار کیا اور اعلیٰ تعلیم تک پہنچے۔ علامہ صاحب خوش قسمت تھے کہ انہوں نے

ایف سی کالج اور لا کالج سے ایل ایل بی کیا اور فارسی میں ایم اے کیا۔ ان کے خاندان میں ایسے لوگ تھے جو نشی فاضل کی تیاری کے لیے شام کی کلاسیں لیتے۔ علامہ صاحب نے پنجاب سول سیکرٹریٹ میں ملازمت کی اور ڈسٹرکٹ پنچایت افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کے دینی ذوق نے انہیں مولانا احمد علی لاہوری کے حلقہ درس سے وابستہ کیا اور ان کے سیاسی شعور نے انہیں مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کے قریب کیا۔ دین و سیاست کا یہ امتزاج ان کے مزاج کا خاصہ رہا۔ وہ زندگی بھر دین و سیاست کے مسائل سے متعلق رہے۔

برصغیر پاک و ہند میں دو تحریکوں نے مسلمانوں کے متوسط اور نچلے متوسط طبقوں کو جذب کیا ایک خاکسار تحریک اور دوسرے مجلس احرار۔ کانگریس بنیادی طور پر ہندو جماعت تھی اور بعض مسلمان محض اپنی سادگی کی وجہ سے اس میں گئے اور مسلم لیگ مراعات یافتہ طبقہ کی جماعت تھی۔ عوامی جماعت ہونے کا شرف اسے بہت بعد میں حاصل ہوا۔ مجلس احرار بلاشبہ ایک عوامی جماعت تھی اور اس کے خطباء اپنی مثال آپ تھے۔ مولانا گل شیر اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں نے سامراج دشمن جذبات کی آبیاری کی تھی اور مسلمان قوم ایک مضطرب اور پر امید قوم کی حیثیت سے انقلاب کے راستے پر دستک دے رہی تھی۔ احراری خطباء نے اسلامی تشخص کی شمع دلوں میں روشن کر رکھی تھی۔ متوسط طبقے کے لوگوں سے لے کر عوام تک سب آزادی کی آرزو سے آراستہ تھے۔ لیکن جس شخص نے متوسط طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لوگوں میں جذبہ جہاد کی روح پھونک دی تھی وہ علامہ مشرقی کی سحر طراز شخصیت تھی۔ کیمبرج کا اعلیٰ تعلیم یافتہ سادہ لباس میں ملبوس عسکری نظم کا نمونہ قرون اولیٰ کی عظمتوں کا نقیب اور مسلمانوں کو عملی زندگی اپنانے کا درس دینے والا یہ شخص کئی بڑی شخصیتوں کو اس تحریک کے جلو میں لینے میں کامیاب ہوا۔ دین و سیاست کے امتزاج کے حامل علامہ علاؤ الدین صدیقی نے بھی تحریک خاکسار کی کشش محسوس کی۔ وہ کچھ دیر اس کے ساتھ رہے لیکن پھر انہوں نے دوسری راہ اختیار کی۔ علامہ مرحوم نے ان جذباتی اور ہنگامی تحریکوں سے اثر پذیری کی۔ ان کے خیالات میں پختگی آئی۔ مسلم تشخص کا تصور زیادہ واضح ہوا اور اظہار و بیان میں سلیقہ مندی پیدا ہوئی۔ اب وہ دینی و سیاسی موضوعات پر تقریریں کرتے اور سامعین کو متاثر کرتے۔ غالباً یہ دور ان کی

خطابت کے نشو و ارتقا کا دور ہے۔ احرار کی شعلہ بیانی اور خاکسار کی ترتیب و استدلال علامہ مرحوم کی خطابت کا حصہ بن رہے تھے۔ علامہ مشرقی کی تحریر میں ایک شکوہ ہے وہ ہمیشہ لکھی ہوئی تقریر کرتے اسی میں زور بیان، محکم استدلال، بے لاگ تجزیہ اور الفاظ کا شکوہ ہوتا۔ مسلمانوں کی زندگی کا یہ ہنگامہ پروردور تھا۔ اس دور نے بے مثال خطیب پیدا کیے۔ مسلمان جلسے منعقد کرتے، جلوس نکالتے، خطباء ان جلسوں میں دلوں کو گرماتے، روحوں کو بالیدگی دیتے اور دماغوں کو آشفستگی عطا کرتے۔ زبان و بیان کی سحر طرازیوں کو مخمور رکھتیں۔ اس منفرد دور نے علامہ علاؤ الدین صدیقی کی تربیت کی، ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور انہیں ایک دینی و سیاسی کارکن اور رہنما بنایا۔

سامراج دشمنی اور آزادی کی محبت نے برصغیر کی آبادی کو شعلہ جوالہ بنا رکھا تھا۔ جوں جوں آزادی کی آرزو بڑھ رہی تھی توں توں مسلمانوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آزادی کی شمع کو روشن رکھنے میں سب سے زیادہ قربانیاں مسلمانوں نے دیں ان سے اقتدار چھنا تھا، ان کی قیادت ختم ہوئی تھی، ان کے ادارے تباہ ہوئے تھے اور سب سے زیادہ ان کے دین و اخلاق کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ہندو اپنی اکثریت اور انگریز کی سرپرستی کی وجہ سے زیادہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے مسلمان اب اپنے الگ تشخص کا تحفظ چاہتے تھے۔ بد قسمتی سے اس تشخص کی حفاظت کے لیے طریق کار پر اختلاف ہو گیا۔ کانگریسی مسلمان تو ہندوؤں کی بولی بول رہے تھے۔ تحریک خاکسار اور مجلس احرار نے حالات کا صحیح ادراک نہ کیا۔ ان حالات میں قدرت نے محمد علی جناح کو مسلمانوں کی قیادت کے لیے توفیق بخشی۔ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن رہی تھی اور پاکستان کا تصور مسلمانوں کے دماغوں کو روشن اور دلوں کو مطمئن کر رہا تھا۔ علامہ مرحوم کی دینی و سیاسی بصیرت نے محسوس کیا کہ تحریک پاکستان ہی مسلمانوں کے مسائل کا حل ہے اور وہ شرح صدر کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پنجاب کے جن خطباء نے تحریک پاکستان کے لیے مؤثر کام کیا ان میں سرفہرست علامہ علاؤ الدین صدیقی تھے۔ وہ نرے مسٹر نہ تھے اور نہ ہی خالص مولوی۔ ایک روشن خیال اور معتدل مزاج دینی و سیاسی رہنما تھے۔ اس لیے ان کی تقریریں بے حد مقبول ہوتیں وہ دین و سیاست کے حوالے سے نظریہ

پاکستان اور مسلمانوں کے مسائل پر جاندار بحیثیت شریعت اور مدلل تقریریں کرتے۔ یہ دوران کی سیاسی خطابت کا سنہری دور تھا۔ وہ پڑھے لکھے طبقے میں بہت مقبول مقرر تھے۔ میں نے ان کے ہم عصروں سے ان کی خطابت کی تاثیر کی تعریفیں سنی ہیں۔ اس دور کے مسلم لیگی کارکن انہیں عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ اگر مسلم لیگ پر جاگیرداروں کا قبضہ نہ ہوتا تو علامہ علاؤ الدین صدیقی ضرور وزیر یا سفیر ہوتے۔ سیاسی جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ ان میں متوسط طبقے کے کارکن کو آگے آنے ہی نہیں دیا جاتا۔ یہی کچھ علامہ مرحوم کے ساتھ ہوا وہ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت کے انتخاب میں ممتاز دولتانہ سے ہار گئے کیونکہ وہ جاگیردار نہ تھے۔ پاکستان کی اسلامی اساس اور مسلمانوں کا عالمی کرداران کے پسندیدہ موضوعات تھے۔

مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان میں اسلامی انجمنیں قائم کر رکھی تھیں۔ یہ انجمنیں مسلمانوں کے حقوق کے علاوہ اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کے لیے شاندار کام کرتی تھیں۔ ان انجمنوں کے سالانہ جلسے ہوتے جن میں مشہور خطباء اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے اور حاضرین کے دلوں کو گرماتے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے اور سارا سال کسی نہ کسی حوالے سے خطابات کا سلسلہ جاری رہتا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کافی عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دینی مدارس کے سالانہ جلسے اور فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کی تقریبات اسی پر مستزاد تھیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور اور فیض الاسلام راولپنڈی کے سالانہ جلسوں کا میں عینی شاہد ہوں۔ علامہ صاحب ان جلسوں کی زینت تھے۔

علامہ مرحوم کا انداز خطابت

علامہ مرحوم کی خطابت کے آہنگ میں نواب بہادر یار جنگ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ مشرقی اور مولانا ظفر علی خان کی خطابتوں کی تاثیر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ ایک جذباتی مقرر تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور اظہار کے اسلوب میں وہ انفرادیت کے حامل تھے۔ شستہ زبان اور مدلل و مرتب گفتگو ان کی خصوصیت تھی۔ چونکہ وہ ایک جدید تعلیم یافتہ انسان تھے اسی لیے ان کی خطابت حشو و زوائد سے مبرا اور جدید معلومات کا مرقع ہوتی۔ ان کی اکثر

تقریریں موضوعاتی تھیں اور غیر ضروری مواد سے پاک۔ سیرت ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ لاہور اور بیرون لاہور سیرت کے کئی جلسوں میں مجھے ان کے ساتھ تقریر کرنے کا موقع ملا ہے۔ بلاشبہ ان کی تقریر میں عمدہ مواد اور بہترین ترتیب کے علاوہ حب رسول اور اتباع نبوی کے جذبات کو مستحکم کرنے کا بڑا سامان ہوتا۔ یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کی وجہ سے انہیں علمی حلقوں اور اعلیٰ سرکاری دائروں تک رسائی تھی۔ وہ ان حلقوں کے مقبول اور مؤثر خطیب تھے اور اپنی تاثیر کے لحاظ سے منفرد۔ قرآن و حدیث اور تاریخ اسلامی کے واقعات کے علاوہ وہ اپنی تقریر کی ادبی چاشنی کو برقرار رکھتے۔ وہ اردو اور فارسی ادب کے طالب علم تھے۔ لہذا اپنی تقریر کو فارسی اور اردو کے اشعار سے مزین کرتے۔ جب بھی وہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور پراگندی پر اظہار کرتے تو اکثر یہ شعر پڑھتے:

ہم یہ پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑ جائے وہ کیا کرتے ہیں
ایک اور شعر جو میں نے ان کی کئی تقریروں میں سنا وہ درج ذیل ہے:
غنی روز سیاہ ہیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند کاخ زلیخا را

اتحاد بین المسلمین

اتحاد بین المسلمین ان کی خطابت کا پسندیدہ موضوع تھا۔ تحریک پاکستان اتحاد اسلامی کا شاندار اور کامیاب مظاہرہ تھا۔ اس تحریک میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ سب شامل تھے۔ بعض مذہبی جماعتوں کی نفرت انگیز مہم کے باوجود تحریک پاکستان کی قیادت اور اس کے کارکن اتحاد کی فضا کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نصب العین بلند تھا اور اس کے حصول کے لیے وحدت و یگانگت کی ضرورت تھی۔ پھر دشمن طاقتور تھا۔ اس لیے منزل کے چھن جانے اور حصول مقصد سے محرومی کا بھی اندیشہ تھا۔ وقت کی نزاکت اور حالات کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے بلند نصب العین رہے اور چھوٹے چھوٹے مفادات سدراہ نہ بنیں۔ علامہ مرحوم نے تحریک پاکستان کے دوران اسی حوالے سے

تقریریں کی تھیں اس طرح اتحاد بین المسلمین ان کے ذہن فریم ورک میں پیوست ہو گیا تھا۔ بد قسمتی سے پاکستان بننے کے بعد مختلف مذہبی گروہوں نے سیاسی غلبہ حاصل کرنے اور ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے فرقہ وارانہ تشخص کو پروان چڑھانا شروع کیا۔ ملت اسلامیہ کی جگہ ملت جعفریہ کی اصطلاح عام ہوئی، بریلوی سواد اعظم کا دعویٰ لے کر میدان میں آئے، دیوبندیوں نے اپنے تشخص کا جھنڈا بلند کیا اور اہل حدیثوں نے اصلی اسلام کا نعرہ لگایا۔ نتیجہ فسادات کی صورت میں نکلا۔ شیعہ سنی فساد شروع ہوئے۔ دیوبندی بریلوی مناظرے سجنے لگے۔ ملی وحدت پارہ پارہ ہوئی اور پاکستانی قومیت کا تصور دھندلا ہونے لگا۔ اس سارے ہنگامے کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ حکمران طبقہ سیکولر تھا اور کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر سرگرم عمل تھے۔ انہیں موقع مل رہا تھا کہ اسلامی تشخص کے تصور کو پاکستان کی عملی و فکری زندگی سے نکال دیا جائے۔ ان حالات میں جہاں تحریک اسلامی کی قیادت اور اس کا لٹریچر اپنے انداز سے کام کر رہا تھا وہاں ایک مؤثر آواز کی ضرورت تھی جو مذہبی نفرتوں کا توڑ کر سکے اور وحدت اسلامی کے جذبوں کو پروان چڑھائے۔ میں اس دور کا عینی شاہد ہوں بلکہ اس جدوجہد کا عملی حصہ ہوں۔ میری یہ رائے ہے کہ علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم کی آواز وہ واحد معتبر آواز تھی جو اتحاد کی آرزو کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ علامہ مرحوم کے سب فرقوں سے دوستانہ تعلقات تھے وہ ان کی کانفرنسوں میں جاتے اور ان کے جلسوں میں شریک ہوتے لیکن وہ ان کی فرقہ پرستانہ آرزوؤں کا کبھی ساتھ نہ دیتے۔ ہمیشہ اتحاد کی بات کرتے ہمیشہ غلبہ اسلام کا ذکر کرتے۔ میری علامہ مرحوم سے پہلی ملاقات شہادت حسین کے ایک جلسے میں ہوئی۔ شہادت حسین شیعوں اور سنیوں کا مشترک موضوع ہے لیکن دونوں کے انداز مختلف۔ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی چند سالوں میں لاہور کا ماحول بہت گرم تھا۔ یہاں نواب مظفر علی قزلباش اور مظفر علی شمس مرحوم کے دھڑوں میں اختلاف تھا۔ یہ اختلاف کمیونٹی کی قیادت کے سلسلے میں تھا جو بالآخر شیعہ سنی فساد پر منبج ہوا۔ پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں میں ایک معتدبہ تعداد شیعوں کی ہے۔ ان کے مزارع اور رعایا کی واضح اکثریت سنیوں کی ہے۔ شیعہ ذاکرین و خطباء کی دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے سنی علماء پریشان تھے لیکن توازن شیعہ کمیونٹی کے ہاتھ میں تھا کیونکہ ان کی قیادت صاحب اثر جاگیردار یا تعلیم یافتہ و کلاء و سماجی و سیاسی کارکنوں کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں سرکار

دربار میں رسائی حاصل تھی جبکہ اہل سنت کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی۔ وہ تقریریں کرتے تو انہیں آسانی سے فرقہ پرست مولوی کہہ کر ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ شیعہ قیادت، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سیاسی و سماجی کارکنوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مؤثر ہوتی۔ اہل سنت عوام ہمیشہ خوف، جھنجھلاہٹ اور مایوسی کا شکار رہے۔ جھگڑا ہمیشہ اس بات پر ہوتا کہ گھوڑے اور تعزیہ کا جلوس سنی آبادی سے گزرے کہ نہ گزرے۔ شیعہ اصرار کے پیچھے سیاسی قوت، حکومتی حمایت اور انتظامی طاقت ہوتی اس لیے وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے اور سنیوں کے مجروح جذبات کے زخم اور گہرے ہوتے۔ یہ وہ پس منظر تھا کہ لاہور میں بڑا فساد ہوا اور بھائی دروازہ میں کئی سنی مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے۔ سرکاری تفتیشی کارروائی ہوئی اور رپورٹ اس گروہ کے حق میں تیار ہوئی جو زیادہ اثر و رسوخ رکھتا تھا اور جس کی قیادت متحرک و فعال تھی۔ تصادم اور کشمکش کی اس فضا کو پرسکون بنانے کی ضرورت تھی لیکن کسی میں ہمت نہ تھی کہ آواز اٹھائے۔ بالآخر بھائی دروازہ کے اندر ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں شیعہ سنی زعماء کو خطاب کرنا تھا۔ میں بھائی دروازے کا خطیب تھا اس لیے اس پروگرام کا حصہ تھا۔ سنیوں کے جذبات مجروح تھے ان کی سماجی قیادت نے انہیں بیچ گرداب چھوڑ دیا تھا۔ تلخی کے اس ماحول میں وہ کسی پروگرام میں شریک ہونے کے لیے تیار نہ تھے تاہم کافی محنت کے بعد اس جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسے کے مرکزی مقرر علامہ علاؤ الدین صدیقی تھے۔ اتحاد بین المسلمین پر ان کی تقریر اتنی مؤثر تھی کہ سامعین کی اکثریت اشک بار تھی۔ جتنی جرأت کے ساتھ انہوں نے فساد کی مذمت کی اور جس اثر انگیز انداز سے وحدت اسلامی کو بیان کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ نازک حالات میں اتنے مؤثر اسلوب کی تقریر میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ میں نے اس جلسے میں محتاط انداز سے اہل سنت کے نقطہ نظر سے گفتگو کی تھی جس کے بعض پہلوؤں کا علامہ مرحوم اپنی تقریر میں ذکر کرتے رہے الحمد للہ فضا ساز گار ہوئی اور معاملات بہتر ہوئے۔ یہ جلسہ علامہ مرحوم سے مزید قربت کا ذریعہ بنا۔ اسی جلسے میں انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ایم اے اسلامیات میں داخلہ لوں گا۔

ایسے تمام جلسے جو غیر فرقہ دارانہ انداز کے ہوتے علامہ مرحوم ان کے مرکزی مقرر ہوتے۔ مجھے ان کے ساتھ شہادت حسین، یوم علی، سیرت رسول اور اتحاد امت کے جلسوں میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کی حیثیت ہمیشہ سب سے زیادہ محترم مقرر کی ہوتی۔ وہ

مسلک ولی اللہی کے ایک معتدل عالم تھے۔ اپنے مسلک کی پختگی کے باوجود وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں شیعہ، بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث اکابر کا ہمیشہ اعتماد حاصل رہا۔ ان کی خطابت کا ایک اہم پہلو انگریزی زبان پر قدرت تھا۔ وہ جس طرح اردو میں خاص اسلوب کے حامل تھے اسی طرح وہ انگریزی زبان کے بھی خطیب تھے۔ سول اور ملٹری اداروں میں ان کے لیکچر ہوتے جو انگریزی زبان میں ہوتے۔ اس زمانے میں انگریزی خطابت کے حوالے سے ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا، زبان پر قدرت تھی اور اسلام کا درد تھا غرض ان کی خطابت میں وہ تمام عناصر موجود تھے جو انہیں اپنے دور کا صاحب طرز خطیب بنا رہے تھے۔

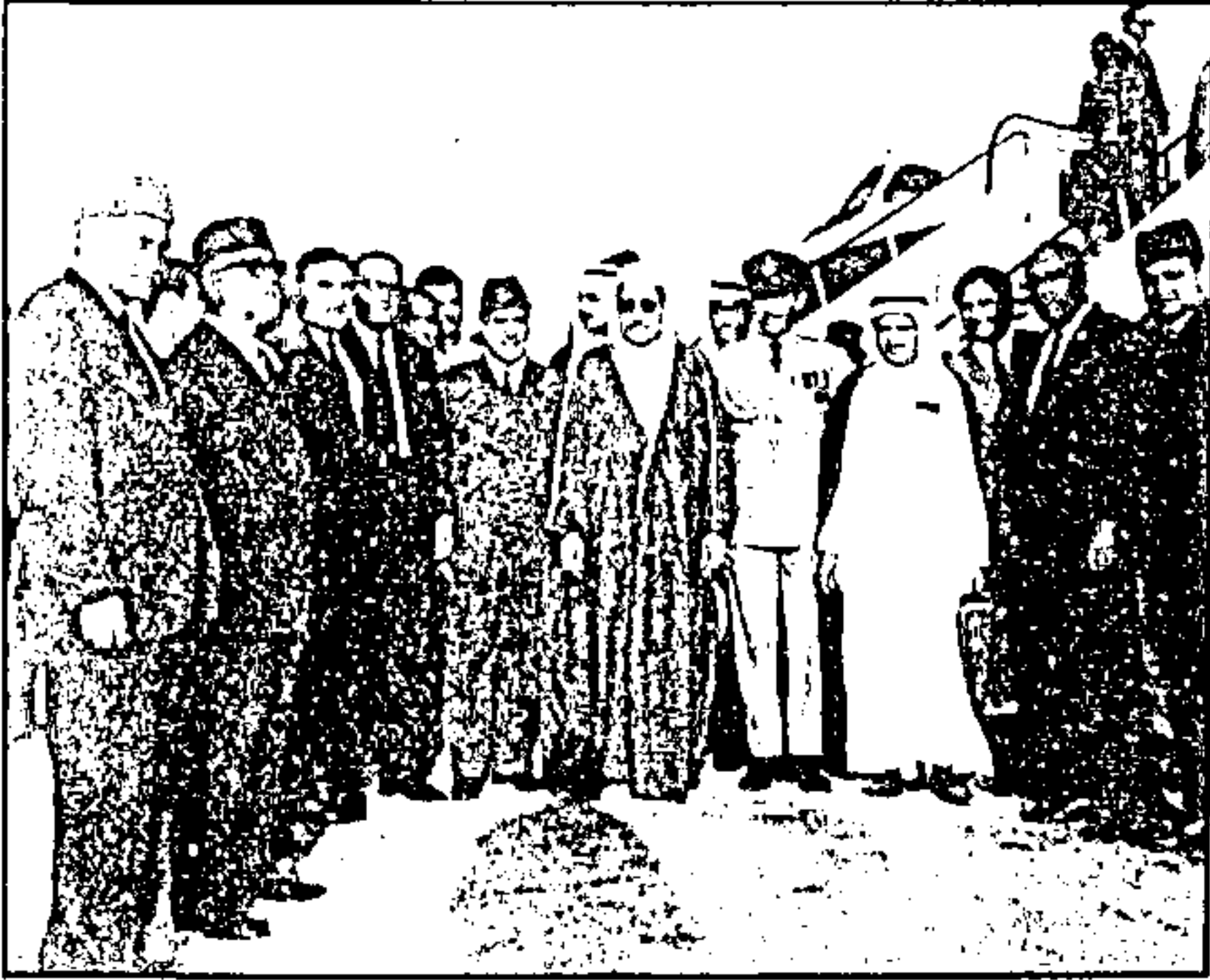
مسجد شاہ چراغ

ان کی خطابت کا ذکر نامکمل رہے گا اگر مسجد شاہ چراغ کا تذکرہ نہ ہو۔ لاہور ہائی کورٹ کے احاطہ میں واقعہ یہ مسجد مسلمانوں نے بڑی جدوجہد سے انگریزوں سے واگزار کرائی۔ اس مسجد میں جمعہ کے خطبہ کی ذمہ داری علامہ مرحوم نے سنبھالی۔ گردوبیش کے تمام مسلمان ملازم اور پڑھے لکھے لوگ اس مسجد میں نماز ادا کرتے۔ شعبہ اسلامیات کی صدارت کے دوران بھی آپ وہاں خطبہ دیتے۔ ہر رمضان شریف میں خصوصی افطاری کا انتظام ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی پارٹیاں ہوتیں۔ ورلڈ مشن آف اسلام کے نام سے ایک تنظیم قائم تھی جو علامہ مرحوم کی دعوتی سرگرمیوں کا ذریعہ تھی جمعہ کے یہ خطابات قرآن پر مبنی ہوتے اور علامہ مرحوم اپنے مخصوص انداز میں اس کی تفسیر و تشریح کرتے۔ متاثرین، معتقدین اور مداحین کا ایک وسیع حلقہ تھا جو ان خطابات کی وجہ سے قائم ہوا۔ افسوس ہے کہ ان کی تقریروں کا کوئی بڑا منضبط ریکارڈ نہیں ہے۔ اس دور میں ریکارڈ کرنے کا ایسا اہتمام بھی نہ تھا اب تو ہر کہ وہ اپنی تقریروں کے کیسٹ کے لیے آوازیں دے رہا ہے۔

علامہ علاؤ الدین صدیقی دین و سیاست کے امتزاج کا شعور رکھنے والے ایک صاحب طرز خطیب تھے جو اپنی انفرادیت اور مخصوص اسلوب کے باعث ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔



فلسطین کے مشہور مفتی جناب امین الحسینی کے ساتھ



الشیخ حسن بن عبداللہ وزیر تعلیم و صحت حکومت سعودی عرب کے ساتھ
(۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء)

علامہ علاء الدین صدیقیؒ

پروفیسر محمد ارشد خاں بھٹی ☆

تعارف

علامہ صاحب سے میرا تعلق بحیثیت استاد اور شاگرد ۱۹۴۶ء سے ہے جب میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں طالب علم تھا۔ علامہ موصوف اسلامیات کے استاد تھے۔ بہت ہی مشفق استاد جو اپنے طلبہ کو ایسی محبت دیتے تھے کہ طلبہ خود ان کی طرف قلبی رغبت محسوس کرتے تھے۔ بہترین مقرر تو وہ مشہور ہی تھے مگر دین اسلام کو وہ جس گہرائی اور فلسفے سے سمجھاتے تھے اس سے طلبہ اور بھی ان کی طرف کشش رکھنے لگے۔ اسلامیات کی کوئی خاص کتاب بطور نصاب مقرر نہ تھی، علامہ صاحب اسلام پر عام اور بنیادی معلومات کی تعلیم دیتے تھے۔ البتہ انہوں نے طلبہ کو شروع ہی سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی مشہور کتاب ”رسالہ دینیات“ خرید کر گھر میں پڑھنے کے لیے ہدایت کر دی تھی جو تمام طلبہ نے خرید رکھی تھی۔ بعد میں یہ کتاب چھوٹے سائز میں (رسالہ سائز سے ہٹ کر) صرف ”دینیات“ کے نام سے چھپنے لگی۔ اس کتاب کے مواد، روح اسلام کی صحیح ترجمانی اور اعلیٰ ادبی بیان کی بنا پر دنیا کی ۲۶ زبانوں (اور اب تک شاید اس سے بھی زیادہ زبانوں) میں ترجمہ ہو کر چھپنے لگی۔ علامہ صاحب موصوف کے لیکچرز سننے اور رسالہ دینیات پڑھنے سے ہی میرے اندر دین اسلام کی حقیقی پہچان اور لگن پیدا ہوئی۔ یہ اسی لگن کا نتیجہ تھا کہ میں سائنس کا طالب علم ہونے اور ایم۔ ایس سی تک سائنس پڑھنے کے باوجود فارغ اوقات میں میرا اسلامی کتابوں کا مطالعہ ساتھ ساتھ جاری رہا۔ علامہ صاحب سے میرا رابطہ مسلسل قائم رہتا اور اسلامی علوم پر میرے مطالعہ کے بارے میں علامہ صاحب بھی ہمیشہ آگاہ رہتے تھے۔ ایم۔ ایس سی (بائنٹی) کے بعد میں ایم اے ادکالج

لاہور میں بطور لیکچرر بیالوجی مقرر ہو گیا لیکن علامہ صاحب کے مشورہ اور اصرار پر میں نے ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اسلامیات بھی پاس کر لیا۔ اسی سال ملک محمد اسلم مرحوم (جو علامہ موصوف کے بعد شعبہ علوم اسلامیہ کے سربراہ بنے) نے بھی ایم۔ اے اسلامیات میرے ساتھ پاس کیا تھا۔ جنہیں علامہ صاحب بعد میں اپنے شعبہ میں ہی بطور لیکچرر لے آئے تھے۔ علامہ صاحب نے مجھے بھی فرمایا تھا کہ میں بھی شعبہ اسلامیات میں آ جاؤں مگر میں نے بعض وجوہ کی بنا پر معذرت کر لی تھی کہ میں کالج میں ہی ٹھیک ہوں اور وہیں شعبہ اسلامیات کی خدمت کرتا رہوں گا۔ چنانچہ علامہ صاحب اپنے وہ طلبہ جنہیں انہوں نے مقالات کی تیاری کے لیے چنا ہوتا تھا وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور میں یوں شعبہ اسلامیات کی اعزازی خدمت کرتا رہتا تھا۔

اسلامیہ کالج کی طالب علمی کے زمانے (۱۹۴۶ء) میں علامہ صاحب نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو کالج میں خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا۔ کالج کے تمام طالب علم حبیبیہ ہال میں جمع ہو گئے۔ مولانا مودودی تمام اساتذہ اور پرنسپل کے ساتھ کالج ہال میں جلوس کی صورت میں داخل ہوئے، علامہ صدیقی مولانا مودودی کے ساتھ ایک قدم پیچھے جلوس کے آگے چل رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مولانا مودودی کو اس وقت دیکھا تھا۔ ہمارے ذہنوں میں علامہ صدیقی صاحب اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ شاید دنیا میں صدیقی صاحب سے بڑا کوئی عالم دین نہیں ہے، جب علامہ صاحب کو مولانا مودودی سے ایک قدم پیچھے بڑے احترام سے چلتے دیکھا تو سوچا کہ یہ مولانا (مودودی) کوئی بہت ہی بڑے عالم دین ہوں گے جن سے ایک قدم پیچھے علامہ صاحب چل رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہی مولانا مودودی ہیں جن کی کتاب ”رسالہ دینیات“ کو بار بار پڑھنے کی ہدایت علامہ صاحب نے طلبہ کو کر رکھی ہے۔

علامہ صاحب کی رہنمائی کی برکتیں

مجھ پر علامہ صاحب کی رہنمائی اور خصوصی توجہ سے میری راہیں وسیع دینی مطالعہ کی جانب بڑھتی چلی گئیں۔ اس مطالعہ کی وسعت سے مجھے کچھ لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور یوں مختلف مضامین لکھنے شروع کیے۔ انہی دنوں میں نے مولانا مودودی کی کتاب ”پردہ“ پڑھی اور میں

نے انگریزی میں پردہ پر ایک مضمون لکھ ڈالا اور اسے ایک خاص میٹنگ میں پڑھا جس کی صدارت انگریزی کے صدر شعبہ پروفیسر حمید احمد خاں فرما رہے تھے۔ چنانچہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے میٹنگ کے سیکرٹری کو کہا کہ ارشد بھٹی کا یہ مضمون کالج میگزین (کریسنٹ) کے سالگرہ نمبر میں شامل کر لیں۔

مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ مضامین لکھنے کی مشق اور تربیت مسلسل جاری رہی اور یوں مطالعہ کی کتب سے مطلوبہ مواد اخذ کرنے کی صلاحیت، اسلوب تحریر اور انداز بیان میں پختگی بڑھتی چلی گئی۔ کالج میں بحیثیت استاد تعینات ہونے کے بعد بہت جلد میری نصابی کتب اسلامیات مارکیٹ میں مقبول عام ہو گئیں جو ریٹائرمنٹ کے دس سال بعد بھی آج اسی طرح مقبول و معروف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب کامیا بیاں استاذ محترم علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم و مغفور کی رہنمائی اور تربیت کے فیض کا نتیجہ ہیں۔

علامہ صاحب سے میرا قلبی اور خصوصی تعلق

علامہ صاحب میں انسانی ہمدردی اور خلوص و محبت بے حد تھی اور شاید ہر ملنے والا یہی محسوس کرتا تھا کہ دوسروں سے زیادہ اسی سے وہ محبت کرتے ہیں۔ میرے ساتھ خصوصی محبت تھی اور بہت عزت دیتے تھے۔ گھریلو معاملات تک مجھ سے مشورہ فرماتے۔ اسی طرح کی ایک گفتگو میرے اور ان کے درمیان شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کے ان کے اپنے دفتر میں چل رہی تھی کہ وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے سیکرٹری کا فون آگیا۔ V.C صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ علامہ صاحب نے پسند نہ کیا کہ ہماری گفتگو فوری طور پر بند ہو جائے چنانچہ انہوں نے مجھے فرمایا کہ میرے ساتھ ہی وی سی صاحب کے کمرے تک چلیں تاکہ وہاں تک پہنچتے ہماری گفتگو مکمل ہو جائے۔ جب ہم V.C صاحب کے سیکرٹری کے کمرے میں پہنچ کر صوفہ پر بیٹھ گئے تو سیکرٹری نے وی سی صاحب کو فون پر اندر اطلاع دی کہ علامہ صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ایک لمحہ بعد ہی وی سی صاحب نے خود اپنا دروازہ کھولا اور فرمایا کہ علامہ صاحب تشریف لائے۔ میں بھی اٹھا اور حمید احمد خاں صاحب

سے سلام کے ساتھ ہاتھ ملایا تو خاں صاحب نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور فرمایا کہ آپ کو کہیں جانے کی جلدی تو نہیں؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ نہیں کوئی جلدی نہیں۔ چنانچہ خاں صاحب نے میرا ہاتھ چھوڑے بغیر اندر کھینچ لیا کہ آپ بھی اندر آ جائیے۔ اندر کمرے میں پرنسپل لاء کالج شیخ امتیاز احمد صاحب پہلے سے تشریف فرما تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی خاص ہی میٹنگ تھی کہ تین بڑوں کے علاوہ کوئی چوتھا بندہ وہاں نہ تھا۔ وی سی صاحب نے بیٹھنے سے پہلے فرمایا علامہ صاحب، ارشد بھٹی صاحب آپ کے ضرور شاگرد ہوں گے مگر میرے یہ بہت عزیز اور خاص شاگرد ہیں۔ چنانچہ میٹنگ چلتی رہی چائے وغیرہ بھی پیتے رہے، تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ہم فارغ ہوئے پھر علامہ صاحب کے اپنے دفتر میں آ گئے اور بقیہ گفتگو کو مکمل کیا۔

علامہ صاحب کے بیٹے وجیہ الدین نعمان کی شادی کا وقت آیا تو علامہ صاحب بذات خود بیٹے کے ہمراہ شادی کا دعوت نامہ دینے میرے گھر واقع ریواز گارڈن لاہور تشریف لائے۔ ان دنوں علامہ صاحب کچھ علیل بھی تھے۔ میں نے عرض کیا علامہ صاحب آپ نے خود کیوں تکلیف کی ہے نعمان کا آنا ہی کافی تھا۔ فرمانے لگے قرب اور تعلق کا تقاضا تھا کہ میں خود ہی آتا۔ نعمان کے ڈپلومہ اسلامیات میں مقالہ کا گائیڈ بھی مجھے بنایا گیا۔

علامہ صاحب کی سب سے بڑی بیٹی فرحت (جواب مرحومہ ہو چکی ہیں) میری بیگم کی کالج تک ہم جماعت رہ چکی تھیں۔ چنانچہ میری بیگم کا زمانہ طالب علمی میں علامہ صاحب کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ قرب اور تعلق کا ایک یہ بھی حوالہ تھا۔

۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ علامہ صاحب نے حکم دیا کہ اسلامیات کے اساتذہ قدیم (اولڈ بوائز) کی تنظیم بنائی جائے تاکہ ان کی کارکردگی اور اثرات سے ہم سب آگاہ رہیں۔ چنانچہ ایک میٹنگ طے ہوئی اور اس اجتماع میں علامہ صاحب نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ میں خود اس تنظیم کے فعال لوگ نامزد کرتا ہوں، پھر آئندہ آپ لوگ خود ووٹ کے ذریعہ انتخاب کر لیا کریں۔ چنانچہ علامہ صاحب نے ملک محمد اسلم صاحب کو تنظیم کا صدر اور مجھے سیکرٹری جنرل نامزد کر دیا۔

علمی تدبر کی بعض باتیں

علامہ صاحب علمی تدبر کے اعلیٰ اور نمایاں درجہ پر فائز تھے۔ ایک مرتبہ شعبہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ کرام میں بیٹھے ایک ایسی گفتگو کے درمیان میں، جو امت مسلمہ کے چوٹی کے ائمہ کے بارے میں چل رہی تھی، آپ نے فرمایا: ”آپ لوگ کیا گفتگو کر رہے ہیں! میں پوری ایمانداری سے کہتا ہوں کہ چودہ صدیوں کے علماء فقہاء جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد میری انگلی اگر پڑتی ہے تو وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر پڑتی ہے، بیچ کی شخصیتیں تو بہت ہوتی ہیں۔“

اسی طرح کی ایک دوسری نشست میں علامہ صاحب نے ایک بڑے عالم و فاضل استاد کے حوالہ سے فرمایا کہ ”علم و دانش کا صحیح استعمال ہی نافع اور مفید ہوتا ہے ورنہ بے ربط حوالے اور بے تکی باتیں ایسے ہی ہیں جیسے ایک گھڑی (واچ) کا پرزہ پرزہ الگ کر کے اگر رومال میں ڈال کر یہ کہا جائے کہ اس رومال کے اندر گھڑی موجود ہے تو ایک اعتبار سے تو بات درست ہوگی مگر یہ گھڑی وقت تو نہیں بتا سکتی جب تک ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ اپنا کام نہ کرے۔“

علامہ صاحب خیر اور بھلائی کو ہمیشہ مد نظر رکھتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کو خیر الناس من ینفع الناس (لوگوں میں سے اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے) حرز جاں بنائے رکھتے تھے اور دوسروں کو حتی المقدور فائدے پہنچاتے رہتے تھے۔ میرے نزدیک سب سے بڑا فائدہ تو علم و دانش کے زیور سے لوگوں کو آراستہ کرنا ہے۔ علامہ صاحب نے اس ضمن میں بڑا کام یہ کیا کہ ایم اے (علوم اسلامیہ) کی کلاسیں صبح کے علاوہ شام کو بھی لگانا شروع کر دیں تاکہ جو گریجویٹ مختلف دفاتر میں کلرک وغیرہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں وہ شام کی کلاسوں میں آ کر پڑھائی مکمل کر سکیں۔ اس سکیم سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے اور اساتذہ اسلامیات بن کر سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات پڑھانے لگے۔ یہ علامہ صاحب کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پورے پاکستان میں مضمون اسلامیات پہلے آٹھویں، پھر دسویں، پھر انٹر اور بی۔ اے اور پھر تمام فنی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لازمی مضمون کی حیثیت سے حکومتی

سطح پر لاگو کر دیا گیا۔ یہ کام ”منفع الناس“ کے ضمن میں بہت بڑا کام تھا جو اللہ تعالیٰ نے علامہ صاحب کے نامہ اعمال کا حصہ بنا دیا جو یقیناً علامہ صاحب کے لیے اجر آخرت بنے گا۔

ایک طالبہ جس کے ایم۔ اے کے مقالہ کا عنوان ”پردہ“ تھا اس کا خارجی ممتحن مجھے بنایا گیا اور داخلی ممتحن خود علامہ صاحب تھے۔ زبانی امتحان کے وقت میں نے طالبہ سے پوچھا کہ آپ نے خود تو برقعہ پہن رکھا ہے اور پردے کے اسلامی آداب کا پورا لحاظ رکھا ہوا ہے مگر آپ نے اپنے مقالہ میں ظاہری پردہ کے خلاف لکھا ہوا ہے۔ علامہ صاحب سامنے بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے۔ طالبہ کا جواب یہ تھا کہ یہ سب مجبوری کا پردہ ہے، والدین اور خاندان کے ڈر سے پردہ ہو رہا ہے ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ کچھ مزید سوال و جواب کے بعد جب طالبہ فارغ ہو کر کمرے سے باہر چلی گئی تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ طالبہ کو نمبر (مارکس) تو اچھے ہی دیں گے کیونکہ اس نے پڑھنے اور لکھنے میں کافی وقت لگایا تھا۔ بس ابھی بچی ہے کچھ مزید مطالعہ اور شعور بڑھے گا تو ضرور اسلامی قدروں کا لحاظ رکھے گی فی الحال اسے آگے بڑھانا ہے حوصلہ دینا ہے۔ مجھے اس خیر خواہی اور بھلائی پر نبی اکرم ﷺ کا وہ واقعہ یاد آتا ہے جب طائف کے لوگوں نے حضور کو سخت اذیت دی اور پتھروں سے آپ کو زخمی بھی کر دیا تھا اور فرشتہ عذاب نے آ کر حضور ﷺ سے اجازت مانگی کہ حکم ہو تو آپ کے سامنے ان بدکردار لوگوں کو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دیا جائے لیکن رحمۃ للعالمین نے اجازت نہ دی بلکہ ان کے لیے ہدایت کی دعا کی۔

مزاح اور خوش طبعی

علامہ صاحب میں مزاح اور خوش طبعی بہت زیادہ تھی۔ بات بات میں مزاح پیدا کرنا اور سنجیدہ گفتگو اور محفل کو مزاحیہ کلمات والفاظ سے کشت زعفران میں بدل دینا ان کا عام معمول تھا۔ اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنا اور ان کی رفاقت بہت پسند کرتے تھے اور ویسے بھی وہ بہت ملنسار اور محبت سے پیش آنے والی شخصیت تھے۔ نبی اکرم ﷺ سے جب کسی نے پوچھا کہ اسلام کی اچھی بات کون سی ہے تو حضور نے فرمایا: ”خوش خلقی“ یعنی خندہ پیشانی اور ہمدردی

سے پیش آنا۔ علامہ صاحب میں یہ اعلیٰ صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ دوسروں کو مایوس کرنا گناہ سمجھتے تھے الا یہ کہ کوئی انہونی اور بہت ہی ناروا بات ہو۔

ہماری ایم اے کی کلاس کے طلبہ کو ساتھ لے کر علامہ صاحب ٹیکسلا وغیرہ دیکھنے اور سیر و تفریح کی غرض سے کچھ دنوں کے لیے لاہور سے نکلے، یہ ۱۹۵۵ء کے اوائل کی بات ہے۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات دیکھ رہے تھے کہ وہاں جا بجا بودھ (دھرم) کی عبادت گاہوں کی کھنڈرات بھی نمایاں تھے جنہیں سٹوپے (Stupas) کہتے ہیں۔ ہمارے طلبہ کا ایک ساتھی بھاری بھر کم شخصیت تھا، اس نے اچانک اونچی آواز میں کہا ”علامہ صاحب یہ سب سے بڑا سٹوپا ہے“ علامہ صاحب نے برجستہ فرمایا: ”اور تم سب سے بڑے سٹوپڈ (Stupid)۔ اس طالب علم کے بارے میں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نہایت ذہین اور علم و مطالعہ بے پناہ تھا اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس نے کچھ مہینے پہلے علامہ صاحب کو ڈیڑھ سو صفحات (بڑے کاغذوں) پر مشتمل ایک خط لکھ کر دستی دیا، خدا جانے اس خط میں کیا لکھا ہے، مگر اتنے لمبے چوڑے خط کو پڑھنے کی فرصت علامہ صاحب کو کہاں تھی! چنانچہ ڈیڑھ دو ماہ کے انتظار کے بعد جب خط کا جواب نہ ملا تو اس طالب علم نے ”کچھتر صفحات کا ایک اور خط بطور یاد دہانی بھیجا اور اس کے باہر لفافے پر (جو ظاہر ہے بہت بڑا لفافہ تھا) پندرہ بیس سطروں میں کچھ لکھ کر اوپر عنوان یہ لکھ دیا کہ یہ خط بھی نہیں پڑھ سکتے تو صرف باہر لفافے پر لکھی ہوئی تحریر ہی دو منٹ میں پڑھ لیں۔ یہ وہ پس منظر تھا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کو ذہن میں رکھتے ہوئے علامہ صاحب نے اسے ٹیکسلا کے کھنڈرات میں فرمایا تھا کہ تو سب سے بڑا سٹوپڈ۔

علامہ صاحب بحیثیت مقرر

علامہ صاحب مانے ہوئے مقرر تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے مسلم لیگ پنجاب کے سیکرٹری جنرل رہے اور اپنی شعلہ بیان تقریروں اور خطابات سے وہ پبلک میں بہترین مقرر مشہور تھے۔ ایک نجی نشست میں انہوں نے خود بتایا ”جب مجھے پہلی بار کسی جلسے میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا تو اس وقت میں نو جوان تھا اور حالت یہ تھی کہ ٹانگیں کانپ رہی

تھیں اور سخت پریشانی کا عالم تھا۔ بہر حال مجبوری میں تھوڑی بہت ہمت کر کے میں نے بولنا شروع کیا۔ جوں جوں جملے زبان سے نکلتے گئے اپنے اوپر اعتماد بڑھتا چلا گیا اور گفتگو بہتر ہوتی گئی۔ پھر کیا تھا، اگلی دفعہ تقریر اور بہتر اور اس سے اگلی دفعہ مزید بہتر۔ یوں ہم مقرر بن گئے۔ بہر حال مقرر کے لیے وسیع مطالعہ اور زبان و الفاظ کا ذخیرہ ضروری ہے باقی ہر کام کے لیے کوشش اور پریکٹس ہی انسان کو ماہرانہ سطح پر لے آتی ہے۔

بحیثیت وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

یونیورسٹی کے بعد علامہ صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا۔

اس وقت یونیورسٹی کے طلبہ نے مظاہرے اور توڑ پھوڑ کر کے یونیورسٹی کی انتظامیہ کے خلاف فضا قائم کر رکھی تھی۔ علامہ صاحب کو اس نئے عہدے کی مبارک دینے کے لیے ہم چند لوگ ان کے پاس گئے تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ ”بھئی میرے لیے مبارک باد کے بجائے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان نامساعد حالات میں کامیابی سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔“

علامہ صاحب اپنی حکمت عملی، فہم و فراست اور خندہ پیشانی کی بنا پر معاملات سلجھاتے رہے اور کامیابی سے آگے بڑھتے رہے۔ وہ لوگوں کے غلط مطالبات اور ناجائز باتوں کو بھی فراخ قلبی سے سنتے اور بڑی خوش اسلوبی سے جائز بات پر قائل کر لیتے تھے، یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔

علامہ صاحب نے وائس چانسلر کے عہدہ کے پورے چال سال بڑی کامیابی سے پورے کیے۔ اس دوران میں میرے ان سے قریبی تعلقات کی بنا پر کئی لوگ مجھ سے بعض کاموں کے لیے سفارش کرنے کا زور لگاتے رہے مگر میرا یہی جواب ہوتا کہ ”میں سفارشوں کا قائل نہیں ہوں، سفارشوں سے انسان اپنی قدر و قیمت کھودیتا ہے اس لیے میری معذرت ہی قبول فرمائیں۔“ علامہ صاحب سے اس عہدہ جلیلہ کے دوران میں میں نے صرف ایک مرتبہ ہی سفارش کی جو بہت جائز کام تھا، کسی کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ واقعہ یوں تھا کہ میرے ایم اے او کالج کے ایک ساتھی استاد نے، جو سائنس کے شعبہ سے تعلق رکھتے تھے، دس بارہ سال کی

ملازمت چھوڑ کر یونیورسٹی کی ایک عارضی لیکچر شپ قبول کر لی کہ وہاں اونچے درجے کی تعلیم دینا زیادہ اعزاز کی بات ہے۔ ویسے بھی یہ صاحب ایم ایس سی آنرز میں فرسٹ ڈویژن رکھتے تھے۔ آٹھ دس سال یونیورسٹی میں کامیابی سے پڑھانے کے بعد یونیورسٹی کی انتظامیہ نے ان صاحب کی ملازمت ختم کر دی۔ میں نے علامہ صاحب کو تفصیل سے آگاہ کیا کہ یہ سراسر ظلم ہے مدد کیجئے۔ علامہ صاحب نے خود بھی متعلقہ کاغذات منگوا کر معاملہ کی چھان بین کر لی۔ چنانچہ سینڈی کیٹ کی میٹنگ میں علامہ صاحب نے حاضرین میٹنگ سے کہا کہ اس معاملہ میں میرے ایسے عزیز (ارشاد بھٹی) نے سفارش کی ہے جو نہ تو سفارشوں کا قائل ہے اور نہ وائس چانسلر کے چار سالہ دور میں (علامہ صاحب کے اس عہدہ کے آخری چند مہینوں کی بات ہے) اس عزیز نے کبھی کوئی سفارش کی ہے، میں نے خود بھی معاملہ کی ساری تحقیق کی ہے کہ معاملہ نہایت درست ہے اور مدد بہت ناگزیر ہے لہذا کوئی شخص مخالفت نہ کرے یہ کام میں نے لازماً کرنا ہے۔ چنانچہ اس صاحب کی بحالی کے احکامات جاری کر دیئے۔

نیکی پر استقامت بھی علامہ صاحب کی پہچان تھی اور نیکی پر قائل کر لینا بھی ان کی شان تھی۔ اسی خوبی کی بنا پر انہوں نے وائس چانسلر کے چار سالہ دور میں طلبہ کے ہنگاموں اور گڑبڑ کو پنپنے نہیں دیا۔ خوش اسلوبی سے معاملات سلجھاتے رہے اور ماتحت عملہ کے چھوٹے سے چھوٹے ملازم کو بھی عزت بخشی جس کے نتیجے میں انہیں وہ عزت اور شہرت ملی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت کاملہ اور جنت کے اونچے درجے عطا فرمائے، آمین۔



علامہ صاحب - ایک مشفق استاد

ڈاکٹر جمیلہ شوکت

استاد محترم علامہ صاحب ایک اچھے منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شفیق اور مہربان انسان بھی تھے۔ ان کے تعلقات کا دائرہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلم و علم کی دولت کے ساتھ اس کے موثر ابلاغ کی نعمت غیر مترقبہ سے بھی نوازا تھا۔ اپنے رفقاء کار اور ماتحتوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے، توجہ سے مسائل و معاملات سنتے اور ان کو حل کرنے کی بھی کوشش فرماتے۔ اس شفقت کے ساتھ وہ اصول و ضوابط کے پابند تھے اور دوسروں کو بھی اس پر کاربند دیکھنا چاہتے تھے۔ فرائض میں تساہل اور غفلت انہیں بالکل پسند نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ماتحت کام کرنے والوں کو محاسبہ کا بھی خوف رہتا۔

شعبہ اسلامیات ابتداء ہی سے طالبات کا شعبہ رہا ہے۔ بایں طور کہ اس میں داخلہ لینے والے طلباء میں سے 70 تا 80 فیصد طالبات ہوتی تھیں اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔ کمرہ جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ شریعت مطہرہ کے مطابق طلبہ کو غیر ضروری اختلاط سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اور طالبات آزادی اور اطمینان سے اساتذہ کرام سے استفادہ بھی کر سکیں۔ والدین کی ایک معتد بہ تعداد اپنی بچیوں کو اس شعبہ میں پردہ کے اہتمام اور علامہ صاحب کی پدیری شفقت کی وجہ سے داخل کرانے کی خواہش مند ہوتی۔ علامہ صاحب طالبات سے اپنی بچیوں کی طرح محبت و شفقت سے پیش آتے اور طالبات بھی اپنے سربراہ ادارہ اور استاذ محترم سے نہایت عقیدت و محبت رکھتی تھیں۔ علامہ صاحب طالبات کی ضرورتوں اور ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ طالبات کی سہولت کی خاطر خاتون لائبریرین کی تقرری فرمائی۔ لائبریری کا بڑا حصہ طالبات کے لیے مختص تھا چھٹی کے بعد اگر جگہ تنگ ہو جاتی تو لائبریری میں کھلنے والا کمرہ جماعت کا دروازہ کھول دیا جاتا تاکہ طالبات

لابریری سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ لابریرین صاحبہ (خالدہ اختر صاحبہ) جو ڈپٹی چیف لابریرین پنجاب یونیورسٹی کے عہدہ سے حال ہی میں فارغ ہوئی ہیں، خود بھی دیندار تھیں۔ طالبات کے ساتھ ہر ممکن تعاون فرماتیں۔ طالبات کو اگر کسی استاذ محترم سے رہنمائی لینی ہوتی تو خاتون معاون یا بابا شفیع کے ذریعے انہیں پیغام بھیجا جاتا اور وہ لابریری ہی میں تشریف لے آتے اور راہنمائی فرماتے۔

علامہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ کلاسز کا وقت شروع ہونے سے قبل ہی شعبہ میں تشریف لے آتے اور کلاس شروع ہونے تک باہر ہی موجود رہتے۔ وہ مخلوط ماحول میں طلبہ بالخصوص طالبات کے اخلاق و کردار پر خصوصی نظر رکھتے۔ اگر کوئی حد سے تجاوز کرتا تو اس کو طلب کیا جاتا، فہمائش کی جاتی اور آخر میں ایک شفیق باپ کی طرح اونچ نیچ سمجھاتے اور آئندہ احتیاط کی تلقین فرماتے۔

شعبہ اسلامیات کی ایک خصوصی روایت ہر سال ایک مختصر اور ایک طویل تفریحی دورے کی تھی۔ ان تفریحی سفروں میں عموماً طلبا اور طالبات ایک ہی وقت میں لیکن علیحدہ علیحدہ بسوں میں جاتے۔ اساتذہ کرام کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ان تفریحی دوروں پر جائیں تاکہ چھٹیوں میں اس بہانے وہ بھی گھرداری کے معمولات سے نکل سکیں۔ علامہ صاحب کے ساتھ بھی ان کے اہل خانہ ہوتے۔ اگرچہ یہ تفریحی سفر ایک وقت میں ہوتا اور منزل مقصود بھی ایک ہی ہوتی لیکن یہ حقیقت ہے علامہ صاحب احکام شریعت کی پابندی کی ہر ممکن کوشش فرماتے۔ بالعموم جو نیر اساتذہ طلبہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے چلے جاتے جبکہ سینئر اساتذہ کرام اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ طالبات کے ساتھ جاتے۔

بس کے علاوہ یہ تفریحی سفر ریل کے ذریعے بھی ہوتے۔ جو نہی شام کا دھند لکا بڑھتا علامہ صاحب اپنا بستر دروازے کے ساتھ فرش پر لگا لیتے، کم سوتے اور پوری رات اٹھتے بیٹھتے گزار دیتے۔ علامہ صاحب طالبات کو تفریحی دورے پر لے جاتے تو ان کی حفاظت استاذ محترم کی پہلی ترجیح ہوتی۔

علامہ صاحب، ان کے اہل خانہ اور دیگر اساتذہ کرام کے اہل خانہ کے ساتھ یہ سفر

آرام دہ اور پر لطف ہوتا۔ آپس میں خوش گپیاں بھی ہوتیں اور ہلکے پھلکے کھیل بھی۔ طالبات کو تفریحی دورہ میں موقع ملتا کہ وہ ان کے ساتھ بیٹیوں کی طرح گھل مل جاتیں۔ ایک باپ کے مرتبے و مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے ہنسی مزاح بھی ہوتا کبھی لطائف اور علمی چٹکے ہوتے اور یوں یہ سفر بزرگوں کی معیت میں بے شمار خوشگوار یادیں سمیٹے ختم ہو جاتا۔

اسی سفر کے حوالے سے ایک بات اور ذہن میں آرہی ہے اور وہ یہ کہ اگر لاکھوں پہنچتے شام پڑ جاتی تو ہر طالبہ کو بحفاظت اس کے گھر تک پہنچانا اپنا فرض خیال فرماتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر طالبہ کے ساتھ اس محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتے کہ وہ اپنے آپ کو ان کی بیٹی تصور کرتی اور اس پر وہ ناز بھی کرتی۔

کمرہ جماعت میں ان کا بڑا رعب ہوتا۔ لیکچر دیتے تو سب ہمہ تن گوش ہو جاتے اور پوری توجہ سے اہم نکات نوٹ کرتے۔ اگرچہ قرآن حکیم اور تقابل ادیان ان کے خصوصی مضامین تھے لیکن ہر موضوع اور مضمون پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ حسن صوت اور قوت بیان لیکچر میں کچھ اور ہی حسن پیدا کر دیتا۔

علامہ صاحب نے اپنی طالبات بیٹیوں کے لیے شرم و حیا کے جس معیار کو پسند کیا وہی اپنی صلیبی بیٹیوں کے لیے تھا۔ ان کی بیٹیاں باپردہ، خلیق اور حیا دار تھیں اور مشفق باپ سے ٹوٹ کر محبت کرتیں۔ یہ تمام باتیں آج کے اس ”ترقی یافتہ“ دور میں خواب و خیال لگتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نسبتاً اس وقت علم کی قدر تھی اور اہل علم کو عزت و وقار حاصل تھا۔ اہل علم کو بھی اپنے مقام اور نازک ذمہ داری کا ادراک تھا جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری توجہ دی جاتی۔



خادم اسلام - علامہ علاء الدین صدیقیؒ

پروفیسر ڈاکٹر محمد نواز چودھری ☆

استاذ محترم علامہ علاء الدین صدیقی رحمۃ اللہ علیہ جامع الصفات شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے زندگی بھر ملت اسلامیہ کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اسلام سے وابستگی اور دین حنیف کی لگن ہی ایسا مشغلہ تھا جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ میری نظر میں علامہ مرحوم کی زندگی قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ کی تفسیر ترجمان اور مصداق تھی:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ
إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ. (۳۱:۳۳)

(اور اس شخص کے قول سے اچھا قول اور کس کا ہوگا جس نے اللہ کی طرف دعوت دی اور نیک عمل کیا اور دھڑلے سے کہا کہ میں واقعی مسلمان ہوں)

آپ نے اپنی زندگی دعوت دین اور خدمت اسلام کے لیے وقف کر رکھی تھی اور یہ سن زندگی کے ہر مرحلہ اور مقام پر ان کے پیش نظر رہا۔ مسجد شاہ چراغ کا منبر ہو یا لائٹ آف اسلام کا پلیٹ فارم، اسلامیہ کالج یا پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی صدارت ہو یا سلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی، تحریک پاکستان کے لیے جدوجہد ہو یا استحکام پاکستان کی مساعی ہوں۔ آپ نے ہر حیثیت میں خدمت اسلام کا علم تھا مے رکھا اور ہر منصب کو تبلیغ دین کا ذریعہ بنایا۔ اس سفر میں بعض مشکل مقام بھی آئے لیکن آپ نے مشکل سے مشکل حالات حتیٰ کہ حکومت کے ایوانوں میں بھی کلمہ حق ادا کیا اور زندگی بھر ”مجھے ہے حکم ازاں لا الہ الا اللہ“ پر

استقامت سے عمل پیرا رہے۔

علامہ صاحب کی شخصیت قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج تھی۔ ایک طرف ایف سی کالج لاہور میں انگلش میڈیم میں تعلیم حاصل کی، پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس طرح آپ جدید علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ دوسری طرف آپ نے مشہور مفسر قرآن اور اپنے وقت کے جید عالم دین مولانا احمد علی لاہوریؒ سے علوم قرآنیہ کی تکمیل کی۔ پھر جامعہ ازہر مصر سے اسلامیات میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ علامہ مرحوم خود فرمایا کرتے تھے:

”اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ شرف بخشا ہے کہ میں نے اپنے وقت کے ایک بہترین عالم دین اور مفسر قرآن سے مسجد میں صف پر بیٹھ کر تفسیر کا درس لیا ہے۔“

اس طرح علامہ صاحب کو نہ صرف قدیم و جدید علوم کا کامل ادراک تھا بلکہ ان میں کمال حاصل تھا۔ جس کی وضاحت میں صرف دو مثالیں بیان کرتا ہوں۔ استاذ گرامی پروفیسر افتخار احمد حسن واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ علامہ صاحب کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ گورنر پنجاب کا فون آیا۔ گورنر صاحب نے علامہ صاحب کو بتایا کہ امریکہ سے ایک بہت بڑے سکالر آئے ہیں اور وہ ان (گورنر) کے مہمان ہیں۔ سکالر نے خواہش ظاہر کی کہ:

"I want to meet a typical cultural jigure of Lahore."

گورنر نے علامہ صاحب سے مزید کہا کہ میں نے بڑی نظر دوڑائی، سوچ بچار کی اور پھر فیصلہ کیا کہ آپ ہی وہ معیاری لاہوری کلچر کی شخصیت ہو سکتے ہیں جو اس سکالر کے معیار پر پورا اتر سکتے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اس امریکن سکالر کو آپ کے پاس بھیج دوں۔ علامہ صاحب نے جواب دیا ”ٹھیک ہے میری خدمات حاضر ہیں۔“

اب دوسری مثال سنئے! حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر سال حج پر تشریف لے جاتے تھے۔ اور اپنی عدم موجودگی میں ایسے شخص کو درس قرآن کا فریضہ سونپ

کر جاتے تھے جو نہ صرف درس قرآن دینے کا اہل ہوتا بلکہ مولانا کی خصوصیت اور اسلوب سے بھی آگاہ ہوتا۔ لہذا اکثر یہ قرعہ فال علامہ صاحب کے نام نکلتا۔ چنانچہ علامہ صاحب کے فرائض میں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن دینا بھی شامل تھا اور وہ مدرسہ قاسم العلوم میں یہ فریضہ باحسن طریق بجالاتے تھے۔

علامہ موصوف کو شدید احساس تھا کہ مسلمانوں کے دواہم تعلیمی ادارے علی گڑھ اور دیوبند عظیم مراکز تعلیم ہونے کے باوجود دو انتہاؤں کی علامت بن چکے ہیں۔ اور ان اداروں سے فارغ التحصیل فضلاء میں قدیم و جدید کا واضح فرق موجود ہے۔ اور یہ فاصلہ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ علامہ صاحب اس خلیج کو پاٹنا چاہتے تھے چنانچہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ایم اے اسلامیات میں ایسے علماء داخلہ لیں جو کالجوں کے گریجویٹ بھی ہوں اور دینی پس منظر بھی رکھتے ہوں۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ایم اے عربی اور درس نظامی سے فارغ طلباء کو ایم اے اسلامیات میں داخلہ لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ علاوہ ازیں شعبہ کے اساتذہ میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین سے استفادہ کرتے تھے۔ شعبہ علوم اسلامیہ میں پہلا اور افتاحی لیکچر مولانا احمد علی لاہوری سے دلایا گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر برہان الدین فاروقی، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا علم الدین سالک اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ جیسے کامل اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ آپ اپنے شاگردوں سے اکثر کہا کرتے تھے:

”یہی نہ کرنا کہ میرے مرنے کے بعد، تم لوگ مجھے احترام سے دفن کر کے آرام سے بیٹھ جاؤ بلکہ میرا ایک مشن اور مقصد زندگی ہے اسے نبھانے کی سعی کرنا۔ وہ مشن یہ ہے کہ علوم قدیم اور علوم جدید کے امتزاج سے علمائے دین پیدا کیے جائیں۔“

(یاد رفتگان نوائے وقت لاہور ۲۱ دسمبر ۱۹۷۷ء)

علامہ صاحب اپنے تلامذہ کو الوداعی خطاب میں یہ بھی تلقین کرتے تھے کہ تعلیمی اداوں میں اسلامیات کی تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے علاقے میں حلقہ ہائے درس قرآن بھی قائم کرنا اور کسی مسجد میں خطبہ جمعہ کے ذریعے عوام الناس میں اسلامی تعلیمات کی

اشاعت کرنا۔ علامہ صاحب علوم اسلامیہ کے پروفیسر کو متحرک، مبلغ دین اور معاشرہ کا فعال فرد دیکھنا چاہتے تھے۔

علامہ علاء الدین صدیقی اتحاد بین المسلمین کے نقیب اور عظیم داعی تھے۔ زندگی بھر وہ مسلمانوں میں اتحاد اور ملی یکجہتی کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ملت اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کے علم بردار کی حیثیت سے علامہ صاحب کا منفرد اور امتیازی مقام تھا۔ جون ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ لاہور میں خون ریز فرقہ وارانہ فسادات برپا ہوئے جو اہل پاکستان کے لیے بڑی آزمائش تھی۔ علامہ صاحب نے ایک محبت وطن اور درد مند پاکستانی کی طرح اس فتنہ کی ہولناکی کا بروقت ادراک کیا۔ علامہ صاحب ہر مکتبہ فکر کے نزدیک قابل احترام تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی جرأت، بے باکی اور عزم صمیم سے اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ لاہور بھائی دروازے کے اندر، جہاں فسادات ہوئے تھے، اسی جگہ جلسہ کا انتظام کیا۔

تمام فرقوں کے علماء کو جمع کیا اور بڑے مبلغ اور مؤثر انداز میں اتحاد بین المسلمین کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ”یہ فتنے اسلام اور پاکستان کے وجود کے منافی ہیں۔ ہم نے پاکستان اس لیے نہیں حاصل کیا تھا کہ یہاں پر فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم ہو اور بھائی بھائی گلا کاٹے، بلکہ پاکستان واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کی عملی تفسیر کے لیے حاصل کیا تھا۔“

علامہ صاحب عوام الناس کو ہمیشہ نہ صرف تحمل و برداشت، حلم و رواداری کی تلقین کرتے بلکہ خود اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت دیتے تھے۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک زمانہ میں علامہ علاء الدین کے استاد حضرت مولانا احمد علی کی مولانا مودودی سے چیقلش چل رہی تھی۔ مولانا احمد علی کے بعض عقیدت مندوں نے مولانا مودودی کے خلاف ایک اشتہار پر بعض علماء کے دستخط کرائے۔ اس سلسلہ میں وہ علامہ صاحب کے پاس ان کے گھر واقع مزنگ میں تشریف لائے اس وقت وہاں علامہ صاحب کے پاس فیصل آباد کے پروفیسر آغا بشیر احمد بھی موجود تھے۔ پروفیسر آغا بشیر کا بیان ہے کہ جب ان لوگوں نے علامہ موصوف سے بھی اس اشتہار پر دستخط لینے چاہے تو علامہ صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ ”اگر آپ لوگ مجھ سے کسی اتحاد کی اپیل پر دستخط کرانا چاہتے ہیں تو بندہ حاضر ہے۔“

آپ نے طلباء کو بھی، جب وہ اپنی تدریس کامل کر کے، یونیورسٹی سے جانے لگتے، ہمیشہ تاکید اور تلقین فرماتے کہ تم لوگ کہیں نہ کہیں، اب پروفیسر بن کے جاؤ گے، تمہارے ہاتھوں میں نئی نسل کا مستقبل ہے اس نسل کو فروغی مسائل اور فرقہ واریت سے بلند کرنے کی کوشش کرنا اور یہی دین اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ چنانچہ علامہ صاحب کی اس شعوری تبلیغی مساعی نیز ان کی سحر انگیز شخصیت کا اعجاز تھا کہ جس شخص نے چند روز بھی علامہ صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا وہ کبھی فرقہ واریت کا شکار نہیں ہوا۔ بلکہ جس تعلیمی ادارے میں تدریسی فرائض انجام دیتے، وہاں ملی تقاضوں کے مطابق فقہی مسلک سے بالا ہو کر، اسلام کی آفاقی اور اساسی تعلیمات کا ہی ترجمان رہا ہے۔ راقم الحروف کو اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا کہ جب جنرل ضیاء الحق مرحوم نے درس نظامی کی سند کو ایم اے اسلامیات کے مساوی قرار دیا اور اس فیصلے کے مطابق بعض لوگوں کو کالجوں میں اسلامیات کے لیکچرر متعین کیا گیا تو انہوں نے اپنے اپنے مسلک پر زور دیا اور اصرار کیا۔ طلباء کو فروغی مسائل میں الجھانے کی کوشش کی اور فرقہ واریت کو ہوادینی شروع کر دی۔ اس تلخ تجربہ سے علامہ مرحوم کی عظیم خدمات کا احساس ہوا۔ الحمد للہ! پنجاب یونیورسٹی کا شعبہ اسلامیات اب بھی علامہ صاحب کی اس اچھی روایت کو اپنائے ہوئے ہے۔

قبلہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے لیکچرز کے دوران جدید اور عصری مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا کرتے تھے اور اس میں اپنی رائے اور تحقیق بغیر لومۃ لائم بڑی حکمت سے بیان کرتے تھے اور بعض اوقات بڑی خوبصورت مثالوں سے زیر بحث مسئلہ کی وضاحت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن آل عمران کی آیت نمبر ۳۰ زیر بحث تھی جس میں ”لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً“ یعنی کئی گنا بڑھا کر سود نہ کھاؤ کا حکم ہے اس پر ایک طالب علم نے سوال کیا۔ ”علامہ صاحب! اس آیت سے تو غلام احمد پر دیز اور ڈاکٹر فضل الرحمن جیسے متجددین کے موقف کی تائید ہوتی ہے جو سود مفرد کو حرام نہیں ٹھہراتے۔“ علامہ صاحب نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ فہم قرآن کے لیے ضروری ہے کہ ایک موضوع پر جملہ آیات قرآنیہ اور احکام کی روشنی میں حکم لگایا جائے۔ مذکورہ آیت کو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۸ اور ۲۷۹ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے

تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کا سود حرام ہے اس طرح متجددین کے موقف کی کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے۔ پھر فرمایا: متجددین کا المیہ یہ ہے کہ وہ مغربی افکار سے ذہنی طور پر مرعوب ہیں پہلے وہ ایک موقف قائم کرتے ہیں پھر اس کا استشہاد قرآن سے ڈھونڈتے اور اگر انہیں قرآن میں تحریف و تاویل ہی کرنی پڑے تو کر ڈالتے ہیں:

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

(اقبال)

علامہ صاحب نے مزید فرمایا: یہ اسلام کے نادان دوست ہیں جن کی مثال اس بڑھیا کی ہے جس کی جھولی میں ایک طوطا آگرا۔ بڑھیا نے اسے پکڑا، اس پر ترس کھایا۔ اس کے چونچ، ناخن اور پروں کو بڑھے ہوئے دیکھا تو ہمدردی سے قینچی پکڑی اور اس کی بظاہر بڑھی ہوئی چونچ، بال اور ناخن کاٹ دیئے۔ بیچارہ طوطا اڑنے سے معذور ہو گیا۔ اسی طرح ہمارے متجددین، اسلام کو ماڈرن بنانے کے شوق میں اس کی خوب حجامت بناتے ہیں اور اس کا فطری حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔ اس مثال سے کلاس خوب محفوظ ہوئی اور مسئلہ کی نوعیت بھی سمجھ میں آ گئی۔ اسی طرح ایک دن علامہ مرحوم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور اصول تفسیر کی کتاب الفوز الکبیر کے حوالے سے ”ناسخ و منسوخ“ پر لیکچر دے رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک صرف پانچ آیات قرآنی منسوخ ہیں۔ جن میں ایک آیت، آیت وصیت ہے۔ علامہ صاحب نے فرمایا ”قرآن مجید تا قیامت ضابطہ حیات ہے اس لیے قرآن مجید میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ مثلاً اس آیت وصیت ہی کو لیجئے کہ مولانا عبید اللہ سندھی اس کو منسوخ تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا عبید اللہ سندھی بہت بڑے عالم دین تھے اور وہ مولانا احمد علی لاہوری کے استاذ تھے۔ علامہ مرحوم نے مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ مولانا سندھی آیت وصیت کو منسوخ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مولانا کی والدہ غیر مسلم تھی اور بدستور اپنے قدیم مذہب، ہندومت پر قائم تھی۔ مولانا سندھی فرمایا کرتے تھے کہ آیت وصیت میرے حق میں تو منسوخ نہیں ہے کہ غیر مسلم اور مسلم کی باہم وراثت نہیں ہوتی۔ آیت کا ظاہری حکم یہی ہے کہ اگر میں

فوت ہو جاؤں تو میری غیر مسلم ماں کو وراثت نہیں ملے گی۔ لہذا میں اپنی غیر مسلم ماں کے حق میں وصیت کر سکتا ہوں پس آیت وصیت منسوخ نہ ہوئی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایف سی کالج لاہور میں پڑھایا کرتے تھے وہ علامہ علاؤ الدین صدیقی کے بھی استاد ہیں۔ وہ جید عالم اور فاضل استاد تھے۔ تقابل ادیان میں انہیں خصوصی مہارت تھی۔ علامہ صاحب کی تقابل ادیان میں دلچسپی اور شوق اپنے استاذ چشتی صاحب کا مرہون منت تھا۔ راقم الحروف کو بھی یوسف سلیم چشتی سے متعدد لیکچرز، تقابل ادیان پر سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ واقعی مذاہب عالم پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ چنانچہ علامہ صاحب اپنے تلامذہ کو بتایا کرتے تھے کہ انہیں مطالعہ مذاہب عالم کا ذوق پروفیسر یوسف سلیم چشتی سے پیدا ہوا تھا۔ ایم اے اسلامیات کے نصاب میں ”تقابل ادیان“ کا پرچہ شامل کرنے کا سہرا علامہ صاحب کے سر ہے۔ آپ کی مساعی سے ”مذاہب کا تقابلی مطالعہ“ کا پرچہ پنجاب یونیورسٹی میں متعارف کرایا گیا۔ بعد ازیں یہ پرچہ دیگر جامعات میں بھی پڑھایا جانے لگا۔ اس طرح علامہ صاحب کی فکری اختراع علمی اثاثہ میں اضافہ کا محرک ثابت ہوئی۔ ہمارے درس نظامی میں مختلف فقہی مسلک کا مطالعہ تو تدریس میں شامل تھا اور غلو کی حد تک اپنے اپنے فقہی مسلک سے شدید تمسک کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ ہمارے علماء نے اپنی بیش بہا علمی توانائیاں اپنے فقہی مسلک کے حق ہونے میں صرف کر دیں حتیٰ کہ بعض اوقات مسلک میں یہ غلو اور بے اعتدالی ملت کے افتراق کا سبب بنی۔ لیکن ہمارے دینی مدارس میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کا کوئی باقاعدہ پرچہ نہ تھا اس ضمن میں اولیت کا شرف علامہ مرحوم کے حصہ میں آیا۔ الفضل للمتقدم اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مسلکی عصبیت میں کمی آئی۔ دوسرے پنجاب یونیورسٹی میں علامہ صاحب نے مذاہب عالم پر کتب کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کر دیا جو کسی اور دانش گاہ میں دستیاب نہیں۔

علامہ صاحب تقابل ادیان کے موضوع پر شائع ہونے والی ہر نئی کتاب کو بڑے اہتمام سے خریدتے اور بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اپنے اس علمی شغل کی بنا پر آپ بیرون پاکستان بھی جاتے تھے۔ مسیحیت، یہودیت، ہندومت اور دوسرے مذاہب پر آپ بڑی گہری

نظر رکھتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام تمام انبیاء کا مذہب تھا ان کی امتیں مسلم تھیں اس اعتبار سے جہاں کہیں صداقت موجود ہے وہ اسلام ہے۔ پھر اسلام کا ریکارڈ قرآن اور سیرت رسول کی شکل میں محفوظ ہے۔ صرف اسلام ہی ایک متحرک اور انقلابی دین ہے جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی پوری صلاحیت ہے۔ اسلام کی تعلیمات مساوات، اخوت، شرف انسانی اور بے لاگ عدل، بنی نوع انسان کے لیے حیات نو کا پیغام ہے۔ جس کی پوری انسانیت پیاسی ہے۔ باقی مذاہب میں تخلیق انسانی کے تصور میں گناہ کی آمیزش ہے یعنی انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور وہ زندگی بھر اس گناہ کی آلودگی کی تپہیر میں سرگرداں رہتا ہے جبکہ اسلام کے مطابق ہر انسان کی تخلیق فطرت سلیمہ پر ہوئی ہے اور وہ خدا کا نائب ہے جس کا فریضہ اس کائنات کی تعمیر ہے۔ اسلام کا پیروکار چوروں کی طرح چھپتا نہیں پھرتا بلکہ آگے بڑھ کر زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور زندگی کو امن و سکون اور آسودگی عطا کرتا ہے۔ جس کا متلاشی آج کا ہر انسان ہے۔ علامہ صاحب کو دیار مغرب میں بھی جانے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا:

”الحمد للہ! موجودہ دور میں مسلمان مفکرین نے مغربی افکار اور نظریات کے رد میں کافی لکھا ہے اور آج کل یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے مختلف وفد اور مشن سرگرم عمل ہیں اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اشاعت اسلام کا کام کر رہے ہیں۔ ان کے آئے دن عیسائی پادریوں سے مناظرے اور مجادلے ہوتے رہتے ہیں۔ براعظم افریقہ تو ہلال و صلیب کی فیصلہ کن رزم گاہ بنا ہوا ہے جہاں عیسائیت مسلسل پسپا ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ اسلام فتح یاب ہوگا اور یہ براعظم اسلام کا مرکز بنے گا۔“

ہوتا ہے جادہ پیاں پھر کارواں ہمارا

الغرض علامہ علاؤ الدین صدیقی کی شخصیت میں قدیم اساتذہ کے کمالات جمع تھے۔ وضع داری، قادر الکلامی، شگفتہ بیانی، گھن گرج، گفتار و کردار میں موافقت، علم سے لگن، مشن میں لگن، درد مند دل، طبیعت میں سادگی اور نفاست آپ کے نمایاں امتیازات تھے۔ جنہوں نے

آپ کو انتہائی ہر دلعزیز بنا دیا تھا کہ آپ کی رحلت کے بعد بھی ہزاروں افراد خلوص دل سے آپ کی دینی، علمی اور ملی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ آپ اپنے پیچھے ایک فوج ظفر موج تلامذہ کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں جو پورے پاکستان میں اسلامی تعلیمات کی تدریس انجام دے رہے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ علامہ مرحوم کا مشن ”دعوت دین اور اشاعت اسلام“ کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور ان کی تعلیمات کو عام کریں۔ اس امر سے مسرت اور طمانیت ہوتی ہے کہ شعبہ علوم اسلامیہ کی موجودہ چیئر پرسن ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ علامہ صاحب کی تعلیمات کو عام کرنے کی تڑپ رکھتی ہیں اور حتی المقدور اس کے لیے کوشاں ہیں ہم سب کو ان سے بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔

وما توفیقی الا باللہ العظیم!!



علامہ علاء الدین صدیقی کا تحریری سرمایہ

☆ ڈاکٹر قاری محمد طاہر ☆

علامہ علاء الدین صدیقی نے اپنے شعور کی آنکھ ایسے دور میں کھولی کہ جب پورے برصغیر میں آزادی کی مختلف تحریکیں برپا تھیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی ٹرپ اور ملک و قوم کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ عروج پر تھا۔ مسلمان لیڈر اپنی زبان و بیان سے اہل ہند کے دلوں میں قوت متحرکہ کو بیدار کر رہے تھے اور ان کی آواز استعماری طاقتوں کے لیے قوت محرقہ ثابت ہو رہی تھی۔ یہ وہ دور ہے جب کہ پورے ہندوستان میں مجلس احرار کے شعلہ بیاں خطیبوں کا غلغلہ تھا۔ جن کے سامنے کوئی بھی مقرر بولنے اور ٹھہرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس جماعت کے سرخیل تھے جن کی خطابت کی دھوم دور دور تک تھی اور بطور ضرب المثل بیان کی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی شخصیات بھی تھیں جو زبان کی بجائے قلم کو تھامے ہوئے تھیں۔ ان کے نزدیک قلمی جہاد ایک مؤثر ہتھیار تھا جس کے ذریعہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا کام لیا جاسکتا تھا۔ ان حضرات میں چودھری افضل حق، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے نابغہ عصر حضرات شامل ہیں۔

علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم کا جذبہ جوان ہوا تو آپ بھی برصغیر کے معروضی حالات سے متاثر ہوئے۔ ملک میں کام کرنے والی تمام تحریکوں کا بغور جائزہ لیا۔ اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو قومی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ آپ زبان اور قلم دونوں کی اہمیت کے شناسا تھے۔ اس لیے آپ نے قومی خدمت کے جذبہ کے تحت زبان سے بھی کام لیا اور قلم بھی تھاما۔ آپ کو معلوم تھا کہ زبان سے نکلی باتیں وقتی اثر رکھتی ہیں اور ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں جبکہ قلم

☆ مدیر ماہنامہ التجوید، فیصل آباد

سے نکلی تحریر کا اثر دیر پا اور مستقل ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں علامہ مرحوم کا تعارف علمی حلقوں میں ایک شعلہ نوا اور شیریں بیان مقرر اور صاحب طرز خطیب کی حیثیت ہی سے ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرحوم نے احیاء اسلام کے لیے محض زبان ہی سے کام لیا اور قلم سے مدد نہ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے قلم اور زبان دونوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ہاں یہ بات درست ہے کہ آپ کا تمام قلمی کام طباعت کے مراحل طے کر کے عام و خاص تک نہ پہنچ سکا۔ جس کی وجہ سے یہ تاثر عام ہوا کہ مرحوم تقریر کے آدمی ہیں، تحریر کے نہیں۔ اس مضمون میں ہم نے علامہ مرحوم کی قلمی کاوشوں ہی کو موضوع بنایا ہے۔ اور علامہ مرحوم کی قلمی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرحوم کی قلمی خدمات دو قسم کی ہیں۔ ایک مطبوعہ دوسرے غیر مطبوعہ۔

مطبوعہ کتب:

۱. سوانح حیات مخدوم علی ہجویریؒ

آپ کی مطبوعہ تحریروں میں ایک کتاب سوانح حیات مخدوم علی ہجویریؒ کے نام سے ہے۔ جسے آپ نے ۱۳ صفر ۱۳۵۴ھ کو مکمل کیا۔ یہ کتاب گیلانی پریس لاہور سے باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر کے شائع ہوئی۔ تاریخ تصنیف پر نظر کی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ آپ کی پہلی قلمی کاوش ہے جو یورطبع سے آراستہ ہو کر منصفہ شہود پر آئی۔ کتابت بہت خوبصورت ہے جو شاہ محمد خوشنویس مسجد وزیر خاں لاہور کے خامہ اثر کا نتیجہ ہے۔ سرورق اس طرح ہے:

شروع میں قرآنی آیت الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون قدرے گولائی میں تحریر ہے۔ اس کے نیچے جلی حروف میں سوانح حیات لکھا ہے۔ نیچے یہ الفاظ ہیں۔

”حضرت شمس العارفین سراج السالکین واقف رموز شریعت عالم اسرار طریقت مظہر انوار حقیقت قدوة الصوفیاء زبدة الاولیاء“۔ یہاں تک عبارت باریک قلم سے اس کے نیچے جلی

حروف میں مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ معروف بہ حضرت داتا گنج بخش لاہوری کے الفاظ مندرج ہیں۔ آخر میں مؤلفہ محمد علاء الدین صدیقی ایم۔ اے کے الفاظ تحریر ہیں۔

آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم اور حمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ اور سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۰ رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا لکھی گئی ہے۔ اور اس کے نیچے فارسی کے دو اشعار مندرج ہیں:

بنام آنکہ جاں رانکرت آموخت
چراغ دل بنور جاں بر افروخت
ز فضلش ہر دو عالم گشت روشن
ز نبضش خاک آدم گشت گلشن

شروع کے چند صفحات میں تمہیدی باتیں ہیں جن میں کتاب لکھنے کی غرض و غایت کو بیان کیا گیا ہے۔ جس کے ایک ایک لفظ سے اسلام کے ساتھ محبت و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے نیز تصوف کی طرف آپ کے میلان کا پتہ بھی چلتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

”حاملان قرآن میں ابتداء سے دو گروہ چلے آتے ہیں ایک ان بزرگان دین کا جنہوں نے تبلیغ اسلام کا ذریعہ نظر و استدلال کو قرار دیا اور علوم ظاہری سے خدمت اسلام کرنے کو مقصد حیات ٹھہرایا اور شریعت کے محاسن ظاہری کو پیش کر کے طالبان ہدایت کی راہ نمائی کی۔ یہ طبقہ علماء و فضلاء کے نام سے موسوم ہوا۔ دوسرا گروہ ان عاشقان حق کا ہے جنہوں نے کشف و شہود کی وساطت سے معرفت الہی کے حاصل کرنے کی کوشش کی اور تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس کے ذریعہ سے گم گشتگان وادی ضلالت کو صراط مستقیم تک پہنچایا۔ اس جماعت کا نام جماعت صوفیاء یا اولیاء ہوا۔ ہر دو گروہ خادم اسلام ہیں اور واجب الاحترام۔ دونوں کے راستے بظاہر مختلف ہیں لیکن منزل مقصود درحقیقت

ایک ہے۔ ہادی برحق محبوب کبریا ﷺ ہر دو قافلوں کے سالار ہیں۔
شریعت اور طریقت آپ ہی کے قول و فعل کا نام ہے۔ تمام علوم ظاہری
اور باطنی کا منبع آپ ہی کی ذات اطہر ہے۔

یہ پوری بحث پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ آخر میں علامہ مرحوم اس انکساری کا اظہار فرماتے
ہیں جو اہل علم کا خاصہ ہوتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

”حضرت داتا صاحبؒ جیسے راہ نمائے طریقت کے سوانح حیات اس چیز کا تقاضا کرتے تھے کہ
کوئی مجھ سے بہتر شخص ان پر قلم اٹھاتا میری خامیاں اور کمزوریاں میری جرأت کے ہاتھوں کو
روکتی ہیں۔ میری سیاہ کاری اور خطا ورزی جنبش قلم کی راہ میں حائل ہے۔ لیکن کیا کروں دل کہتا
ہے کہ اس کار خیر کو جلد توجہ سرکار کا وسیلہ بنا۔ کیا عجب ہے کہ اس دربار کی رسائی تیرے لیے
ابواب رحمت الہی کو وا کر دے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیا کنند

آیا بود کہ گوشہ چشمتے بما کنند

لہذا زبان قلم کی بے ساختہ پکار ہے کہ:

بر آستان تو ہر کس رسید مطلب یافت

دوامدار کہ من نا امید برگردم

اس اقتباس اور کتاب کے کئی اور مقامات پر دیے گئے مباحث سے علامہ مرحوم کے میلان الی
التصوف کا پتہ چلتا ہے۔ اور ساتھ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ میول الی التصوف کے
باوجود شریعت کی اہمیت و ضرورت کے شدت سے قائل ہیں۔ آپ کا تعلق ایسے صوفیاء سے
نہیں جو قال کو حال پر ترجیح دیں یا شریعت کی پابندیوں سے آزاد طریقت کے قائل ہوں۔
کیوں کہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد طریقت جہل ہے اور ضلالت کی طرف لے کر چلتی
ہے۔ جبکہ شریعت کی پابند طریقت انسان کو عملی اور روحانی عرفان عطا کرنے کی ضامن ہے۔

کتاب کے پہلے باب کا عنوان تصوف اسلام ہے۔ جس کے ذیلی عنوانات یہ ہیں:
تصوف کی ابتداء۔ صحابہ کو کیوں صوفی نہیں کیا گیا۔ تصوف اور صوفی کی وجہ تسمیہ۔ تصوف صوفی

کی امتیازی خصوصیات۔ اقوال صوفیاء دربارہ اتباع شریعت۔ مدارج اہل تصوف۔

ان عنوانات کے تحت علامہ مرحوم نے شریعت و طریقت کے تلازم کو خوب واضح کیا ہے۔ جس سے ہماری مذکور الصدر بات کی مزید تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ صوفیہ کی امتیازی خصوصیات کے عنوان کے تحت تین باتوں کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں جس کے لیے انہوں نے تصوف کی شہرہ آفاق کتاب ”کتاب اللمع“ کا حوالہ دیا ہے۔ وہ تین خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ ان کی توحید بالکل خالص ہوتی ہے۔ غیر اللہ کے خیال تک کو بھی اس میں دخل نہیں ہوتا۔ ان کا مقصود و مطلوب تمام تر خدا ہی ہوتا ہے۔

۲۔ قناعت کو اپنا پیشہ بناتے ہیں۔ قلیل کو کثیر پر ترجیح دیتے ہیں۔ بجائے جاہ و ترفع کے تواضع و انکسار کو پسند کرتے ہیں۔

۳۔ خدا سے حسن ظن رکھتے ہیں۔ نیکیوں اور طاعتوں کی جانب خلوص نیت کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہیں۔ بلا پر صابر اور قضا پر راضی ہوتے ہیں۔ مجاہدہ اور مخالفت نفس میں مشغول رہتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے باب کا موضوع سوانح حیات ہے جس کو درج ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے۔

اسم گرامی اور وطن۔ والدین۔ شجرہ نسب۔ بیعت۔ کرامت شیخ۔ وصیت شیخ۔ ہم عصر مشائخ۔ درس و اعجاز و انکسار۔ گفتگو دربارہ سماع۔ مذہب استعداد علمی۔ تصانیف۔ کشف المحجوب۔ عجز و تحمل۔ سیر و سیاحت۔ ورود لاہور۔ سندھ و رود لاہور۔ قیام لاہور اور بنائے مسجد۔ ازواج۔ سال وصال۔ مزار پرانوار۔ طہرت سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری۔ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر۔ خدام درگاہ۔ عرس شریف۔

مندرجہ بالا عنوانات کے تحت علامہ مرحوم نے بہت اہم بحثیں کی ہیں۔ جو اہل علم کے لیے خاصہ کی چیزیں ہیں۔ یہاں دیگر علمی بحثوں کو چھوڑتے ہوئے ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے جس سے علامہ مرحوم کے تحقیق رسا دین کا پتہ چلتا ہے۔ مخدوم علی ہجویری کے بارے میں عموماً ان کی ایک تصنیف کشف المحجوب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن علامہ

مرحوم نے ان کی تصانیف کی تعداد نو بتلائی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں کہ:

”اس قدر یقینی ہے کہ علی ہجویری نے تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں لیکن آج تصانیف کا وجود تو الگ رہا ان کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیاء اس سے زائد نہ لکھ سکے کہ حضرت سید پیر علی ہجویریؒ را تصانیف بسیار است۔ البتہ خود کشف المحجوب میں مصنف کے حوالوں کو یکجا کرنے سے تصانیف ذیل کا پتہ چلتا ہے۔

- ۱۔ کشف المحجوب ۲۔ دیوان
- ۳۔ منہاج الدین ۴۔ کتاب القضاء والبقاء
- ۵۔ اسرار الخرق والمؤدات ۶۔ کتاب البیان لاہل العیان
- ۷۔ بحر القلوب ۸۔ الرعایت لحقوق اللہ
- ۹۔ کشف الاسرار

اسی طرح علامہ مرحوم نے ایک مشہور واقعہ کی جرح تعدیل کا عنوان بنایا ہے اور تحقیق کے بعد محتاط انداز سے اپنی رائے ظاہر کی ہے وہ واقعہ یہ ہے:

”حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کے حوالے سے کتاب فوائد الفواد میں امیر حسن سنجریؒ فرماتے ہیں کہ شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری ایک پیر کے مرید تھے۔ حسین زنجانی ایک عرصہ سے لاہور میں قیام پذیر تھے۔ مرشد نے خواجہ علی ہجویری کو حکم دیا کہ تم لاہور جا کر سکونت اختیار کرو۔ علی ہجویری نے عرض کی کہ شیخ حسین زنجانی وہاں مقیم ہیں۔ فرمانے لگے کہ بس تم وہاں چلے جاؤ۔ مرشد کا حکم تھا۔ علی ہجویریؒ نے رخت سفر باندھا اور لاہور کی طرف چل دیے۔ جب لاہور پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ صبح ہوئی تو دیکھا کہ شیخ حسین زنجانی کا جنازہ لوگ لیے جا رہے ہیں۔ یعنی آپ کے ورود کی رات ہی شیخ حسین زنجانی رحلت کر گئے۔ اس سے علی

ہجویریؒ کو حکم مرشد کی حقیقت کا علم ہوا۔“

علامہ مرحوم کا ذہن تحقیقی ہے۔ وہ اس روایت کا تذکرہ کرنے کے بعد سید حسین زنجانی کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

”باوجود بڑی جستجو کے حضرت سید حسین زنجانی کے حالات کسی کتاب سے نہیں مل سکے۔ خزینۃ الاصفیاء اور حدیقۃ الاولیاء میں صرف اتنا درج ہے کہ آپ لاہور کے قدماے مشائخ میں سے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور صاحب کرامات و خوارق تھے۔ بیعت سلسلہ عالیہ جنیدیہ میں تھی حضرت سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کے ہمراہ لاہور تشریف لائے تھے۔ سنہ وفات ۶۰۰ھ ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن حضرت حسین زنجانی کا ذکر حضرت سلطان المشائخ کی زبانی حضرت داتا صاحب کے تعلق میں ہوا ان کی وفات اسی روایت کے مطابق ۴۱۰ھ میں ہونی چاہیے تھی۔ کیونکہ یہ حضرت داتا صاحبؒ کے ورود لاہور کا سن ہے۔ پس یا تو یہ حسین زنجانی کوئی اور بزرگ ہیں یا سال وصال غلط ہے۔ لیکن سن غلط معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ مخدوم صدر دیوانؒ کا جنہیں آپ کا ہم عصر بتایا جاتا ہے یہی زمانہ تھا۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت داتا صاحبؒ جن کی جگہ پر لاہور کی مسند روحانی پر متمکن ہوئے تھے ان کا کچھ اور نام ہو اگرچہ اکثر تذکروں میں یہی اسم درج ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔“

علامہ صاحبؒ کے اس اقتباس سے ایک تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ ہر قدیم روایت کو بلا تحقیق عقلی قبول نہیں کرتے۔ اس کو جرح و تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اور پھر اپنی رائے کا بھی اظہار فرماتے ہیں جو تحقیق کا اہم حصہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ علامہ مرحوم کسی طور پر احترام بزرگان کا دامن نہیں چھوڑتے۔ آپ مذکور الصدر یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے۔

”پس یا تو یہ حسین زنجانی کوئی اور بزرگ ہیں یا سال وصال غلط ہے۔“

حالانکہ ایک تیسری صورت بھی ممکن تھی۔ وہ یہ کہ ممکن وہ روایت ہی غلط ہو جس میں کہا گیا کہ علی ہجویریؒ کے ورود لاہور کے وقت شیخ سید زنجانی کا جنازہ اٹھا۔ جس کی وجہ سے مرشد نے آپ کو اس خالی مسند پر متمکن ہونے کا اشارہ فرمایا۔ اس امکان کا تذکرہ نہ کرنا دراصل علامہ صاحب کی اس طبیعت کا خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ یہ ان کے کمال ادب کی علامت ہے۔

علامہ مرحوم اچھے اشعار کو پسند فرماتے تھے اور موقعہ و محل کی مناسبت سے شعر کا انتخاب بطور استدلال ان کی طبیعت کا حصہ تھا۔ جس سے ان کی تقریر بہت باوزن ہو جاتی اور سننے والے کے دل میں گھر کر جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ آپ خود بھی شعر کہتے تھے جس کا ثبوت مذکورہ کتاب ہی سے ملتا ہے۔ علی ہجویریؒ کے سال وصال کے حوالے سے مختلف آراء کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں چار اقوال بیان کیے ہیں۔ اور مزار پر لکھے گئے اشعار سے بھی تاریخ وصال کا تذکرہ کیا ہے۔ ان تمام اقوال و اشعار کے بعد آپ نے ایک اپنا شعر بھی لکھا ہے جس سے حضرت ہجویریؒ کا سال وصال اعداد کی شکل میں نکالا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

”مسکین مؤلف نے سال وصال یوں عرض کیا ہے:

مخدوم گنج بخش از عشاق فخر آدم
سرچشمہ ہڈی و محبوب رب عالم
صدیقی از سروش غیبی شنید دلش
سال وصال حضرت مجموعہٴ مکارم ۴۶۵ھ

ترجمہ: مخدوم گنج بخش اولاد آدم کے لیے باعث فخر اور عشاق میں سے ہیں۔ اور ہدایت ہ سرچشمہ اور اللہ رب العالمین کے محبوب ہیں۔ آج رات صدیقی نے ایک غیبی آواز سے یوں سنا کہ حضرت کا سال وصال ”مجموعہٴ مکارم“ ہے (اچھے اخلاق کا مجموعہ) مجموعہٴ مکارم کے حروف کو جمع کریں تو ۴۶۵ھ بنتا ہے۔

علامہ صاحب مرحوم کے مذکورہ شعر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مرحوم کو شعر گوئی کا

پورا ملکہ اللہ نے عطا کیا تھا۔ ظاہر ہے جو شخص فارسی میں شعر گوئی کی قدرت رکھتا ہو وہ اردو میں شعر کہنے کی صلاحیت سے کہیں زیادہ کمال رکھتا ہوگا۔ علامہ مرحوم کی شعر گوئی ایک مستقل عنوان ہے ممکن ہے ان کے کتابی ورثہ اور قلمی پس ماندہ ذخیرہ میں اس حوالہ سے کچھ گہر نایاب تلاش ہو سکیں۔ یہ عنوان اہل علم اور ان کے شعری ذوق رکھنے والے تلامذہ سے تعبیر و تکمیل کا تقاضا کرتا ہے۔

کتاب کے آخر میں لکھی گئی عبارت علامہ مرحوم کی فطری تواضع اور انکساری طبع کا ثبوت ہے۔ آپ معذرت و شکریہ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

”اپنی خامیوں کو دیکھتے ہوئے اپنی جرأت و جسارت پر نادم ہوں اور طالب معافی ناظرین سے چشم پوشی اور عفو کوشی کی درخواست کرتا ہوں۔
خدائے تعالیٰ میری غلطیوں کو معاف کرے۔ مجھے برائیوں سے بچائے
اور نیکیوں کی توفیق دے۔ اے خدائے وہاب میرے قال کو حال کر
دے۔ مسکین۔ صدیقی“

۲۔ اسباق الترجمہ فارسی:

علامہ علاؤ الدین صدیقی فارسی کے استاد تھے۔ انہوں نے طلباء کے لیے اسباق الترجمہ فارسی کے عنوان سے کتاب لکھی جس کے مطبوعہ دو حصے ہمیں دستیاب ہوئے۔ حصہ اول کے سرورق پر یہ الفاظ مطبوع ہیں:-

اسباق الترجمہ فارسی

حصہ اول

برائے مڈل

ایم علاؤ الدین صدیقی

پروفیسر مسلم ہاشمی

ایسٹرن بک سٹال اردو بازار لاہور، قیمت بارہ آنے

اسی ٹائٹل صفحے پر 1956 بھی مہر کی شکل میں موجود ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب

1956 میں شائع ہوئی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اسباق الترجمہ فارسی حصہ دوم کا سرورق اس کی نفی کرتا ہے۔

اسباق الترجمہ فارسی حصہ دوم کا سرورق اس طرح ہے:

جدید ایڈیشن مکمل

اسباق الترجمہ فارسی

علاؤ الدین صدیقی

ایسٹرن بک شال موہن لال روڈ لاہور

یعنی اس حصہ دوم کے سرورق پر پروفیسر مسلم ہاشمی کا نام نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قلمی کاوش اکیلے علامہ مرحوم کی ہے۔ سرورق کے بعد اگلے صفحہ پر دیباچہ طبع چہارم لکھا ہے۔ جو دو صفحات پر مشتمل ہے اور سارے کا سارا علامہ مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ طبع چہارم کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذکورہ کتاب کے کم از کم چار ایڈیشن تو ضرور شائع ہوئے۔ ممکن ہے بعد میں بھی کچھ ایڈیشن نکلے ہوں لیکن اس بارے میں قیاس اور ظن سے ہی کام لیا جاسکتا ہے۔ دیباچہ طبع چہارم میں آپ لکھتے ہیں:

”اسباق الترجمہ فارسی کی وجہ تالیف و غرض اشاعت پر اس کے حصہ اول

کے دیباچہ میں روشنی ڈال چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ حصہ اول

چونکہ ابتدائی جماعتوں کے لیے تھا۔ اس لیے اس میں صرف وہی باتیں

لکھی گئی ہیں جو ابتدائی مشقوں سے متعلق ہیں۔ اب ہم حصہ دوم کا نیا

ایڈیشن زور اشاعت سے مزین کر کے منظر عام پر لا رہے ہیں۔“

اس تحریر کے بعد موجودہ ایڈیشن کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر ہے۔ اور دیباچے

کے آخر میں محمد علاؤ الدین صدیقی مندرج ہے اور اس کے نیچے لاہور یکم اپریل ۱۹۴۶ء لکھا

ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۴۶ء میں یعنی تشکیل پاکستان سے ایک سال قبل اس کتاب کا

چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ مرحوم تحریک آزادی

اور مسلم لیگ میں رہتے ہوئے جلسے جلوسوں کی سیاست کے ساتھ ساتھ قلم کی دنیا سے بھی منسلک

رہے۔ جب چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تو پہلے تین ایڈیشن کم از کم تین برس پہلے تو ضرور شائع ہوئے ہوں گے۔ اسباق ترجمہ کا حصہ اول 80 صفحات پر مشتمل ہے جبکہ حصہ دوم کے صفحات 248 ہیں۔

یہ وہ قلمی مطبوعہ مواد ہے جس تک ہماری رسائی ممکن ہو سکی۔ جس تک ہماری رسائی ممکن نہ ہوئی اس کے بارے کچھ کہنا مناسب نہیں۔ البتہ اتنی بات ظنی طور پر ضرور کہی جاسکتی ہے کہ جو شخص ۱۹۳۴ء سے قلمی خدمت سرانجام دے رہا ہو اس کی ۱۹۵۶ء تک مطبوعہ کتب دستیاب ہو جائیں تو درمیانی عرصہ میں بھی لازماً اس کے قلم سے کتب نکلی ہوں گی جو مردِ ایم سے عدم کا شکار ہو گئی ہوں۔ ممکن ہے پرانے ذخیرہ کتب میں ان کا کچھ سراغ مل سکے۔

۳۔ The Light of Islam

علامہ مرحوم مدت العمر مسجد شاہ چراغ میں جمعہ کی نماز کے وقت خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد سے ملحق کمرے میں ایک نشست ہوتی تھی۔ جس میں لاہور کے اہل علم اور اہل فکر بھی شرکت کرتے تھے۔ مختلف علمی و سیاسی موضوعات پر بحث چلتی تھی۔ راقم کو خود اس نشست ہی میں بڑے بڑے اہل علم کو دیکھنے اور حلقے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس نشست کے حوالے معلومات بھی مستقل موضوع ہے۔ تاہم علامہ مرحوم نے یہاں ایک علمی انجمن قائم کی تھی جس کے تحت ایک ماہوار رسالہ The Light of Islam انگریزی زبان میں جاری کیا۔ اس ماہنامے کے مدیر آپ تھے اور ادارہ یہ تحریر فرماتے جو بڑا علمی اور جاندار ہوتا تھا۔ یہ تمام ادارے The Light of Islam کی فائلوں میں مطبوعہ موجود ہیں۔ جن کو اگر جمع کیا جائے تو مختلف موضوعات پر ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہوگا کہ علامہ مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے ذخیرہ کتب کی حفاظت اور اس بارے میں کچھ لکھنے کے حوالے سے بہت زیادہ زبانی جمع خرچ ہوا۔ لیکن ان کتب کو محفوظ کرنے یا علامہ مرحوم کی حیات و خدمات کے منور گوشوں کو داکر کرنے کی نتیجہ خیز کوشش نہ کی گئی۔ آپ کی زندگی کے حوالے سے ایک تحقیقی مقالہ ایم۔ اے کی سطح پر راقم الحروف کی زیر نگرانی ۱۹۸۸ء میں تحریر کیا گیا۔

یہ مقالہ عادل سلطان متعلم ایم۔ اے اسلامیات گورنمنٹ کالج فیصل آباد نے تحریر کیا۔ طالب علم نے اگرچہ بہت محنت کی لیکن پوری محنت کے باوجود علامہ مرحوم کی تحریری خدمات اجاگر نہ کی جا سکیں۔ البتہ طالب علم مذکور نے The Light of Islam کے چند شماروں کا ذکر کیا جن میں علامہ مرحوم نے اداریوں کی شکل میں مضامین لکھے۔ جو The Light of Islam میں شائع ہوئے اور ان کو اپنے مقالے میں یکجا کر دیا جو ایک خدمت ہے۔

۴۔ اخباری مضامین

علامہ مرحوم کے بے شمار علمی مضامین اخباروں کی زینت ہیں۔ آپ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ یہ مضامین عموماً علمی اور تحقیقی نوعیت کے ہوتے تاہم ان میں معروضی حالات کا تناظر بھی شامل ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے مضمون کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔

آپ کے یہ مضامین عموماً پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز، روزنامہ نوائے وقت اور روزنامہ کوہستان وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان تمام مضامین کو اخباروں کی فائلوں سے نکال کر یکجا کرنا بہت بڑی علمی خدمت ہوگی جو علامہ مرحوم کے شاگردوں کا فرض ہے۔

جب ہم علامہ مرحوم کی غیر مطبوعہ قلمی کاوشوں کا ذکر کریں گے تو مطبوعہ کتب کی نسبت زیادہ توجہ طلب امر ہے۔

علامہ مرحوم کے غیر مطبوعہ قلمی تحریروں میں ان تین بڑے رجسٹروں کا ذکر ضروری ہے جو راقم الحروف نے خود مشاہدہ کیے۔ علامہ مرحوم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کی علمی وراثت یعنی کتب اور قلم پارے ذاتی یادداشتیں اور دیگر متعلقہ مواد ادارہ علوم اسلامیہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ادارہ کی اس وقت کی سربراہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کے حکم پر اس عاجز نے آپ کے قلمی مواد کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ مختلف موضوعات پر کارڈز اور نکات تو جو ہیں جن کو مضمون کی شکل دینے کے لیے سخت محنت کی ضرورت اور ایک دقت طلب کام ہے۔ اس دوران یہ صورت حال سامنے آئی کہ علامہ مرحوم کا غیر مطبوعہ قلمی اثاثہ ان کے مطبوعہ اثاثے سے کہیں زیادہ ہے۔ جو منتظر طباعت و اشاعت ہے۔ علامہ مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ پنجاب

یونیورسٹی میں شعبہ علوم اسلامیہ کا قیام ہے۔ اگرچہ اس شعبہ کے قیام میں بعض دیگر شخصیات کی مساعی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن میں علامہ لیوپول اسد کی مساعی نہایت اہم ہیں۔ تاہم علامہ علاء الدین صدیقی کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ آپ نے اسلامیات کے نصاب میں تقابل ادیان یعنی Comparative Study of Religions کو بطور مستقل پرچہ کے متعارف کرایا۔ اس ضمن میں آپ کو پائینر کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ ہی اس پرچہ کو پڑھاتے تھے۔ یہ پرچہ اور یہ عنوان خالصتاً آپ ہی کی ذہنی اختراع تھی۔ آپ نے مختلف مذاہب کا دقت نظر سے مطالعہ کیا۔ انگریزی زبان میں تقابل ادیان پر بیش قیمت نکات اور نوٹس تیار کیے۔ مکاشفہ ان کا کوئی طالب علم علامہ صاحب کے تقابل ادیان پر نوٹس کی نوک پلک سنوار کر اشاعت کا اہتمام کرے تو ایک علمی خدمت ہوگی۔

اس کے علاوہ آپ کے ورثہ کتب میں مزید تحری اور جستجو مزید گوہر ہائے قلمی کا پتہ دے سکتی ہے۔



اتحاد و اتفاق کے علمبردار

جناب اپس ایم شریف ☆

استاذ گرامی جناب علامہ علاؤ الدین صدیقیؒ کی ذات اقدس کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ ایک عظیم مفکر، صاحب طرز ادیب، شعلہ نوا خطیب، لا جواب منتظم اور نہایت شفیق استاد تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کی صدارت سے لے کر وائس چانسلر تک اور پھر اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین تک کئی اہم مناصب پر فائز رہے۔ لیکن ان سب کے باوصف آپ کا اصل اعزاز یہ تھا کہ آپ کے پہلو میں ایسا دل تھا جو ہمیشہ ملت اسلامیہ کی پستی و دوہمتی اور ان کے باہمی انتشار و افتراق پر کڑھتا رہتا تھا۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ تمام مسلمان ایک ہو جائیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کا دار و مدار ہی اتحاد اور اتفاق میں پنہاں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس فکر کو مسلمانوں کے سینوں میں اتارنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کیا۔ تقریریں کیں، سیمینار کروائے، مضامین لکھے، خطبے دیئے اور مختلف مسالک کے اکابرین کو ایک جگہ مل بیٹھنے اور اپنے مسائل باہمی افہام و تفہیم سے طے کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں مذہبی تشدد کی وہ لہر نہیں اٹھی تھی جس میں آج ملک عزیز کے عوام مبتلا ہیں۔

آج جب ہم پاکستان کا امن و سلامتی کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو قتل و غارت، لڑائی جھگڑا اور مذہبی تشدد اس وقت پاکستان میں پایا جاتا ہے اس کی نظیر سابقہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ آج سرزمین پاکستان میں مساجد اور امام بارگاہوں میں نمازی تک محفوظ نہیں ہیں۔ خوف و دہشت میں مبتلا عوام امن و سلامتی اور عزت نفس کے لیے سرگرداں ہیں۔ مگر امن و سلامتی ہے کہ سرزمین پاکستان سے عنقا۔

☆ ایسوی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج فیصل آباد

اس وقت ملک عزیز میں مذہبی تشدد اور دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے جو قدم اٹھائے جا رہے ہیں، اگرچہ وہ اپنی جگہ نہایت قابل قدر ہیں تاہم اگر ان میں علامہ مرحوم کے افکار و خیالات کو بھی شامل کر لیا جائے تو بحیثیت مجموعی بہترین نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جس درد میں ڈوب کر انہوں نے اتحاد بین المسلمین کے لیے دن رات وقف کر دیئے تھے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس وقت میرے سامنے حضرت علامہ صاحب کا وہ گراں قدر مقالہ موجود ہے جو ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء کے روزنامہ کوہستان میں طبع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں جس دل سوزی کے ساتھ انہوں نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی ترغیب دی ہے اور جس طریقہ سے انہیں انتشار و افتراق سے ڈرایا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آپ نے اعلیٰ اقدار کے حامل ایک اسلامی معاشرے کے بنیادی اصول بتاتے ہوئے تفرقہ بازی سے اجتناب کو ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ آپ نے فرمایا:

”رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دین حق دے کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ ایک ایسا دین جس کو تمام ادیان عالم پر فوقیت و غلبہ حاصل کرنا تھا۔ اس دین کی مقدس تعلیمات کی بنیاد پر نبی کریم ﷺ نے ایک اعلیٰ اقدار کا حامل مثالی اسلامی معاشرہ قائم کر کے دکھایا۔ جو اپنے مخصوص ثقافتی اور تمدنی اصول رکھتا ہے۔ جس کے افراد باہمی ربط اور محبت، شفقت و رحمت اور کفر و باطل کے مقابلے میں شدت و سختی کے اوصاف سے متصف تھے۔ اس مثالی معاشرے کے افراد کا ایک مخصوص اصلاحی پروگرام ہے، ایک ممتاز فرض منصبی ہے جس کے چار بنیادی ستون ہیں۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت الی الخیر اور تفرقہ بازی سے اجتناب۔“

چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اس ممتاز فرض منصبی سے کما حقہ عہدہ برآ ہوتے لیکن اس کے بجائے جو کچھ ہم نے کیا اس کو علامہ صاحب کی زبانی سنئے:

”برادران اسلام! آج ہم اپنے فرض منصبی سے کس قدر دور جا پڑے ہیں۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت الی الخیر اور تفرقہ بازی سے

اجتناب امت مسلمہ کا طرہ امتیاز تھا مگر آج ہم اس امتیازی نشان سے محروم ہو چکے ہیں۔ آج ہم میں سے کوئی اس بات کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ وہ اپنے فرض کو پورا کر رہا ہے۔ کیا کوٹ اور پتلون پہننے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ کیا جبہ اور عمامہ زیب تن کرنے والی علماء کی جماعت اپنے فرائض کو مکمل ادا کر رہی ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ انگریزی خواں حضرات تو اسلام کو مولوی کے حوالے کر کے سبکدوش ہو گئے اور مولوی صاحبان تکفیر بازی اور اندرونی خلفشار میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ حضرات بجائے اس کے کہ اس ہادی اعظم ﷺ کی مقدس تعلیمات کو عام کرتے، بے فائدہ بحثوں میں پڑ کر ایک دوسرے کا سر پھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

نور و بشر کے مسئلے پر کڑھتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:-

”کہیں بشریت رسول پر طبع آزمائی ہو رہی ہے، کہیں نور کی بحث کو لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ حالانکہ بات صاف ہے جو لوگ محمد عربی کو نور کہتے ہیں وہ نور کو دنیا کی تاریکی دور کرنے کے لیے کیوں نہیں پیش کرتے۔ یورپ اور امریکہ میں جا کر دین کی روشنی کیوں نہیں پھیلاتے۔ وہ حوصلہ شکن ظلمتوں پر نور محمدی کی شمعیں کیوں نہیں جلاتے۔ بشریت کی بحث میں الجھنے والے آج ظلم و طغیان اور دکھ درد میں ستائی ہوئی بشریت کو محمد عربی کی روشن سیرت کیوں نہیں سناتے۔ وہ انسانیت کو کیوں نہیں بتاتے کہ اس کی تمام تر مشکلات کا حل، اس کے تمام دکھوں کا مداوا اس محسن کُل کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے میں ہے۔ پیغمبر اسلام انسانیت کو نور اور بشر کے جھگڑوں میں الجھانے کے لیے تشریف نہیں لائے بلکہ ظلمت و گمراہی اور کفر و فساد سے نجات دلانے کے لیے دنیا میں مبعوث ہوئے تھے۔ آج دنیا کو پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی

ضرورت ہے۔ اسے حلقہ بگوش اسلام کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غلامانِ محمد کو سرورِ دو جہاں کی غلامی سے محروم کرنے کی۔

باہمی اتفاق و اتحاد اور اخوت و یکجہتی ہی وہ ستون ہے جس پر ملت اسلامیہ کی عمارت کھڑی ہے۔ اور جناب علامہ صاحب اتحادِ مسلمین کے زبردست داعی تھے۔ وہ ملک کو پیش آور خدشات سے آگاہ کرتے ہوئے اتحاد کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”آج ہم تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ عالم اسلام ظلم و کفر میں گھرا ہوا ہے۔ انسانیت پر جنگ کی تباہی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پاکستان کی سرحدوں پر دشمن کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ اس خطہ زمین کے امن کو شدید خطرہ لاحق ہے اور ہم ہیں کہ ایک دوسرے کی تکفیر اور باہمی حسد و عناد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ یاد رکھیے کسی مسلمان کو کافر کہنا ہمیشہ حرام تھا، دل آزاری ہر زمانے میں گناہ عظیم تھی۔ مگر اس نازک موقع پر تو معاملہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ آج ملک میں انتشار پیدا کرنے اور ملک کے شیرازے کو منتشر کرنے کی بجائے امت اسلامیہ کے دلوں کو باہمی الفت و محبت کے مضبوط رشتوں میں جوڑ کر بنیان ”مرصوص بنانے کی ضرورت ہے۔“

علمائے کرام سے علامہ مرحوم کو گلہ ہے کہ وہ اپنی اصل ذمہ داری سے گریز پا نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جو کام اپنے لیے منتخب کیے ہیں وہ سرتا سر یہی ہیں کہ اپنے نظریاتی مخالفین کے خلاف سادہ لوح لوگوں کو مشتعل کریں، ان کی تکفیر کی جائے اور انہیں واجب القتل ٹھہرایا جائے۔ علامہ مرحوم لکھتے ہیں:

”(افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ) خدمتِ دین کے بعض داعی فروعات میں الجھ کر رسولِ عربی کی بھولی بھالی اور سادہ لوح امت کو انتشار و افتراق میں مبتلا کر رہے ہیں۔ مسلمان، مسلمان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں اور

گروہی سرگرمیوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال کتنی افساناک
ہے کہ ملت کو متحد کرنے کا فریضہ تو حضرات علماء کرام کے سپرد تھا۔ اسلام
کی حفاظت اور کفر کی یلغار کے لیے سینہ سپر ہونا تو محمد عربی کے دینی
وارثوں اور مسند نشینوں کا کام تھا۔ حضرات علمائے کرام نے اس جنگل کی
آگ کو بجھانے کی کوشش نہ کی تو ان کے دینی وقار کو ناقابل تلافی
نقصان پہنچے گا اور نئی نسل علماء سے متنفر ہو جائے گی اور یہ بات اسلام
کے لیے ایک عظیم صدمے کا باعث ہوگی۔ کیونکہ علمائے دین ہی نے شمع
دین کو روشن رکھنا ہے۔ انہوں نے اگر دیوار کی تحریر نہ پڑھی تو ملت برباد
ہو جائے گی۔“

اسلامی تعلیمات میں جہاں اتحاد و اتفاق پر زور دیا گیا ہے وہاں اختلاف و انتشار
سے بچنے کی بھی تعلیم دی ہے۔ کیونکہ یہی وہ بیماری ہے جس کی وجہ سے سابقہ قومیں تباہ و برباد
ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں جناب علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

”ملت اسلامیہ کو پہلے دن ہی اللہ تعالیٰ نے متنبہ کر دیا تھا کہ تفریق و
انتشار اس امت کا شیوہ نہیں اور یہی وہ بیماری ہے جو گزشتہ اقوام کی
موت و ہلاکت کا باعث ہوئی۔ تفرقہ بازی کا بازار گرم کرنے والوں
کے لیے اللہ تعالیٰ نے ”عذاب عظیم“ کی تہدید فرمائی ہے۔ یہ عذاب
کفر و شرک یا بت پرستی پر نہیں بلکہ تفریق بین الامت کے جرم کی پاداش
میں بیان ہوا ہے۔“

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ امت کے اختلاف کو رسول اللہ ﷺ نے رحمت قرار دیا

ہے۔ علامہ مرحوم ان سے پوچھتے ہیں:

”کون سا اختلاف؟ یہی اختلاف جس کا شکار آج ہم ہیں۔ کیا یہ مختصمت
و عداوت، ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہونا، اپنے بزرگوں کو کافر بنانا
اور نفرت و حسد کی آگ کو ہوا دینا رحمت ہے یا زحمت ہے؟“

پھر علامہ صاحب خود اختلاف امت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”اس سے مراد تو وہ اختلاف رائے ہے جو ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور ابن حنبلؒ میں تھا۔ لیکن وہ ایک دوسرے کو ملت اسلامیہ کے سچے خادم اور اپنے بھائی تصور کرتے تھے۔ وہ اس اختلاف کے باوجود بھی ایک دوسرے کا نام بڑے احترام و عقیدت سے لیتے تھے۔ اس اختلاف سے وہ اختلاف مراد ہے جس کی مثال امام محمدؒ اور امام شافعیؒ نے پیش کی تھی۔ امام محمدؒ امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد تھے مگر انہوں نے جب ایک مسئلہ میں اپنے استاد کی رائے کو چھوڑ کر امام شافعیؒ کی رائے پر فتویٰ دیا تو لوگوں نے کہا اے محمدؒ تو نے اپنے استاذ کے مسلک سے انحراف کر کے امام شافعیؒ کی رائے پر عمل کیوں کیا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ میں نے یہ رائے امام شافعیؒ کے علم اور تفقہ فی الدین کے عظیم مرتبے کو دیکھ کر پسند کی ہے اور امام شافعیؒ نے جب ایک مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر عمل کیا تو لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا میں نے ابوحنیفہؒ کے زہد و تقویٰ کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اتنے عظیم زہد و تقویٰ کا مالک انسان اپنی ذاتی رائے اور خواہش پر ہرگز نہیں چل سکتا۔ یہ ہے وہ اختلاف جسے رسول اکرم ﷺ نے رحمت قرار دیا تھا۔“

علامہ صاحب اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ مسلمانوں کی فلاح و کامیابی

صرف اور صرف اتحاد میں ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک نہایت خوبصورت مثال دی:

”(یاد رکھو!) سخت گرمی، سخت سردی، شدید بارش، شدید طوفان اور موسموں کا تغیر و تبدل فصل کو اس وقت تک کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک اس کے اندر کوئی کیڑا پیدا نہیں ہو جاتا۔ مسلمان جب تک ایک ہیں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب بھی مراہے تو اپنوں کی بے اتفاقی سے مراہے۔“

علامہ صاحب تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ آپ اتحاد کو اسلام کا ایک اہم ترین مسئلہ سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اسلامی تعلیمات کا منشا اتحاد بین المسلمین کے سوا اور کچھ نہیں۔ مضمون کے آخر میں آپ اکابرین ملت سے اپیل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”میں ملت اسلامیہ کے بھی خواہوں سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اپنے فرض کو پہچانیے اور اختلاف و انتشار پیدا کرنے والے لوگوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر، ان کی منت و سماجت کر کے، پیغمبر اسلام کی ناموس کا واسطہ دے کر اور ملت کو پیش آمد شدید خطرات کا احساس دلا کر چپ کرانے کی کوشش کریں۔ آپ ہر اس آدمی کی بات سننے سے انکار کر دیں جو محمد عربی ﷺ کی امت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں علماء امت سے ملک و ملت کے نام پر درد مندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کا احساس کریں بے فائدہ بحثوں اور فضول جھگڑوں میں اپنے معتقدین کے وقت اور ملت اسلامیہ کی قوت کو ضائع نہ ہونے دیں۔ تعمیری کاموں کے لیے میدان میں نکلیں۔ دین حق کی تبلیغ و اشاعت کے اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ملت کو متحد اور منظم رکھنے کی تدبیر پر عمل پیرا ہوں۔“

علامہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے سامنے تابندہ اور تاریک دونوں دوروں کی مثال رکھ دی ہے۔ تابندہ دور کی بنیاد باہمی اتحاد و اتفاق پر تھی جب کہ تاریک دور کی بنیاد تفرقہ و انتشار پر۔ اس لیے اگر آج ہم دنیا کے نقشے پر ایک باوقار قوم کی حیثیت سے ایک بار پھر ابھرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم جناب علامہ کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے تمام اختلافات دور کر کے اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو جائیں۔ ایک بار پھر اخوت کے رشتے کو مضبوط کریں۔ ہم میں یہ رشتہ جتنا مضبوط ہوتا جائے گا ہم اسی قدر ناقابل تسخیر ہوتے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی فریضوں کو ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

استاد محترم جناب علامہ علاؤ الدین صدیقی کی نذر

سید محمد اشرف علی

یہ ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے کہ بی اے پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے علوم اسلامیہ میں داخلہ کے لیے پنجاب یونیورسٹی اور کینٹنل کالج میں داخلہ فارم جمع کروائے۔ پتہ چلا کہ شعبہ کے سربراہ جناب علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم و مغفور انٹرویو لے کر داخلہ کرتے ہیں اور طلباء و طالبات کی طرح اس ناچیز کو بھی علامہ صاحب کے سامنے سوالات کی بوچھاڑ کا سامنا رہا۔ لیکن میری خوش قسمتی کہ محترم جناب حافظ احمد یار صاحب جواب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، انٹرویو میں موجود تھے۔ اور احقر نے دو سال کی بہت قلیل مدت جبکہ وہ اسلامیہ کالج سول لائنز پڑھاتے تھے، استفادہ کیا تھا۔ بی۔ اے آنرز کے تین پرچے آخری چند ماہ میں پورے کیے میرے ساتھ صرف ایک اور ساتھی تھے یعنی ہم صرف دو کی کلاس تھی۔ اس تعلق کے سبب میرا ذاتی خیال ہے کہ حافظ صاحب مرحوم و مغفور نے میری سفارش کی۔ علامہ صاحب کی ایک بات جو اس وقت انہوں نے میری ٹوپی سر پر دیکھ کر کہی یاد ہے کہ لوگ یہاں سر پر ٹوپی لے کر آتے ہیں لیکن دو سال بعد جب وہ فارغ ہو کر جاتے ہیں تو سر سے ٹوپی غائب ہوتی ہے۔ علامہ صاحب اکثر قراقلی ٹوپی پہن کر آتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ان شاء اللہ یہ معاملہ میرے ساتھ نہ ہوگا۔ فرمانے لگے لوگ دعوے کرتے ہیں لیکن ان پر پورا اترتا میں نے کم ہی دیکھا ہے۔

بہر حال داخلہ ہو گیا، کلاسز شروع ہو گئیں، آج نئی کلاس کی جو گت بنتی ہے اس کا خوف تھا لیکن علامہ صاحب کا رعب تھا کہ ایسی حرکت ہمیں نظر نہیں آئی۔ چند ہفتے گزرے کہ ایک سینئر طالب علم میرے پاس تشریف لائے، فرمانے لگے کہ بھی تم تو محض صوفی منش انسان لگتے ہو کوئی اٹھویں پرچے کی تیاری بھی کرو۔ یقین جانئے، مجھے اٹھویں پرچے کا بالکل علم نہ تھا۔ ان سے عرض کیا کہ محترم میں نے تو سات پرچے سنے ہیں یہ اٹھواں پرچہ کہاں سے آ گیا؟

کہنے لگے وقت آنے دو پتہ چل جائے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس میں فیل رہو گے۔ یہ کہہ کر وہ صاحب تو چل دیئے اور میں اس اٹھویں پرچے کی پیش از وقت ناکامی کا سن کر پریشان ہو گیا۔ لیکن ان صاحب سے اس دوران ایک ادھ ملاقات اور رہی، اس وقت انہوں نے انکشاف کیا کہ تم تو بڑے تیز نکلے، تم نے نہ صرف اس پرچے کو پاس کر لیا بلکہ باقی کلاس کو بھی پیچھے چھوڑ گئے اور میرے سوال کے سنے بغیر انہوں نے اپنی راہ لی۔ اور میں پھر حیرانی میں ڈوب گیا۔

چند روز بعد ایک دوست سے قدرے بے تکلفی ہو گئی ان سے اپنا مدعا بیان کیا کہ بھائی یہ اٹھواں پرچہ کون سا ہے اور اس طرح ایک صاحب پہلے مجھے یہ کہہ گئے اب چند روز قبل انہوں نے یہ مژدہ سنا دیا۔ وہ پہلے تو بہت ہنسے پھر کہا اومیاں تم سمجھے نہیں وہ سمجھتا تھا کہ تم صوفی ٹائپ ہو۔ علامہ صاحب کو متاثر نہ کر سکو گے، لیکن اسے کیا پتہ کہ آپ کے والد صاحب کے چونکہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ کے ساتھ بے حد قریبی تعلقات ہیں اور جو نبی علامہ صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ، چونکہ علامہ صاحب مرحوم و مغفور کے استاد تھے لہذا ان کی نظر میں تمہاری وقعت بڑھ گئی۔ اس سے مجھے یہ سبق ملا کہ استاد کا مقام اور مرتبہ اس کی میں بھی قدر کروں۔

علامہ صاحب تفسیر کا پرچہ پڑھاتے تھے، ملازم محمد شفیع مرحوم علامہ صاحب کا قرآن پاک کلاس میں رکھ کر جاتا تھا اس میں علامہ صاحب نے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پرزے کاغذ کے نشانی کے طور پر رکھے ہوتے تھے۔ لیکچر کے دوران ان کاغذات والی نشانیوں سے قرآنی آیات کا حوالہ دے کر اپنی بات کو مدلل بناتے۔ آج میں بھی اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ گھر سے مطالعہ کر کے اہم جگہوں پر کاغذی پرزے رکھوں تاکہ اپنی بات کو ان آیات سے سجا سکوں، ظاہر ہے جو زور بیان علامہ صاحب مرحوم و مغفور کے یہاں نظر آتا تھا ہم تو اس کے ذرے تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکے، لیکن بڑے بڑے مقررین میں وہ چیز مفقود نظر آتی ہے۔ جو کیفیات علامہ صاحب کے بیان میں نظر آتی تھیں۔

علامہ صاحب مرحوم مسجد شاہ چراغ میں جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس مسجد میں اس دور کے اندر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ علامہ صاحب کی تقریر کو سننے کے لیے جوق در جوق آتا تھا۔

اور ہم نے اس میں کمی کبھی نہیں دیکھی۔ عام طوڑ پر یہ بات محسوس کی جاتی ہے کہ مدارس کے علماء ایک خاص انداز فکر کو ملحوظ خاطر اپنی تقریر کرتے ہیں لیکن علامہ صاحب کی تقریر میں نہ صرف دینی مواد کی بہتات ہوتی تھی بلکہ وہ دنیوی نکتہ نظر سے جدید علوم اور تحقیقات پر بھی نظر رکھتے اور ان کو بھی اپنی تقریر کا موضوع بناتے۔

علامہ صاحب سے میری قربت جس کا معمولی سا ہیولہ میرے ذہن میں ہے یہ ہے کہ علامہ صاحب ایک دفعہ بیمار ہوئے۔ اس وقت آپ اے جی آفس کے بالمقابل شاید ایک مزنگ روڈ پر رہتے تھے۔ کچھ ساتھیوں نے علامہ صاحب کی تیمارداری کا پروگرام بنایا۔ اور یہ حضرات مجھے بھی زبردستی لے گئے۔ دراصل اس وقت میرا قیام ایک دینی مدرسہ میں تھا۔ جہاں قرأت کافن سکھایا جاتا ہے اور یہ ریونیو بورڈ کے بالکل سامنے واقع ہے۔ اگرچہ اس کی اصل شاخ آج کل کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن منتقل ہو گئی ہے۔ جب یہ حضرات اجازت لے کر جانے لگے تو علامہ صاحب نے مجھے روک لیا۔ پھر مختلف سوالات فرماتے رہے۔ تعلیم، رہائش اور والدین کے بارے میں، میں نے ان کے جوابات عرض کیے۔ فرمایا جب فراغت محسوس کرو یہاں آنے سے جھجک محسوس نہ کرنا۔

کچھ مدت گزری، علامہ صاحب کو پتہ چل گیا کہ والد محترم چونکہ عالم دین تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے اثرات بہت حد تک موجود تھے۔ جب کبھی علامہ صاحب کلاس میں سوال کرتے، حتی الوسع اس کا جواب جو والد صاحب کی تقریروں یا گفتگو کے دوران ذہن میں ہوتا عرض کر دیتا۔ علامہ صاحب اس پر خوش ہوتے۔

مزید کچھ مدت گزری کہ اسلامیات کی یونین کے ارکان نامزد کر دیئے گئے۔ اس کے تحت فنکشنز ہونے لگے ہر فنکشن میں بندہ کو تلاوت کے لیے کہا جاتا۔ ہمارے دوست تقریبات کے انعقاد کے سلسلے میں جب اپنی کارکردگی کا احسن طریق پر مظاہرہ کرنے لگے تو علامہ صاحب نے بھی ہر جمعرات کو کسی نہ کسی مقرر کو بلانا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے ایک بھر پور تقریر آپ نے اس بات پر کی کہ آج مسلمان قوم اتحاد کی دولت سے مالا مال نہیں۔ اسی وجہ سے اسے اقوام عالم میں پذیرائی حاصل نہیں۔ پھر آپ نے اس کی وجوہات پر روشنی ڈالی

اور کہا مذہبی تعصب، لسانی اور گروہی وابستگیوں اور اسی طرح کی دیگر باتیں جو دشمنوں نے ہمارے درمیان پھیلا دی ہیں، ہم اس جال میں ایسے پھنسے ہیں کہ اب اس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر کوئی رہائی کی صورت ہے تو صرف یہ کہ اپنے آپ کو صرف ایک ”مسلمان“ کی حیثیت میں پیش کرو نہ کہ فلاں گروہ یا فرقے سے تعلق کا حوالہ دو۔ اس کے بعد پھر آپ نے ہر جمعرات کو جو مقرر بھی بلایا کہ وہ مختلف مسالک کے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے۔ ان میں شیعہ بھی ہوتے، سنی بھی، دیوبندی بھی اور وہابی، پرویزی اور دیگر مسالک کے ماننے والے بھی۔ علامہ صاحب پہلے مقرر کا تعارف کراتے پھر اس کے موضوع کو بتلاتے۔ موضوع پر مقرر تقریر ختم کرتا تو طلباء کو کھلے طور پر سوالات کی اجازت ہوتی۔ علامہ صاحب عموماً خود بھی مقرر سے سوال کرتے۔ اس سے جہاں علم میں وسعت پیدا ہوتی وہاں دیگر مسالک اور ان کے عقائد کا بھی علم ہوتا۔ تعصب اور تنگ نظری کی جو عینک ہمارے معاشرے نے ہمیں پہنا رکھی تھی اس سے آہستہ آہستہ گلو خلاصی ہو گئی اور ایک وسیع تر نکتہ نظر کا خاکہ ذہن میں بیٹھ گیا۔

علامہ نے اسی دوران سمن آباد میں روڈ پر کوٹھی تعمیر کرائی۔ اس میں ہمارے ایک ساتھی جناب پروفیسر محمد شریف صاحب نے اہم کردار ادا کیا اور اپنی نگرانی میں کوٹھی کو مکمل کروایا۔ ایک دن علامہ صاحب نے اس ناچیز کو دفتر بلایا۔ علامہ کا رعب و جلال بے حد تھا، کچھ خوف سا تھا۔ کہ نہ معلوم کیوں طلبی ہوئی۔ خیر فرمانے لگے کہ شام کو کیا مشاغل ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ فرمانے لگے کہ برخوردار اور ایک بچی کو تھوڑی بہت گائیڈینس کی ضرورت ہے۔ اگر وقت نکال سکو۔ میرے پاس وقت تھا لہذا حامی بھری۔ اور ایک طویل عرصہ تک بچوں کی تعلیمی رہنمائی کرتا رہا۔ علامہ صاحب کو اکثر دیکھتا کہ مطالعہ کے کمرے میں ڈھیروں کتب کے درمیان مطالعہ میں مستغرق ہیں۔ اس دوران گھر کے کسی فرد کو جرأت نہ تھی کہ وہ علامہ صاحب کو ڈسٹرب کر سکیں۔ ظاہر ہے مطالعہ تو خاموشی میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

علامہ صاحب کو میں ان لوگوں میں شمار کرتا ہوں جو خوش لباس کہلاتے ہیں۔ بے داغ کپڑے، نفیس سوٹ، ٹائی زیب تن ہوئی۔ صفائی کا بے حد خیال رہتا۔ دفتر، گھر، گاڑی بے حد صاف ستھری ہر لمحہ نظر آتی۔ سرخ و سفید چہرے پر سیاہ و سفید داڑھی بڑی ہی بھلی لگتی۔ شیروانی

بھی زیب تن فرماتے جو لوگ صاف ستھرا لباس زیب تن نہ کرتے وہ ان کو ایسا نہ کرنے پر سمجھاتے اور حضور اکرم ﷺ کی زندگی کی بے شمار مثالیں دے کر سمجھاتے۔

اس دور میں یونیورسٹی یونین کے انتخابات کا مرحلہ بھی آیا۔ علامہ صاحب نے رہنمائی فرمائی کہ پہلے تمام امیدواران کے منشور دیکھ لو اور جس پر کلاس کا اتفاق ہو جائے اسی کو من حیث المجموع ووٹ دیں تو اچھا۔ کہ اتفاق میں برکت بھی ہے۔ الگ الگ دینے سے اختلافات کا راستہ کھلے گا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اسے صرف میری رائے تصور کریں آپ کو اس پر مجبور نہیں کرتا۔ چنانچہ پوری کلاس نے اجتماعی ووٹ دیا۔

یونیورسٹی کی طرف سے ایک گروپ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) بھی گیا جس میں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی نمائندگی محض اس لیے ممکن ہوئی کہ ووٹ کا اجتماعی استعمال ہوا تھا۔ اس پر ایک ساتھی نے نظم کہی۔ اس کا ایک شعر یاد رہا:

جعفر از بنگال بآئید آج کسی ساتھی نے کہا

یہ سنتے ہی سوچ کا دھارا سندربن کی لے بہا

اس دور میں شعبہ علوم اسلامیہ فائن آرٹس اور شعبہ اقتصادیات کے درمیان واقع تھا۔ دو کمرے نیچے اور ایک کمرہ اوپر تھا۔ اور اس عمارت کے سامنے گراسی پلاٹ میں بھی شامیانے کے نیچے کلاس ہوتی تھی۔ علامہ صاحب کی دن رات کی محنت شاقہ کے سبب یونیورسٹی نے شعبہ علوم اسلامیہ کی تعمیر کی منظوری دی۔ مجھے یاد ہے جسٹس محمد شریف صاحب جوان دنوں وائس چانسلر تھے، سنگ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لائے گیارہ اینٹیں زمین پر رکھی گئیں جن میں علامہ صاحب اور وائس چانسلر کے علاوہ بعض دیگر حضرات نے شمولیت اختیار کی۔ اس وقت وائس چانسلر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اسلام سرزمین عرب سے پھیلا جب عرب کی زمین کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو خیمے اور کھجوروں کے درخت نظروں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی سماں ادارہ علوم اسلامیہ کا اس وقت بھی نظروں کے سامنے اگرچہ خیمے کی بجائے شامیانہ ہے اور کچھ کے اصلی درخت تو نہیں۔ لیکن اسی کی نسل سے تو ہیں۔ یہ عمارت ہمارے جانے کے بعد مکمل ہوئی۔

علامہ مرحوم و مغفور کو بچیوں کا بے حد خیال رہتا۔ چنانچہ طلباء اور طالبات کے پارٹیشن کے لیے ایک سکرین ہوتی تھی جو شاید اب بھی موجود ہے۔ بچیوں میں جو عمر میں بڑی لڑکی ہوتی اسے بلا کر بچیوں کی خفیہ نگرانی کا حکم دیتے اور جب کسی بچی کا کسی طالب علم سے میل جول کا علم ہوتا تو اسے بلا کر سرزنش فرماتے۔

دوسرے سال یعنی سال ششم میں عربی ادب سے کچھ طلباء ہماری کلاس میں داخل ہوئے۔ ان ہی میں دو ترکی کے طالب علم عارف بک اور بھولو تھے۔ دوسرے صاحب کا نام مکمل یاد نہیں۔ وہ اکثر و بیشتر عربی زبان میں سوال کرتے۔ اس دور میں عربی زبان و ادب کا طالب علم بھی عربی بولنے کی معمولی شدہ بدھ رکھتا تھا۔ علامہ صاحب پھر بھی اپنا مافی الضمیر عربی زبان میں ان طلباء کے لیے بیان فرماتے جس سے ہمیں علامہ صاحب کی عظمت کا احساس ہوتا۔

اس سال کے اختتام سے قبل علامہ صاحب نے ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا جس میں غیر ملکی طلباء جو اس یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، ان کو شعبہ کی طرف سے دعوت دی گئی، جس میں ان طلباء نے اپنا قومی لباس زیب تن کیا، پہلے اپنی زبان پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اپنے ملک کے بارے میں معلومات مہیا کیں۔ اپنے بارے اور اپنی تعلیم اور پاکستان کے بارے میں اپنے تاثرات سٹیج پر آ کر بیان کیے۔ جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ سے سلائیڈز اور کیمرہ مشین لایا گیا جس سے بعض ممالک کی اہم شخصیات، مقامات وغیرہ کو پردہ سکرین پر دکھلایا گیا۔ اس کے لیے پروفیسر انیس صاحب نے ہماری معاونت فرمائی۔ حالانکہ ان دنوں ان کے پاس کسی اور یونیورسٹی کے جغرافیہ کے پرنسپل مارکنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ہمارے وہاں کے قیام کے دوران دو شخصیات بطور ریسرچ سکالرشپ لائیں۔ تاریخ کے لیے جناب امان اللہ خان صاحب اور دوسرے جناب بشیر الدین صدیقی یہ دونوں حضرات تاریخ اور فقہ کا پرنسپل پڑھاتے تھے۔ ان دونوں حضرات کی سرکردگی میں شعبہ کا ایک ٹور مری، نتھیا گلی، ایبٹ آباد اور بالا کوٹ تک گیا۔ علامہ صاحب کا بھی ارادہ تھا لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آخری وقتوں میں اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ البتہ کوٹ عبدالملک اور مقبرہ جہانگیر پر علامہ صاحب ہمراہ رہے۔

علامہ صاحب کی ایک بڑی خوبی تھی کہ وہ الفاظ میں بڑے نکات پیدا کرتے۔ مثلاً ہمارے ایک جونیئر ساتھی غلام حسین جمشید بٹ تھے۔ مقبرہ جہانگیر جب پہنچے تو وہ ساتھیوں کو اپنی حرکات اور شرارتوں سے محظوظ کرتے رہے۔ اس پر علامہ صاحب فرمانے لگے۔ میاں بٹ کا نقطہ اوپر کب کا آ گیا؟ اسی طرح رحمت اور زحمت، دلیل اور ذلیل وغیرہ کے الفاظ دوران گفتگو اکثر استعمال کرتے جس سے سننے والا کچھ دیر کے لیے مبہوط ہو جاتا۔ اور جب دوران الفاظ پر غور کرتا تو محظوظ ہوتا۔

علامہ صاحب طلباء خاص طور پر غریب طلباء کا بھی دھیان رکھتے۔ ان کو ٹیوشن یا کسی اور طرح سے مالی معاونت فرماتے جس سے کہ طالب علم کی عزت نفس پر داغ نہ آئے۔ علامہ صاحب کے بعد ایک مدت تک ان کی یاد میں تقریبات منعقد ہوتی رہیں لیکن پھر یک دم خاموشی سادھ لی گئی۔ موجودہ چیئر پرسن نے ایک نئی صورت میں علامہ صاحب کی یاد کو زندہ کرنے کی سعی کی ہے جو قابل صد مبارک ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے قلم سے تحریر کیا وہ علامہ صاحب کی شان کے عین مطابق ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں بھی اپنا نام ان حضرات کی فہرست میں لانا چاہتا ہوں جنہوں نے اپنی قیمتی تحریریں علامہ صاحب کی نذر کی ہیں۔ شاید ان میں یہ بے جان سی تحریر بھی کہیں چھپ جائے۔

ہماری دعا ہے کہ علامہ صاحب کا یہ پودہ پھلے پھولے اور خوب برگ و بار لائے اور دین کے پھیلاؤ میں پوری پوری قوت سے اپنی توانائیوں کو بروئے کار لائے جو کہ موجودہ صورت میں نظر بھی آرہی ہیں۔ اور اللہ کرے ان میں آئندہ مزید اضافہ ہو۔



استاذی المحترم!

حضرت علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم

پروفیسر ملک محمد ظہور

حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ برصغیر پاک و ہند کی ان فاضل برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ بندہ ناچیز کو آپ کا شاگرد ہونے کی سعادت نصیب رہی، زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر اس دور میں استاد معلم بھی ہوتا تھا اور پیر و مرشد بھی، استاد کی عزت باپ سے بڑھ کر کی جاتی تھی۔ اساتذہ کرام کو بھی شاگردوں سے اس قدر انس ہوتا تھا جیسا باپ کو بیٹوں کے ساتھ۔ طالب علم بھی ایسے ہوتے تھے جو استاد سے زیادہ سے زیادہ علم اخذ کرنے کی جستجو میں رہتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی استاد اور ان کے خاندان سے روحانی باپ کی طرح تعلقات زندگی بھر قائم رہتے تھے۔ جب میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں طالب علم تھا ان دنوں حضرت علامہ حبیبہ ہال میں خطبہ دیا کرتے تھے جو عموماً درس قرآن ہی ہوتا تھا۔ ایم۔ اے اسلامیات کا شعبہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں نیا بنایا تھا۔ یہ شعبہ حضرت علامہ کی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا۔ وہی اس کے بانی تھے، بڑی پروقتار شخصیت کے مالک تھے۔ موصوف کا سراپا اگر بیان کیا جائے تو کچھ اس طرح تھا۔ گورا چٹانگ، باریش، دراز قامت، عموماً شلوار قمیض اور شیروانی پہنا کرتے تھے۔ سر پر جناح کیپ ہوتی تھی۔ کبھی کبھار انگریزی لباس بھی زیب تن فرماتے۔ ماشاء اللہ شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ جو بھی لباس پہن لیتے بھلا معلوم ہوتا تھا۔

بارعب شخصیت کے باوصف جو بھی ان سے ملنے کے لیے آتا بڑی خوش دلی اور ملاطفت سے ہاتھ ملاتے۔ اکثر علماء اور زعماء کو دیکھا اور سنا ہے کہ اگر ان کی انگریزی اچھی ہوتی تو اردو کمزور اور اگر اردو اچھی ہوتی تو انگریزی کمزور۔ مگر حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ بڑی

روانی سے اردو اور انگریزی میں خطاب کرتے رہتے۔ بعض اوقات پنجابی زبان میں بھی بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے اور اسے قطعاً عار محسوس نہ کرتے۔ جیسا کہ بعض اچھے خاصے پنجابی لوگوں کو دیکھا ہے کہ اپنی مادری زبان پنجابی میں بات چیت کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے جب موصوف پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے تو مسلم لیگی زعماء کے ساتھ مل کر پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے انہوں نے بڑے بڑے شہروں کے دورے کیے لوگ ان کی تقریریں بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتے تھے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ قیام پاکستان کے سلسلہ میں علماء و مشائخ کے اثر و رسوخ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا عبدالحامد بدایونی، نواب صفدر یار جنگ، مولانا مفتی محمد شفیع اور علامہ علاؤ الدین صدیقی جیسے علماء کے روح پرور خطبوں نے غیر ملکی اقتدار کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ ان لوگوں کے اثر سے ہی عام لوگوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کی، انہی کی کوششوں سے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کی آواز اللہ کی مخلوق کا نعرہ بنی۔ جب پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو حضرت علامہ نے سیاست کو خیر باد کہہ دیا، اگر وہ سیاست میں ہی رہتے تو خداداد صلاحیتوں کی بدولت ملک کے اعلیٰ سے اعلیٰ سیاسی منصب تک رسائی حاصل کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ مگر انہوں نے محسوس کیا کہ اب انہیں دین اسلام کی خدمت کرنی چاہیے جس کی خاطر ملک حاصل کیا گیا ہے۔ لہذا سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کی داغ بیل ڈالی۔ شعبہ کے قائم کرنے میں شروع شروع میں آپ کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ قطعاً مایوس نہ ہوئے۔ ان دنوں پروفیسر سراج، مٹریو، کرامت، اور پروفیسر رشید صاحبان جیسے حضرات یونیورسٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ جن کا خیال تھا کہ ملک لوگوں کی اقتصادی حالت سنوارنے کے لیے بنا ہے نہ کہ دین اسلام کی خاطر۔ ایسے ”ترقی پسند“ لوگوں نے یونیورسٹی اور کالجوں میں اسلامیات کے مضمون کی ہر لحاظ سے مخالفت کی۔ اگر وہ لوگ زیادہ مجبور ہوئے تو یہ کہہ دیا کہ شعبہ عربی کے نصاب میں دین سے متعلق چند مسائل داخل کر دیئے جائیں۔ آپ نے پرزور انداز میں ایسے

لوگوں کے افکار کی تردید کی۔ بالآخر آپ کے جذبہ صادق کی بدولت ہر مشکل آسان سے آسان تر ہوتی چلی گئی، ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ”خداوندان یونیورسٹی“ نے اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کی وسیع عمارت ہونے کے باوجود شعبہ علوم اسلامیہ کو صرف ایک کمرہ عنایت کیا اور وہ بھی فائن آرٹس کے شعبہ کی بالائی منزل پر۔ وہی ایک کمرہ کلاس روم بھی تھا، لائبریری بھی اور آپ کا آفس بھی۔

حضرت علامہ شروع شروع میں شعبہ کا پورا نظام اکیلے ہی چلاتے رہے بعد میں چند ایسے مخلص رفقاء مل گئے جنہوں نے بغیر کسی معاوضہ کے اس نیک کام میں ہاتھ بٹانے کی حامی بھر لی۔ ان دنوں کلاسیں صبح و شام ہوا کرتی تھیں۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ طلباء کی زیادہ تعداد ہونے کی بنا پر ایسا کرنا پڑا ہوگا۔ نہیں اس کا سبب یہ تھا کہ دفتری اوقات سے پہلے اور پھر دفتروں میں چھٹی کے بعد کے اوقات میں چند طلباء نے ایم۔ اے اسلامیات کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ان لوگوں کی سہولت کی خاطر ایسا کیا گیا۔ علامہ صاحب کی ذاتی کوششوں اور ان کے مخلص معاونین کی بدولت ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شعبہ کا نرم و نازک پودا ایک قد آور درخت کی شکل میں دنیا کے سامنے نمودار ہوا۔ اس مضمون کو نہ صرف سکولوں، کالجوں میں ہی لازمی مضمون قرار دیا گیا بلکہ P.C.S اور C.S.S اور دیگر پروفیشنل اداروں مثلاً میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ یونیورسٹی وغیرہ تک لازمی مضمون قرار دے دیا گیا اور مجموعی کامیابی کی خاطر اس مضمون میں پاس ہونا ضروری کر دیا گیا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ لاہور شہر شروع ہی سے علمی و ادبی مرکز رہا ہے۔ ملک اور بیرون ملک سے جو بھی اکابرین اسلام سے رغبت رکھتے تھے وہ لاہور ضرور آتے۔ سیاسی لوگوں سے رسمی ملاقات کے بعد ان کی دو ہی ترجیحات ہوا کرتی تھیں کہ وہ اچھرہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کریں اور پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ علوم اسلامی میں ضرور جائیں۔ ایسے حضرات علامہ صاحب کی شخصیت اور شعبہ کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوتے۔ سروس کے آغاز میں جب بھی لاہور آتا تو شعبہ میں علامہ صاحب اور ان کے رفقاء جن میں سے بعض میرے ہم جماعت رہے مثلاً پروفیسر امتیاز احمد سعید مرحوم سے ضرور مل کر جاتا تھا۔ ایک روز میں وہاں موجود

تھا تو کراچی سے مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ شعبہ میں تشریف لائے، عالم اسلام اور پاکستان کے مسائل کے علاوہ شعبہ کی کارکردگی کے بارے میں کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

بھلے وقتوں میں میرے عزیز دوست پروفیسر عارف رضا گورنمنٹ کالج مری میں تبدیل ہو گئے وہاں وہ نفسیات پڑھاتے تھے۔ ان دنوں وہاں حافظ محمد ارشد بھی لیکچرار ان اسلامیات کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں حضرت علامہ عارف رضا کے ہاں بطور مہمان قیام پذیر تھے۔ عارف رضا نے مجھے بھی سیر و تفریح کی خاطر مدعو کیا ہوا تھا۔ چونکہ علامہ صاحب ملک کی نامور شخصیت تھے اس لیے ان کے چاہنے والوں کا وہاں تانتا بندھا رہتا۔ دن کے وقت سیر سپاٹے کے دوران بہت سے لوگ سر راہ حضرت علامہ سے ملتے رہتے۔ اس دوران ملکی حالات اور علمی و ادبی بات چیت ہوتی رہتی جس سے سب مستفید ہوتے۔ رات کو کالج ہاسٹل جو چیمہ ہاؤس میں تھا، خصوصی نشست ہوتی جس میں مختلف موضوعات پر کھل کر رات گئے تک گفتگو ہوتی رہتی۔ حضرت علامہ تفرقہ بازی اور تعصب کی بیخ کنی کے لیے تاریخی حوالوں سے اسے صرف انحطاط سے ہی تعبیر نہ کرتے بلکہ اس معاملہ میں اس قدر حساس تھے کہ فرمایا کرتے:

”فرقہ بندی قوموں کے لیے ایک ایسی نحوست ہے جو بالآخر انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔“

امت مسلمہ کے اتحاد و یگانگت کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”اے مسلمانو! ایک ہو جاؤ نیک ہو جاؤ“۔ اور سورۃ طہ کی یہ آیت اپنے خطبات میں بالعموم تلاوت کرتے تھے:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي، فَإِنَّ لَهُ، مَعِيشَةً ضَنْكًا وَ نَحْشُرُهُ،
يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَغْمًى

(جو میرے ذکر یعنی نصیحت سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا تک زندگی ہوگی، اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے)

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کی تشریح کچھ یوں بیان کرتے تھے:

”دنیا میں تنگ دست ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ معاشی لحاظ سے مفلس ہو جائے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر کبیر، ارب پتی ہونے کے باوجود زندگی میں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ وہ اپنے طور پر حقیقی مسرت حاصل کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرے گا مگر کبھی بھی امن و اطمینان کی زندگی سے بہرہ مند نہ ہو سکے گا۔“

حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ مسجد شاہ چراغ میں نماز جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ جو لوگ خالصتاً دین کی باتیں سننا چاہتے وہ دور دراز سے آ کر وہیں نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ موصوف اپنے خطبات میں عالم اسلام اور پاکستان جن مسائل سے دوچار رہا ہے یا ہے ان کا حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقہ پر سامعین کی سیاسی تربیت بھی کرتے رہتے تھے۔ نماز جمعہ جب کبھی میں نے وہاں ادا کی تو ایک بات میں نے بطور خاص نوٹ کی کہ دنیا بھر کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے مگر اپنے بارے کبھی کچھ نہ کہتے۔ یعنی ”آنا ولا غیری“ والی بات ان میں نہ تھی۔ مسجد سے ملحقہ ایک لائبریری انہی کی فرمائش پر قائم تھی جس میں اسلام کے بارے میں ہر قسم کی کتب مہیا کی گئی تھیں، جن سے عوام الناس استفادہ کرتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد وہاں ایک مخصوص علمی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ اس محفل کو اگر سوال جواب کی نشست کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا۔ حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ موجود لوگوں کے ہر قسم کے سوالات کا اس قدر موزوں اور صحیح جواب دیتے کہ حاضرین کے دل اس بات کی گواہی دیتے کہ اس سوال کا واقعی یہی جواب ہو سکتا ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ راہنمایان قوم، اساتذہ کرام، علماء اور وہ نوجوان جوان کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ حضرت علامہ ان کے سامنے اسلامی تعلیمات بالخصوص کلام الہی کی تفسیر اور شرعی مسائل کی تشریح کچھ اس انداز میں بیان کیا کرتے کہ حاضرین کی پیشانیاں نور ایمان سے جگمگانے لگتیں۔

حضرت علامہ علاء الدین صدیقیؒ جب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو اس قدر بڑے منصب پر فائز ہونے اور بے پناہ مصروفیت کے باوجود شعبہ اسلامیات سے اپنی پرانی رفاقت کو بدستور قائم رکھا۔ گھر سے جو کھانا منگوایا کرتے حسب سابق ان کی کوشش ہوتی کہ شعبہ اسلامیات میں ہی اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر تناول کریں۔ وہیں نماز ظہر ادا کرتے اور اگر وقت ہوتا تو ہلکے پھلکے انداز میں محفل کو خوب گرماتے۔ ظرافت، بذلہ، سنجی، لطیفہ گوئی اور بزم آرائی ان کی زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔



بیاد علامہ پروفیسر علاء الدین صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

☆ پروفیسر راؤ محمد یسین خان ☆

اللہ کریم کے فضل سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں علامہ مرحوم و مغفور کے زیر سایہ سال اول میں داخلہ لیا۔ میں نے سیاسیات میں داخلہ کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ جو بی۔ اے کے زمانہ سے ہی تھا کیونکہ گورنمنٹ کالج منٹگری پنجاہ کا اہم ترین اور قدیم کالج تھا اور اس کا ماحول بھی سیاسی تھا۔ بہر حال میں داخلہ فیس رواجبات جمع کروا رہا تھا کہ میرے والد اور سر مرحوم آپہنچے۔ میرے ایک عزیز پروفیسر عبدالرحمن خان قصوری جو ۱۹۶۱ء میں علامہ صاحب کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب بھی اس کلاس میں ہی تھے اور علامہ صاحب مذکور بھائی کے پیچھے نماز بھی پڑھتے تھے۔ ان بزرگوں کی ترغیب پر شعبہ اسلامیات میں داخلہ لے لیا۔ علامہ صاحب نے صدیقی صاحب کو مقرر کیا کہ ان چند طلباء کو بی۔ اے عربی کی تدریس کروائیں۔ صدیقی صاحب نے اس کے علاوہ بھی جو کچھ پڑھایا اس نے قلب و ذہن روشن کر دیا۔ دونوں صاحبان سے رابطہ قائم ہو گیا۔ شعبہ کے دیگر اساتذہ جو نہایت محنتی اور مؤقر تھے، ان میں پروفیسر محمد اسلم مرحوم، ڈاکٹر امان اللہ خان، پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم کے علاوہ کچھ جزوقتی استاد تھے۔ ڈاکٹر خالد علوی صاحب کا پہلا لیکچر ہماری کلاس سے شروع ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی، ماضی اور تعلیمی مراحل طے کرنے کی تمام سعی اور دوڑ دھوپ کے تلخ حالات و واقعات دلچسپ انداز میں بیان کیے۔ جو میرے لیے نقش اول کی طرح تھے۔ بکریاں چرانے، کھمبوں کی روشنی میں پڑھنا، جھگڑے ہونے کی وجہ سے مختلف مدارس دیدیہ میں تعلیم حاصل کی اس قسم کے موضوعات تھے۔ بعد میں چند ماہ تک کتاب و سنت کا معاشرتی نظام پڑھاتے رہے۔ صدیقی صاحب فقہ پڑھاتے تھے اور خان صاحب

☆ صدر شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی رائے ونڈ روڈ لاہور

تاریخ کا پرچہ۔ محترم حافظ نذر احمد صاحب مرحوم قرآن مجید کا پرچہ اور ملک محمد اسلم صاحب مرحوم حدیث کا پرچہ پڑھاتے رہے اور داڑھی والے ہر طالب علم کو مولوی صاحب کہتے تھے۔ نہایت شفیق اور محنتی پروفیسر تھے۔ علامہ صاحب کے پہلے شاگرد تھے۔ آپ نے جھونپڑی بنا کر تدریس کا آغاز فرمایا اور اسلامی علوم کی تعلیم کا بیج بویا۔ ملک صاحب اہل حدیث تھے اور اپنا مسلک زیادہ بیان کرتے تھے لیکن تمام مسلکوں پر وسعت قلبی سے بات کرتے اور پسند فرماتے تھے تاکہ طلباء مسلکوں کے چکر سے نکل سکیں۔ کتاب و سنت کی فہم پیدا ہو جائے۔

علامہ مرحوم کی اہم یادگار شعبہ اسلامیات کا سنگ بنیاد ہے۔ علامہ مرحوم کی ذات میں بہت سی صفات تھیں۔ قائد اعظم کے ساتھ جنرل سیکرٹری مسلم لیگ بھی رہے اور بے لوث خدمات انجام کیں۔ نہایت خوبصورت شخصیت تھی۔ فن تقریر کے ماہر، کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ الفاظ کی ادائیگی خوبصورت انداز میں فرماتے۔ طریقہ تدریس نہایت آسان تھا۔

يَسِّرُوا وَلَا تَعْسِرُوا کا خیال فرماتے۔

علمی ماحول بین الاقوامی سطح پر قائم کیا۔ اسلامی ممالک، چین، جاپان اور دیگر بیرونی ممالک کے علماء آتے جاتے رہتے اور طلباء کو لیکچر دیتے تعارف اور تبادلہ خیال کرتے۔ اس دور کی تصاویر اور گروپ فوٹو دیکھ کر میں اپنا ماضی تازہ کر لیتا ہوں۔ ملکی علماء اور مشائخ، مفتی محمد شفیع (مفتی اعظم) مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا محمد یوسف بنوری اور کئی علماء کو گاہے گاہے شعبہ میں رونق افروز دعوت خطاب دے کر طلباء کی علمی پیاس کا سامان تسکین بنتے رہتے تھے۔ حافظ نذر محمد صاحب تو اکثر علامہ کے پاس ہی نظر آتے تھے۔

طریقہ تدریس کے اہم خدو خال میں آسان طریقہ تعلیم، محبت و شفقت، اصلاحی پہلو، بزرگوں کی تعظیم، غور و فکر کی تلقین، علم و عمل میں تطبیق، حسن سوال نصف العلم کا طریقہ، اختصار، غور و فکر کی تلقین، کردار سازی، تعمیر شخصیت کے علاوہ مکالماتی انداز پر بہت زور دیتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان کے علماء مجھے کہتے ہیں کہ تم نے ہندومت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر کے اسلام کی کون سی خدمت کی ہے، اس کا فائدہ ہی کیا ہے۔ علامہ صاحب اس سوال پر گھنٹوں گفتگو کرتے کہ ضدین کے مطالعہ سے فائدہ ہوتا ہے

باطل کا کھوج لگایا جائے اس سے اصل دین کی فہم پیدا ہو سکے گی۔ باطل پاش پاش ہوگا۔ اصل دین کا تصور ادیان باطلہ کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

مسجد چراغ شاہ (ہائی کورٹ لاہور) میں جمعۃ المبارک کا خطبہ دیتے تھے۔ جس میں حج حضرات، قانون دان، دانشور اور طلباء ہوتے تھے۔ گاہے بگاہے میں نے بھی جمعہ وہاں ادا کیا۔ بہت مؤثر خطبہ ہوتا تھا۔ مفسر قرآن علامہ اسد (یہودی) کے اسلام لانے کا سبب بنا۔ علامہ صاحب انگریزی بولنے پر پوری طرح مہارت رکھتے تھے۔ وکالت بھی کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے۔ بانی پاکستان کے ساتھ کام کیا۔ اور اس سیاسی بنیاد کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ پوری زندگی دس مرلہ کے مکان میں گزار دی اور اسی گھر سے سفر آخرت کیا۔

ہماری کلاس میں طالبات ۸۰ کے قریب تھیں اور طلباء ۲۰ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم نسواں بہت اہم ہے۔ مرد کا علم فرد کا علم ہے اور عورت کا علم قوم کا علم ہے۔ کئی بار کہتے کہ ان طالبات کو دعوت دین کے لیے جانا چاہیے۔ دعوت دین کو پسند کرتے۔ داعی کا لفظ ان کی زبان پر اکثر رہتا تھا۔ ایک بار نیلا گنبد جامع اشرفیہ میں مولانا محمد یوسف رئیس تبلیغ کی تقریر کئی گھنٹے سن کر روتے رہے۔ ایک اور جلسہ میں جامع بلال پارک (مرکز) حضرت جی کی پوری تقریر پوری توجہ سے سنی حضرت مولانا احمد علی لاہوری بھی ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ خوش ہو کر کہنے لگے ”مجھے علاؤ الدین جیسے شیر چاہئیں“ اکثر حضرت لاہوری کے ہاں شیرانوالہ مسجد میں درس قرآن میں شرکت کرتے رہتے تھے۔

استاد مرحوم و مغفور نہایت وجیہ اور روشن جبین تھے۔ چہرہ انور دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ چہرہ پر خوبصورت داڑھی تھی، پروقار چہرہ تھا۔ ملن سار و سعت قلبی بہت تھی۔ مسائل پر قابو پانا اور حل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دلائل اور قانونی زبان جو اخلاص سے معمور ہوتی تھی استعمال کرتے، دل آزاری نہ کرتے۔ ہماری کلاس میں مختلف مسالک (روپڑی) قادیانی طالب علم اور دیگر بھی تھے۔ علامہ صاحب مختلف موضوعات پر بحث کرواتے اور خاموش رہتے۔ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر غیر واضح رویہ اختیار کیا میں خود پریشان ہو کر حضرت

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے پاس گیا انہوں نے وضاحت فرمائی کتابیں بھی دیں اور دعا بھی۔ اگلے پیریڈ میں پھر اس موضوع پر بات ہوئی اور علامہ صاحب نے وضاحت فرمائی۔

علامہ صاحب علم و ادب سے دلچسپی رکھتے، نعتیں اور عارفانہ کلام سنتے اور خوش ہوتے۔

مختلف زبان رکھنے والوں سے ان کی زبان میں سنتے اور پسند فرماتے۔ اس دور میں شعبہ

اسلامیات جو بن پر تھا طلباء میں خدمت کا جذبہ تھا۔ اولڈ بوائز کی میٹنگ ہوتی تھی۔ ڈاکٹر

طاہر القادری اور مختلف محکموں کے افسران شامل ہوتے اور رابطہ تازہ ہوتا رہتا۔ ۱۹۶۷ء میں

پاکستان بھر میں مغربی پاکستان کمیشن میں ۷۷ آسامیاں (انسٹرکٹر اسلامیات) کی آئیں اور

ہمارے ایک سینئر ساتھی (محمد اسماعیل طائر) S.O (TE) ایجوکیشن نے پیدا کیں اور وہ ڈٹ گئے

کہ ٹیکنیکل اداروں میں بی۔ اے۔ بی ایڈ کی بجائے ایم۔ اے اسلامیات ہی اس کے اہل ہیں۔

مجھے یہ بات خود انہوں نے بتائی۔ علامہ صاحب سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی رابطہ رہا۔ آپ کی

ہمشیرہ کے جنازہ میں بہت بڑا ہجوم شامل ہوا اور گھوڑے شاہ قبرستان تک بڑھتا ہی چلا گیا۔

ایک بار میں بی۔ اے کے پرچوں کی آزمائشی قسط لے کر گیا۔ کمرے کا دروازہ

کھولا، مجھے بٹھالیا اور کہنے لگے راؤ صاحب میں ساری دنیا میں پھرنے والا آج اس کمرے میں

قیدی بن گیا ہوں، آپ باتیں کریں۔ T.I محمد اکرم (اسٹنٹ) کو چیک کروالیں۔ میں

گھنٹوں بیٹھا رہا اور دل پسند باتیں سن کر واپس آیا۔

آخری ملاقات جو وفات سے چند ماہ پہلے ہوئی میرے ساتھ میرے رفیق کارڈاکٹر

بقا محمد مرحوم کیمیکل انجینئر تھے جو ضیاء شاہد (خبریں) کے بڑے بھائی تھے۔ کافی دیر باتیں

ہوئیں ڈاکٹر صاحب بھی مہتمم جامعہ رشیدیہ کے بھانجے تھے۔ بہت اچھے انسان تھے۔

پھر چند دن بعد اطلاع ملی کہ علامہ صاحب وفات پا گئے ہیں۔ گھر پر حاضر ہوا۔

بانس جوڑے گئے۔ ہر آنکھ نمدا رہی۔ اشک بار تھی۔ گھوڑے شاہ قبرستان تک یہی نوبت رہی

میں نے اسی دن علامہ صاحب کے قریب گھر بنانے کا فیصلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول

فرمائی۔ موڑسمن آباد (گلشن راوی) کے قریب اللہ پاک نے چھت دے دی ہے۔ اور آتے

جاتے روزانہ یاد آوری ہوتی رہتی ہے۔ اور سمن آباد میں روڈ کا نام بھی علامہ علاؤ الدین صدیقی

روڈ ہو گیا ہے۔ استاد محترم بانی صدر شعبہ، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، چیئر مین اسلامی مشاورتی کونسل کے عہدہ پردس بارہ سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اخبارات میں پہلے صفحہ پر آپ کا بیان بمعہ تصویر آیا کرتا تھا۔ دہنگ اور طاقتور چیئر مین کے طور کام کرتے رہے۔ آپ کی محنت سے علوم اسلامیہ کا دیا جلا۔ پھر سینکڑوں دیے جلے۔ درس گاہوں میں نور دین پھیلا اور بالآخر اسلامیات نصاب میں شامل ہوا اور آج لازمی مضمون بھی ہو گیا ہے۔ اللہ پاک اجر عظیم سے نوازے اور ان کی کوشش قبول فرمائے۔ درجات بلند فرمائے۔ آمین ثم آمین۔



علامہ علاء الدین صدیقی کی شاعری

ڈاکٹر زاہد منیر عامر ☆

عرفی شیرازی نے حکیم اور شاعر کی آویزش میں یہ قول فیصل پیش کیا ہے کہ حکیم، گوہر کی خاصیت پر نظر رکھتا ہے جبکہ شاعر اس کے رنگ روپ کا شیدائی ہوتا ہے۔ دونوں کا مورد نگاہ ایک ہونے کے باعث عرفی کے نزدیک حکیم و شاعر کے درمیان جنگ بے سود ہے۔ یہ زندگی کا رنگ روپ ہی تو ہے جو دل میں سوز و گداز پیدا کرتا ہے اور سوز و گداز کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے یہاں تک کہ اگر صداقت بھی سوز سے خالی ہو تو اس میں کمی رہ جاتی ہے۔

حق اگر روزی ندارد حکمت است
شعری گردد چو سوز از دل گرفت

(اقبال)

وہ مرحلہ عمر جب زندگی کی نگاہ التفات لمحہ کھل رہی ہوتی ہے۔ انسانی طبائع کو زندگی کے حسین پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بنا کرتا ہے اور اسی التفات سے شعر جنم لیتا ہے۔ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ آغاز شباب میں شعر و شاعری سے دلچسپی زیادہ ہوا کرتی ہے بہت سے نوجوان شعر کہنا بھی شروع کر دیتے ہیں گو شعر سب کا تعارف نہیں بنتا۔

علامہ علاء الدین صدیقی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جانا چاہیے۔ اوائل شباب میں شعر کی دیوی جن پر مہربان ہوتی تھی، گو بعد ازاں وہ کوچہ شعر سے نکل گئے لیکن ابتدائے عمر کے کچھ نقوش ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر کی دیوی کے اس التفات کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

☆ اسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی

صدیقی صاحب ۳ نومبر ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے تھے ان کی جو شاعری ہم تک پہنچی ہے اس کا زمانہ تخلیق ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۰ء تک کے عرصے میں محدود ہے یہ ان کی طالب علمی کا زمانہ ہے۔ ۱۹۰۷ء سنہ ولادت کی روشنی میں یہ سترہ (۱۷) سے تیس (۲۳) سال کی عمر تک کی شاعری ہے جو ظاہر ہے کہ عین عنقوان شباب کا دور ہے۔

اس شاعری میں وہ رنگ ڈھنگ موجود ہے جو اس عمر کی شاعری میں ہونا چاہیے تھا۔ ان کی اردو غزلیں جو کالج کے طرحی مشاعروں کے لیے لکھی گئیں۔ شاعر کے غزل خوانی کے روش عام پر چلنے کا پتا دیتی ہیں:

پوچھا سب ہجوم کا کہنے لگے کہ ہاں
جس شاخ پر ہو گل وہاں بلبل نہ جائے کیوں
اس شمع رو کا جلوہ رخسارِ ناصحا
دیکھے اگر تو پھر ہمیں سمجھانے آئے کیوں

(جنوری ۱۹۲۷ء)

چشمِ باطن کے ہمیشہ سامنے رہتا ہے تو
کیا ہوا جو ظاہری آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

(جنوری ۱۹۲۵ء)

یہ اشعار معمول کے مطابق ہیں۔ خلاف معمول بات یہ ہے کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ غیر معمولی مذہبی شغف کا حامل ہے چنانچہ ان کے ہاں ظہور پانے والے اکثر جذبات و احساسات کا تعلق مذہب، مذہبی تعلیمات اور مذہبی شخصیات سے ہے۔

صدیقی صاحب نے تین زبانوں اردو، پنجابی اور فارسی میں شاعری کی، اردو میں مذکورہ غزلیات کے علاوہ ایک دعائیہ قطع اور شعر، حضرت حامد قادری کی مدح میں ایک مسدس (جنوری ۱۹۲۵ء) اور ایک مثنوی خلیفہ عمر کا انصاف (۱۲ اگست ۱۹۲۵ء) شامل ہیں۔ جبکہ پنجابی میں شیخ فرید الدین عطارؒ (۵۱۳ھ - ۶۲۷ھ) کے پندنامہ کی حمد کا ترجمہ اور فارسی میں ایک دعا، ایک رباعی اور ایک سلسلہ سہروردیہ کا شجرہ طریقت شامل ہیں۔

عین ممکن ہے کہ انہوں نے ان تخلیقات کے علاوہ بھی کچھ کہا ہو لیکن ان کی محفوظ بیاضوں سے ہم تک یہی کچھ پہنچا ہے۔ صدیقی صاحب کا کلام 4.5×7 ، 4×6 ، 3.5×5 سائز کی تین مختصر بیاضوں میں محفوظ ہے جن میں متعدد مقامات پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ ایک غزل کے مقطع میں تخلص انجم بھی استعمال ہوا ہے۔

نے یار مہرباں ہے نہ قسمت میں یاوری
انجم پھر ایسے حال میں مقصد برآئے کیوں

اس شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم نظام تعلیم کے مطابق صدیقی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت عربی و فارسی کے کلاسیکی گہواروں میں ہوتی تھی، ان دونوں زبانوں اور ان کے کلاسیکل لٹریچر کے اثرات و ثمرات کی صدیقی صاحب کی اس مشق سخن میں صاف نظر آتے ہیں۔

اس زمانے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا آغاز شیخ مصلح الدین سعدی کی کریم اور شیخ فرید الدین عطار (۵۱۳ھ - ۶۲۷ھ) کے پندنامہ جیسی کتابوں سے ہوتا تھا واقع یہ ہے کہ یہ کتابیں جنہیں طویل نظمیں کہنا چاہیے شخصیت و مزاج کی بنیادیں بنادینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ صدیقی صاحب نے عطار کا پندنامہ درسی ضرورت سے پڑھا ہوگا لیکن وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کے منظوم پنجابی ترجمے کا ڈول ڈالا اور آغاز کی حمد کا پنجابی ترجمہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔

شیخ عطار کا پچاس صفحے کا یہ رسالہ حمد و نعمت، نفس امارہ کی مخالفت، خاموشی کے فوائد، اخلاص فی العمل، سیرت پادشاہاں، حسن خلق، مہلکات، اہل سعادت کے اوصاف، عافیت، تواضع، درویشوں کی صحبت کے بیان، شقاوت، ریاضت، عافیت، مجاہدات نفس فقر، خودستائی و خودرائی کے تعارف، عقلا اور احمقوں کی علامات، نیکی، ذکر، خشم و غضب، دنیا کی بے ثباتی، اسباب زوال سلطنت، خوش گوار زندگی تسلیم و رضا معرفت الہی، تقویٰ، صدقات، خدمت مہمانداری، قناعت، سخاوت علامات اہل جنت، صبر، تجرید و تفرید، دوستی غم خواری، رحم اور غفلت جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

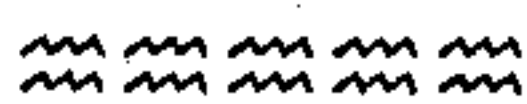
مشرق کی جملہ کلاسیکی تصانیف کی طرح اس کا آغاز بھی حمد باری تعالیٰ عز اسمہ سے ہوتا ہے جس میں اللہ جل شانہ کی عظمت و بزرگی کے ساتھ اس کے کمالات اور ہر طرح کی صورت حال پیدا کر دینے پر قادر ہونے کا بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں کہے گئے یہ پچیس اشعار اسلام کے تصور توحید کا تعارف ہیں۔

ان اشعار کو ترجمہ کے لیے منتخب کرنا بجائے خود شاعر کے فکر و خیال کی سمت کو واضح کر دیتا ہے۔ قارئین کرام پہلے ”پند نامہ“ سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں بعد ازاں ہم صدیقی صاحب کی بیاض سے ان کا ترجمہ پیش کریں گے:

آ نکہ ایمان داد مشت خاک را	حمد بی حد مر خدای پاک را
داد از طوفان نجات او نوح را	آ نکہ در آدم دمید او روح را
تا سزائی کرد قوم عاد را	آ نکہ فرمان کرد قہرش باد را
دیگری را تاج بر سر می نہد	آں یکی را ارہ بر سر لی کشد
عالمی را در دی ویران کند	اوست سلطان ہر چہ خواہد آن کند
کس نمی آرد کہ آن جادوم زند	طرفۃ العینی جہان برہم زند
بندگان را دولت و شاہی دہد	آ نکہ با مرغ ہوا ماہی دہد
عقل را در مہد گویا او کند	بی پدر فرزند پیدا او کند
این بجز حق دیگری کی می کند	مردہ صد سالہ را حی می کند

اب صدیقی صاحب کی بیاض سے ان اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

آکھاں حمد بے انت اس رب تائیں بک مٹی نوں جو ایمان دیوے
 حکم نال جیندے آدم روح ملیا ضرر نوح نوں نہ طوفان دیوے
 جیہڑا عاد دی قوم برباد کردا جدوں ہوا نوں قہر فرمان دیوے
 بدلے اگ نوں نال پھلواڑ دے جو لو نیڑے نہ یار دے آن دیوے



اک نوں آرے تھیں چیر کے پار کردا اک نوں بخش کے تاج سلطان کردا
 او یو بادشہ کرے جو آپ چاہے دنیا پلک دے وچ ویران کردا
 ~~~~~

کیڑا مار سکے دم اوس اگے جیہڑا پلک وچ دنی ویران کردا  
 مچھی کھان نوں دے پنچھی اڑدے نوں عاجز بندے نوں چا سلطان کردا  
 بناں باپ دے کرے او پت پیدا جاتک وچ پنگوڑے بلا وندا اے  
 سیاں ورہیاں دے مرے نوں اوس باہجوں کیڑا ہے جو فیر جو وندا اے  
 ~~~~~

شاعر نے کس حد تک اصل متن کا ساتھ دیا ہے قارئین کرام اس تقابل سے بخوبی
 اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس ترجمے کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ پندنامہ کی اس حمد کا ترجمہ صدیقی
 صاحب کی دو مختلف بیاضوں میں موجود ہے۔ سب سے چھوٹی تقطیع کی بیاض (3.5x5) اور
 متوسط تقطیع کی بیاض (4x6) کے متون میں کچھ اختلافات بھی ہیں جو ترجمے پر نظر ثانی کا پتا
 دیتے ہیں۔ چونکہ متوسط تقطیع کی بیاض میں موجود ترجمہ بہتر ہے (اور اس سے مندرجہ بالا
 انتخاب نقل کیا گیا ہے) اس لیے زمانی اعتبار سے اسے موخر قرار دیا جاسکتا ہے۔

سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ چھوٹی بیاض میں اشعار کا ترجمہ مصرع وارد درج کیا گیا
 ہے جبکہ متوسط تقطیع والی بیاض میں ایک شعر کا ترجمہ ایک مصرع میں کیا گیا ہے۔ ہیر کی مقبول بحر
 میں کیا گیا ترجمہ دونوں مقامات پر ایک ہی ہے فرق اندراج کے طریق کار کا ہے۔
 متنی اختلافات درج ذیل ہیں:

مٹھی خاک کی جگہ بک مٹی (شعر ۱) بدلے آگوں کی جگہ بدلے آگ نوں (شعر ۲)
 جان خاک تے اک ہلکان کردا کی جگہ جان پوہلی تے اک ہلکان کردا (شعر ۱۸) بچہ کی جگہ
 جاتک (شعر نمبر ۲۱) سواں کی جگہ سیاں (شعر ۲۲) وانگ اوسدے نہیں ہے ہو رکوئی کی جگہ نہیں
 اوسدے وانگ ہے ہو رکوئی (شعر ۲۵) اور بہت کوئی جگہ بہتا (شعر ۲۸)
 پہلے متن میں پندنامہ کے تیرھویں شعر کے دو ترجمے لکھے گئے تھے:

اویو بادشا کرے جو آپ چاہے
دنیا پلک دے وچ ویران کردا

اور

اودہی بادشاہی منی کل جائے
کیڑا ایس دے وچ کلام کردا

نظر ثانی میں دوسرا ترجمہ خارج کر دیا گیا (اور اسے ہی خارج ہونا چاہیے تھا)
فارسی سے جو دلچسپی شیخ عطار کے اشعار کے پنجابی ترجمے کا سبب بنی اس کا اظہار
فارسی میں شعر کہنے کی صورت میں بھی ہوا ہے۔ فارسی میں صدیقی صاحب کے ایک دعا (۲۹
جون ۱۹۳۰ء) ایک رباعی اور سلسلہ سہروردیہ کا شجرہ طریقت ملتے ہیں۔ دعا، فارسی کی مقبول بحر
واہنک میں ”بفریادم برس یارب“ کی ردیف کے ساتھ غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ چند
اشعار ملاحظہ ہوں۔

گنہگارم سیہ کارم بفریادم برس یا رب
بجز تو کس نمی دارم، بفریادم برس یا رب
کریم و کار ساز (۱) ہستی، شہ بندہ نواز (۱) ہستی
بسا از لطف خود کارم بفریادم برس یا رب
تو غفار الذنوب استی تو ستار العیوب استی
من انبار گناہ دارم بفریادم برس یا رب

اس دعا کے آخری چار اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب نے یہ دعا اپنے
والد گرامی فیروز الدین صاحب کی فرمائش پر، انہی کی طرف سے لکھی ہے۔ چودھویں شعر میں تو
 واضح طور پر بتایا گیا ہے:

برای من نوشته است این مناجاتی علاء الدین
بدر بار تو می آرم بفریادم برس یا رب

دعا میں فیروز الدین صاحب کی دو آرزوؤں کا بھی تذکرہ ہے: منور (علامہ

علاؤالدین صدیقی کی اہلیہ) کے لیے اولاد زینہ کی اور دوسرے علاؤالدین (شاعر) کے لیے اعلیٰ رتبے کی آرزو۔ پہلی آرزو کے بارے میں تو ہمیں علم نہیں کہ وہ کس شکل میں پوری ہوئی البتہ دوسری آرزو کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس دعا کو اللہ کے ہاں درجہ اجابت حاصل ہوا اور ۱۹۳۰ء میں مشق سخن کرنے والا شاعر، علاؤالدین انجم بڑا ہو کر علامہ علاؤالدین صدیقی بنا اور اس کے سر پر ملک کی سب سے بڑی اور قدیم دانش گاہ کی ریاست کا تاج رکھا گیا۔

صدیقی صاحب نے متوسط تقطیع کی بیاض کے آغاز میں لکھا ہے کہ یہ کلام بندہ علاؤالدین صدیقی کا کہا ہوا ہے اور ابھی کسی کو دکھایا نہیں ہے۔

کلام کے مطالعے سے دونوں باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ان کی شاعری کی حیثیت آغاز سفر کے ایک نقش کی سی ہے لیکن اس کی مدد سے ان کی بنیادی تربیت، ماحول، مزاج اور شخصیت کے دوسرے تشکیلی عناصر کو سمجھا جاسکتا ہے۔



عالمی اسلامی مذاکرہ

محترمہ نوشین قدسیہ ☆

پنجاب یونیورسٹی اپنے آغاز ہی سے قومی اور عالمی سطح پر علمی، ادبی و فکری مجالس کے لیے ممتاز رہی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں کل پاکستان اوری انٹل کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں پاکستان کے علاوہ ترکی، مصر، ایران، انڈونیشیا اور بھارت کے نمائندے شریک ہوئے۔

دوسرا بڑا اجتماع بین الاقوامی اسلامی کلوکیم تھا جو پنجاب یونیورسٹی کے زیر انتظام ۲۹ دسمبر تا ۸ جنوری ۱۹۵۸ء لاہور میں منعقد ہوا۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اسلامی کلوکیم کا انعقاد پنجاب یونیورسٹی اور لاہور کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ (۱)

علامہ علاء الدین صدیقی (صدر و موسس شعبہ علوم اسلامیہ) نے اس کلوکیم میں جوائنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے نمایاں کردار ادا کیا۔ لہذا اسی نقطہ نظر سے یہاں اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اس عظیم اجتماع کے انتظام و انصرام کے لیے مندرجہ ذیل حضرات گرامی پر مشتمل ڈائریکٹوریٹ قائم کیا گیا:

چیئر مین

جناب محمد افضل حسین ایم ایس سی،

وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

جناب ڈاکٹر مولوی محمد شفیع

صدر شعبہ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

ڈائریکٹر انچارج تعلیمی امور

☆ دختر جناب ڈاکٹر قاری طاہر، فیصل آباد

(۱) صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب، ۲۹۰

جوائنٹ ڈائریکٹر
جوائنٹ ڈائریکٹر

جناب کیپٹن ایم بشیر، رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی
علامہ علاء الدین صدیقی،

صدر شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

جناب ایم۔ ایم افضل، سیکرٹری بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور
جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صدر شعبہ صحافت، پنجاب یونیورسٹی
جناب ایم اے عزیز بٹ، صدر شعبہ ہسپانوی، پنجاب یونیورسٹی
اس موقع پر شائع ہونے والی ڈائریکٹری سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس مذاکرہ کے موقع
پر مسلم آرٹ اور ثقافت پر مبنی ایک عالمی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس نمائش کے ذمہ دار
حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

سرپرست اعلیٰ

جناب میجر جنرل سکندر مرزا، صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

سرپرست

جناب ملک محمد فیروز خان نون، وزیراعظم پاکستان

ایضاً

جناب سید امجد علی، وزیر خزانہ حکومت پاکستان

ایضاً

جناب کے۔ کے۔ دتہ، وزیر تعلیم حکومت پاکستان

ایضاً

جناب اے۔ کے فضل الحق، گورنر مشرقی پاکستان

ایضاً

جناب اختر حسین، گورنر مغربی پاکستان

ایضاً

عزت مآب نواب صادق محمد خاں عباسی، امیر بہاول پور

ممبران کمیٹی:

چیئرمین

جناب ممتاز حسن، سیکرٹری خزانہ حکومت پاکستان

سیکرٹری

جناب ڈاکٹر محمد باقر، صدر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی

خزانچی

جناب راؤل کوریل، ڈائریکٹر آرکیالوجی

ممبر

جناب آئی۔ ایچ زبیری، مشیر تعلیم حکومت پاکستان

ممبر

جناب میاں محمد سعد اللہ، ریکارڈ کیپر حکومت مغربی پاکستان، لاہور

جناب پیر سید حسام الدین شاہ راشدی، ڈائریکٹر سندھی ادبی بورڈ، کراچی

جناب ایم ولی اللہ خان، سپرنٹنڈنٹ آرکیالوجی، مغربی پاکستان لاہور ممبر
 جناب پروفیسر مولانا عبدالعزیز میمن، صدر شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی ممبر
 جناب میاں ایم اے رفیع، کراچی ممبر
 جناب خان بہادر عبدالرحمن چغتائی، لاہور ممبر
 جناب ڈاکٹر اے۔ ایچ دانی، ریڈر ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ ممبر

ڈائریکٹری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بین الاقوامی اسلامی کلوکیم میں دنیا کے بیشتر ممالک کے اہل علم حضرات نے شرکت فرمائی اور مقالات پیش کیے۔ ان اہل علم کا تعلق پاکستان، مصر، شام، عراق، سعودی عرب، ایران، ترکی، انڈونیشیا، سوڈان، برما، کینیا، مراکش، ازبکستان، ہندوستان، افغانستان، روس، برطانیہ، ناروے، جرمنی، کینڈا، ہالینڈ، فرانس، سپین، تھائی لینڈ وغیرہ سے تھا۔ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب کے مؤلف کے بقول ”اس کلوکیم میں مختلف ملکوں اور قوموں کے نمائندے اپنے اپنے رنگ و لباس میں شریک ہوئے۔ بعض حساس موضوعات اور نازک مسائل پر شدید مباحث بھی ہوئے۔ تاہم دور حاضر کے احوال و ظروف میں اسلامی نظریات، اسلامی تاریخ و ثقافت اور روایات کو سمجھنے اور پیش کرنے کی یہ ایک مفید کوشش تھی“۔ (۱)

بعض شرکاء کا تعارف حسب ذیل ہے:

جناب ابو عبد اللہ دراز: الازہر یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔
 انہوں نے پیرس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی اس وقت کی اہم مطبوعات میں سے چند درج ذیل ہیں:

المختار من كنوز السنة المحمدية

النبأ العظيم

نظرات في القرآن

كلمات في مبادئ فلسفة الاخلاق

(۱) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، تاریخ جامعہ پنجاب، ۲۹۰

جناب پروفیسر عبدالعزیز میمن (پاکستان): ایک طویل عرصے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی کے استاد و صدر رہے۔ ۱۹۵۴ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے ڈائریکٹر اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر ہوئے۔ ازاں بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی بطور صدر خدمات سرانجام دیں۔ علامہ میمن کو علوم عربیہ پر کامل دسترس حاصل تھی۔ اپنی علمی جلالت و عظمت کی بنیاد پر دمشق اور قاہرہ کی بین الاقوامی شہرت کی حامل علمی اکیڈمیوں کے ممبر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان کی تالیفات بے شمار ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

ابو العلاء و ما الیہ

سمط اللالی شرح کتاب الامالی

فہرست خزائن الادب وغیرہ

محمد فواد سیزگین (ترکی): استانبول یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ آرٹس کالج (استانبول) میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ عصر حاضر میں ڈاکٹر فواد سیزگین کا نام ان چند چوٹی کے مسلمان اہل علم میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی اور معتزین کا مسکت جواب دیا۔ ان کی تالیفات میں درج ذیل معروف ہیں:

ابو عبیدہ معمر بن المثنی

مصادر البخاری

Geschichte De Arabischeu Schriftums

آخر الذکر کتاب علوم اسلامیہ پر کام کرنے والوں کے لیے ایک معتمد حوالہ جاتی

کتاب ہے۔

علی حسن عبدالقادر (مصر): الازہر یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے جرمنی اور انگلینڈ سے بالترتیب ڈی فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ الازہر کے ریکٹر کے عہدہ کے علاوہ ملک و بیرون ملک اہم مناصب پر فائز رہے۔ ان کی تالیفات درج ذیل ہیں:

کتاب الرياضة کتاب المعتزلة

عمر بہاؤ الدین الامیری (شام): Aleppo کے لاء کالج میں اسلامی ثقافت کے پروفیسر رہے۔ شام کی طرف سے سعودی عرب اور پاکستان میں سفیر بھی رہے۔
 الشدیقی ٹینگلو محمد حبیبی (انڈونیشیا): انڈونیشیا میں علم حاصل کیا۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ تالیفات درج ذیل ہیں:
 الاحکام (۶-۱ اجزاء)

الاسلام

تفسیر القرآن الکریم (۱۵-۱ اجزاء)

حدیث پر کتاب (۱۰-۱ اجزاء)

ابوبکر محمد عبدالعزیز (برما): لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ زاہرہ کالج کولمبو میں پرنسپل رہے۔ کولمبو کی سینٹ کے ممبر بھی تھے۔ سیلون کے مسلمانوں کے لیے سکالر شپ فنڈ قائم کیا۔ مجلس اساتذہ برما کے صدر تھے۔ تالیفات میں چند یہ ہیں:

1. Hundred Years of Muslim Education in Ceylon
2. Arabi Pasha in Ceylon

ڈاکٹر محمد باقر (پاکستان): لندن یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے منسلک ہو گئے۔ اس شعبہ کے سربراہ بھی رہے۔ چند تالیفات درج ذیل ہیں:

۱۔ لاہور ماضی اور مستقبل (اردو)

۲۔ تاریخ ساسانی (اردو)

۳۔ احوال و اسرار جو یا تبریزی (فارسی)

ڈاکٹر محمد شفیع (پاکستان): صدر شعبہ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ کیمبرج سے فارغ التحصیل تھے۔ کیمبرج اور ادوری انیٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کے پرنسپل رہے اور شعبہ عربی میں بھی تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ شعبہ اسلامیات میں بھی اعزازی طور پر تدریس کی۔

ڈاکٹر شفیع ایک بہترین استاد اور اعلیٰ پائے کے محقق تھے۔ ان کی بعض تالیفات مغرب میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئیں۔ ان کی چند تالیفات حسب ذیل ہیں:

عبدالنبی قزوینی کی کتاب کو ایڈٹ کیا۔

تمتہ صوان الحکمة

مطلع السعدین

العقد الفرید کے اشاریے

عبدالغفور شیخ (کینیا): ہارورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اسلامی کانگریس کے مجلہ ”اسلام“ کے بورڈ آف ایڈیٹرز کے ممبر تھے۔ World of Islam میں علمی و تحقیقی مضامین تحریر کیے۔

الباغیر کامل السید (سوڈان): سوڈان کی شعبہ مذہبی امور کے کنٹرولر رہے۔ ایڈنبرا (سکاٹ لینڈ) سے اسلامیات میں ڈپلومہ حاصل کیا اور وہاں سے بھی ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کی۔ الاذہر اور بعض دوسرے اداروں سے وابستہ رہے۔ تالیفات حسب ذیل ہیں:

1- Al-Ghazali's Philosophy of Education

2- Principals and Practice of Education

شمس العلماء داؤد پوتہ عمر بن محمد (پاکستان): پی ایچ ڈی کیمبرج سے کیا۔ سندھ مدرسہ کے پرنسپل رہنے کے علاوہ بمبئی اور سندھ میں اہم مناصب پر متعین رہے۔ سندھ ادبی سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ تالیفات درج ذیل ہیں:

1- The Influence of Arabic Poetry on Persian Poetry.

2- A survey of Mass Education in India

تاریخ معصومی اور چچ نامہ کی تدوین و تحقیق کی۔

Drewes G.W.J (ہالینڈ) لیڈن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور وہیں اسلامی علوم کے

پروفیسر رہے۔ چند تالیفات درج ذیل ہیں:

The Miracles of Abdul Qadir Jilani

امام بوصیری کے بردہ پر بھی کام کیا۔

Near East کے کیلوفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) Grunebaum G.E.Von کے ڈائریکٹر اور پروفیسر رہے۔ نیویارک اور شکاگو یونیورسٹی میں عربی کی تدریس بھی کی۔

تالیفات:

1- Medeval Islam

2- A Study in Cultural Orientation

3- Muhammadan Festivals

4- Unity and Veriety in Muslim Civilization.

Hazeghi, Abul Fazl (ایران) کابل میں ایرانی سفارت خانے میں کلچرل کونسلر رہے۔ تہران یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔

تالیفات:

1- The Rights of Women in Islam

2- The Necessity of Mankind to Prophet

ڈاکٹر عنایت اللہ شیخ (پاکستان): لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ عربی و اسلامیات کے صدر رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں بطور پروفیسر خدمات سرانجام دیں۔ نہایت وضع دار ایک محنتی اور اعلیٰ پائے کے محقق تھے۔ وضع قطع سے برعکس اسلامی اقدار و روایات کے امین تھے۔

تالیفات:

۱۔ تاریخ اسلام

۲۔ Geographical Factors in Arabian Life and History.

۳۔ ہم عربی زبان کیوں سیکھتے ہیں؟ اور

اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں متعدد تحقیقی مقالات تحریر فرمائے۔

شیخ احمد محمد جمال (سعودی عرب)۔ سعودی عرب میں تعلیم حاصل کی۔ متعدد حکومتی اور علمی عہدوں پر فائز رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ ثقافتی امور وزارت داخلہ میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی رہے۔ تالیفات:

۱۔ سلسلۃ علی مائدة القرآن

۲۔ دین و دولت

۳۔ مع المفسرین والکتاب

شیخ محمد منصر الکتانی (مراکش): دمشق یونیورسٹی کے شریعہ کالج میں پروفیسر رہے۔ دائرہ المعارف الفقہ الاسلامی کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بنے۔

Dr. Lewis Bernard (برطانیہ) لندن یونیورسٹی میں مشرق قریب اور وسطی کی تاریخ کے پروفیسر تھے۔ کیلوفورنیا یونیورسٹی میں تاریخ کے بطور وزٹنگ پروفیسر رہے۔ تالیفات:

1- The Origin of Isma'ilism

2- British Contribution to Arabic Studies

3- The Arabs in History

4- Notes and Documents from Turkish Archives

مختلف روزناموں اور رسائل و جرائد کے ایڈیٹر رہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی (پاکستان): حیدر آباد دکن اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ احیاء اسلام اور نفاذ اسلام کے لیے ایک جماعت تیار کی اور اس کے امیر رہے۔ ان کی تالیفات بے شمار ہیں۔ موضوعات میں تنوع ہے۔

چند تالیفات:

الجہاد فی الاسلام

پردہ
اسلامی ریاست
تنقیدات
تفہیم القرآن

Dr. Paret Rudi (جرمنی) ٹوبنگن یونیورسٹی میں السنۂ سامیہ اور اسلام کے پروفیسر تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہائیڈل برگ اور بون یونیورسٹی میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دیں۔

تالیفات:

تاریخ عرب اور مغازی وغیرہ پر کتب تالیف کیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (پاکستان): دہلی اور پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے۔ حکومت پاکستان کے وزیر اطلاعات بنے۔ کولمبیا یونیورسٹی میں استاد زائر تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے فرائض سرانجام دیے۔

تالیفات:

سلاطین دہلی کا نظم و نسق

پاکستان۔ ایک اسلامی جمہوریہ وغیرہ

ڈاکٹر جوزف شاخت (ہالینڈ): آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ، الجیریا اور کولمبیا کی جامعات میں بطور وزیٹنگ پروفیسر کام کیا۔ علوم اسلامیہ بالخصوص حدیث و فقہ کے بارے میں مستشرقین کے مخصوص نقطہ نظر کو آگے بڑھایا۔

تالیفات:

1- The Origins of Muhammeden Jurisprudence

ڈاکٹر سراج الحق (ڈھاکہ پاکستان) لندن سے پی ایچ ڈی کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی شعبہ عربی کے صدر رہے۔ مختلف موضوعات پر علمی و تحقیقی مضامین تحریر کیے۔

علامہ علاء الدین صدیقی

☆ بشیر صاحب

جناب علامہ علاء الدین صدیقی تقریباً ساڑھے تین سال تک میرے بطور وائس چانسلر منسلک رہے۔ ان کو یہ لازوال شرف حاصل تھا کہ انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ علامہ مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ اسلام پر بالخصوص اور دوسرے ادیان پر بالعموم ان کی گہری نظر تھی۔ وہ ایک خوش گفتار انسان تھے اور مجلس سازی میں یکتا تھے۔ ان کی باتوں کے رسیا لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ لوگ پہروں علامہ مرحوم کی مجلس میں بیٹھے رہتے لیکن ان کا دل نہ بھرتا۔ ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اکثر اوقات ان کے گرد ان کے مداحوں اور شاگردوں و عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔

علامہ مرحوم کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ان کی خطابت تھا۔ ایک تو وہ عالم دین ہونے کے حوالہ سے بہترین خطیب تھے، دوسرے انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران بطور مقرر بہت سی تقریریں کی تھیں۔ مرحوم کی خطابت کا ایک خاص انداز تھا جو بہت پراثر تھا۔

علامہ علاء الدین صدیقی زیادہ تر شیروانی زیب تن کرتے تھے۔ سر پر قائد اعظم کیب ہوتی تھی۔ اس طرح ان کی شخصیت بڑی وجیہ معلوم ہوتی تھی۔ علامہ علاء الدین مرحوم طویل عرصے تک پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیہ سے وابستہ رہے۔ اس شعبہ کے قیام اور ترقی میں مرحوم نے خاصا حصہ لیا۔ وہ خاص مدت تک اس شعبہ کے سربراہ بھی رہے۔ اس شعبہ کی لائبریری کو بھی آپ نے وسعت دی اور نہ صرف اس شعبہ کے لیے بلکہ دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے لیے علوم اسلامیہ کے بہت سے اساتذہ بھی تیار کیے۔

علامہ علاء الدین صدیقی اس دور میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے جب

☆ پی اے ٹو وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی

طلبہ سیاست کا بازار گرم تھا۔ میری دانست میں ”ایڈمنسٹریشن“ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے کچھ الگ اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مجلسی انسان وائس چانسلر کا منصب سنبھال کر یک دم اپنے آپ کو تبدیل کر کے مثالی ایڈمنسٹریٹو نہیں بن سکتا۔ اگر وہ بطور وائس چانسلر بھی مجلس ساز ہی رہے گا تو ایڈمنسٹریشن متاثر ہوگی۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب کا مداح اور نیاز مند تھا اور ہوں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ علامہ مرحوم بطور ایڈمنسٹریٹو کسی حد تک بہت اچھا نقش قائم نہ کر پائے کیونکہ ایک کھلے ڈلبے مجلس ساز اور بذلہ سنج انسان میں وہ سختی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جس کی ایڈمنسٹریشن کو ضرورت ہوتی ہے۔ ایڈمنسٹریشن ایک سخت ضابطہ اوقات کی پابندی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس زمانہ میں طلبہ منہ زور ہو چکے تھے اور مظاہرے، جلسے جلوس گویا روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ پھرے ہوئے طلبہ آداب اور ضوابط کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ خواہ ان کے سامنے علامہ صاحب جیسی شخصیت ہی ہو۔ چنانچہ علامہ صاحب کا شفقت آمیز رویہ طلبہ کو راہ راست پر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود علامہ صاحب نے تدبیر، دانش مندی اور تحمل سے خاصا عرصہ معاملات اپنے قابو میں رکھے۔



استاذ محترم قبلہ علامہ صاحب کے بارے میں ان کے تلامذہ و احباب محترم سے مزید تاثرات حاصل کرنے کے لیے درج ذیل سوالنامہ ارسال کیا گیا۔ اس سوالنامے کے جواب میں پروفیسر سید محمد طاہر قادری اور ڈاکٹر قاری محمد طاہر صاحب کی تحریریں موصول ہوئیں جو پیش خدمت ہیں۔

سوالنامہ

- ۱۔ اسلامیات بطور مستقل مضمون کا خیال کیسے آیا۔ کیا محرکات تھے؟
- ۲۔ بطور مستقل مضمون کے اجرا میں کیا مشکلات پیش آئیں؟
- ۳۔ یونیورسٹی کی مختلف باڈیز سے اس کی منظوری کے سلسلہ میں کیا مشکلات درپیش ہوئیں؟
- ۴۔ اس دور میں پاکستان کی دیگر جامعات میں اس مضمون کی کس حیثیت سے تدریس ہوتی تھی؟
- ۵۔ ابتدائی نصاب کیا تھا؟
- ۶۔ ابتدائی نصاب کی تیاری میں کن افراد سے معاونت حاصل کی گئی؟
- ۷۔ ابتدائی کلاسز کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟
- ۸۔ نظام الاوقات کیا تھا؟
- ۹۔ اساتذہ علامہ صاحب کے علاوہ کون تھے؟
- ۱۰۔ ابتدائی طلبہ کون تھے؟
- ۱۱۔ علامہ صاحب کی ذاتی دلچسپی کس مضمون سے زیادہ تھی؟
- ۱۲۔ علامہ صاحب کی زندگی میں اس شعبہ کے ارتقا کے مختلف مراحل کیا تھے؟
- ۱۳۔ علامہ صاحب کے ساتھ گزرا ہوا کوئی یادگار واقعہ؟

علامہ صاحب اور شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

پروفیسر سید محمد طاہر قادری ☆

قیام:- اس کا قیام 1950ء میں عمل میں آیا اور پہلی کلاس (Session) 1950ء تا 1952ء میں تھی۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب چیئرمین تھے۔ انہی کی ذاتی کاوش اور کوششوں سے یہ شعبہ قائم ہوا۔ علامہ صاحب (مرحوم و مغفور) کے فرمان کے مطابق اس کے قیام میں انہیں بڑی مشکلات اور مراحل سے گزرنا پڑا۔ اکثر اساتذہ مخالفت پر کمر باندھے رہتے۔ ایک مرد مجاہد ”عمر حیات ملک صاحب“ جو کہیں سفیر تھے انہوں نے اس ضمن میں بڑی امداد کی اور مخالف حضرات کو بمشکل قائل کیا اور انہی کی محنت اور امداد سے مخالفت کے تمام بادل چھٹ گئے اور شعبہ بخیر و خوبی قائم ہو گیا۔ ایک دفعہ علامہ صاحب (مرحوم) سال اول کے تمام طلباء کو عمر حیات ملک صاحب کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے اور کلاس کا ان کی خدمت میں تعارف کرانے کے لیے لے گئے۔ وہ بڑے خلوص و محبت سے پیش آئے اور شعبہ کے لیے دعا کی۔ علامہ صاحب شعبہ کے قیام کے سلسلہ میں صبح سے شام تک مختلف امور میں مصروف و مشغول رہتے اور کلاس چھٹی کے دن اپنی کوٹھی نمبر 4 منزلہ روڈ پر صبح سے شام تک بلا کر پڑھاتے اور دوپہر کو تمام کلاس کو کھلانے پلانے کا اہتمام بھی فرماتے، اگرچہ ہم بہت منع کرتے لیکن وہ اس فیاضی پر قائم رہتے۔ شعبہ کا قائم ہونا، اس میں خاطر خواہ داخلہ ہونا اور پھر آئندہ چل کر اس کو لازمی مضمون کا درجہ ملنا۔ پہلے ہی سال 7 آسامیاں پنجاب میں نکلنا، سب علامہ (مرحوم و مغفور) کی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا۔ علامہ صاحب اپنے طلباء سے بڑے خلوص، پیار و محبت سے پیش آتے۔ اکثر کتب بھی اپنے پاس سے دے دیتے۔ کوئی مشکل پیش آتی فوراً ازالہ فرما دیتے۔ ان کے طلباء ان پر جان چھڑکتے تھے اور دل و جان سے ان کی عزت کرتے تھے۔

☆ ریٹائرڈ پرنسپل و ڈائریکٹر عربی و اسلامیات، بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان

اساتذہ:- شعبہ قائم ہوا تو اس وقت درج ذیل اساتذہ طلباء کو مختلف مضامین پڑھاتے تھے:-

- ۱- علامہ علاء الدین صدیقی (مرحوم)، چیئر مین (قرآن - تفسیر اور علوم دینیہ)
- ۲- قاضی نصیر صاحب، وائس چیئر مین (عربی وغیرہ)
- ۳- ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب مرحوم (آرٹ - فنون لطیفہ و مغلیہ دور)
- ۴- مولانا علم الدین سالک صاحب مرحوم (تاریخ اسلام)
- ۵- ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم (عربی ٹرینڈز وغیرہ)
- ۶- ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب مرحوم (اردو ٹرینڈز وغیرہ)
- ۷- ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب مرحوم (فلسفہ)
- ۸- مولوی نصیر الدین صاحب مرحوم (حدیث و فقہ)
- ۹- پروفیسر ڈاکٹر احمد دین تاثیر صاحب (اردو ٹرینڈز)
- ۱۰- ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب (ترکی ٹرینڈز وغیرہ تاریخ اسلام)

پہلی کلاس کے طلباء:

- ۱- آفتاب احمد خان
- ۲- عنایت اللہ ملک
- ۳- سید حبیب اللہ حسینی
- ۴- افتخار احمد چشتی
- ۵- رانا نذر الرحمن
- ۶- نصیر احمد مصری
- ۷- مولوی نذیر احمد
- ۸- سید انور علی شاہ
- ۹- میاں عبد المجید
- ۱۰- ضیاء الدین صدیقی

- ۱۱۔ حسام الدین صدیقی
- ۱۲۔ عبدالواحد یوسفی
- ۱۳۔ حفیظ الرحمن
- ۱۴۔ محمود احمد عارفی
- ۱۵۔ حافظ سمیع اللہ
- ۱۶۔ ظفر اللہ خان
- ۱۷۔ محمد اشفاق
- ۱۸۔ عبدالقادر قریشی
- ۱۹۔ قاضی نذیر احمد
- ۲۰۔ سید محمد طاہر قادری (راقم)
- ۲۱۔ ساجدہ حق نواز

جہاں تک حافظہ نے زور دیا یہی طلباء یاد آئے ہیں ہو سکتا ہے ایک آدھ رہ گیا ہو۔ ویسے امکان کم ہے۔

جن چھ خوش قسمت حضرات کی 1952ء میں امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالجوں میں تقرری ہوئی ان کے نام یہ ہیں:-

- ۱۔ ظفر اللہ خان، گورنمنٹ کالج لاہور
 - ۲۔ افتخار احمد چشتی، گورنمنٹ کالج جھنگ
 - ۳۔ ضیاء الدین صدیقی، ایمرسن کالج ملتان
 - ۴۔ سید حبیب اللہ حسینی، گورنمنٹ کالج راولپنڈی
 - ۵۔ حافظ سمیع اللہ، گورنمنٹ کالج کیمبل پور
 - ۶۔ سید محمد طاہر قادری، گورنمنٹ کالج ڈیرہ
- غازی خان۔

ساتویں پرائیویٹ امیدوار ایم۔ ڈی چوہدری تھے جو فیصل آباد تعینات ہوئے تھے۔ وہ پہلے عربی میں ایم۔ اے کر چکے تھے۔

پہلا واقعہ:- علامہ صاحب اپنے طلباء کو بچوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور ان کے مسائل حل

کرنے میں خوشی محسوس کرتے۔ میرے ایک شاگرد (محبوب عالم) نے بی۔ اے پاس کر کے ایم۔ اے سوشل ورک میں پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ ٹیسٹ دیا پاس ہو گیا اور پہلے 14 طلباء میں آ گیا مگر معلوم نہیں کیوں داخلے سے رہ گیا۔ اگلے سال پھر امتحان دیا پاس ہو گیا۔ انٹرویو سے پہلے وہ میرے پاس آیا اس ڈر سے کہ کہیں پچھلے سال کی طرح رہ نہ جاؤں۔ اس نے مجھے لاہور چلنے کے لیے کہا۔ میں نے بوجہ ماہ رمضان معذرت کی اور ایک رقعہ علامہ صاحب کی خدمت میں لکھا کہ یہ طالب علم پچھلے سال داخلے سے رہ گیا۔ براہ کرم توجہ فرمائیں۔ یہ شاگرد میرا رقعہ لے کر علامہ صاحب کو ان کے مکان پر ملا۔ آپ نے فرمایا کل دس بجے دفتر آؤ۔ یہ طالب علم دس بجے علامہ صاحب کو ملا۔ انہوں نے اسی وقت فون اٹھایا اور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ مس رفعت رشید کو فرمایا (See that this boy is admitted) اور وہ داخل ہو گیا۔ دو سال بعد مجھے یہ طالب علم کوٹ ادو ملا۔ بڑا خوش ہوا اور میرا بہت شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ میں اب کوٹ ادو میں سوشل ویلفیئر آفیسر 17 گریڈ میں تعینات ہوں۔ اور یہ سب کچھ علامہ صاحب کی وجہ سے ہوا۔ ان کے نامہ اعمال میں یہ نیکی لکھی گئی۔

دوسرا واقعہ:- علامہ صاحب کی طرف سے مجھے ایک رجسٹری موصول ہوئی۔ انہوں نے میرے نام مختار نامہ بھیجا تھا کہ میری دس مربع زمین 'رکھ دگراں والی' دریا خاں میں ہے عرصہ ہو گیا قبضہ نہیں لیا۔ اس کا قبضہ حاصل کرو۔ میں بڑا خوش ہوا کہ علامہ صاحب نے مجھے کسی قابل سمجھا اور اس قدر بے تکلفی سے بغیر ذکر کے مختار نامہ بھیج دیا۔ (در اصل علامہ صاحب یہ سمجھے کہ دریا خاں اور ڈیرہ غازی خاں قریب قریب ہیں اور قادری یہ کام آسانی سے کر لے گا۔ حالانکہ دریا خاں، ڈیرہ غازی خاں سے بہت دور ہے)۔

میں اس کام کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا مگر آگے بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ذریعہ ہو گا۔ پھر سوچا تین ماہ کی رخصتوں میں نکلوں گا۔ ان شاء اللہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ رخصتوں میں ابھی دیر تھی۔ علامہ صاحب نے 2/3 ماہ انتظار کیا اور پھر شاید ناراضگی میں مجھے لکھا کہ میرا مختار نامہ واپس بھیج دو اب تک کام نہیں ہوا۔ میں نے فوراً فون کیا، تفصیلاً لکھا کہ جناب

دریا خان یہاں سے بہت دور ہے ان شاء اللہ تین ماہ کی رخصت کے دوران یہ کام ہو جائے گا فکر کی ضرورت نہیں۔

کالج میں چھٹیاں شروع ہوتے ہی میں لیہ گیا۔ میرے ایک کلاس فیلو نواب محمد اقبال خاں وہاں تحصیل دار تھے مجھے یقین تھا کہ یہ کام ان کے ذریعہ فوراً ہو جائے گا۔ میں نے اسے سارا معاملہ ذکر کیا۔ وہ بولے یہ کام مشکل نہیں اور انہوں نے اپنے ماتحت ایک قانون گو یار محمد کو بلایا اور کہا یہ میرے ہم جماعت اور پیر طاہر قادری آئے ہیں ان کے استاد علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب کے دس مربع کا قبضہ ”رکھ ڈگراں والی“ دریا خاں کا لینا ہے۔ کل ہی لے کر واپس آؤ اور انہیں کوئی تکلیف بھی نہ ہو۔ ہم صبح کی ٹرین سے دریا خاں کی طرف چلے لیکن قانون گو صاحب نے کہا بھکر نائب تحصیل دار صاحب کے ہاں چلتے ہیں وہ اس علاقہ کا انچارج ہے۔ ہم وہاں پہنچے۔ نائب تحصیل دار باہر آئے مجھے غائبانہ جانتے تھے بڑے خوش ہوئے فوراً ناشتہ (پراٹھے مکھن انڈے وغیرہ) لا کر سامنے رکھ دیا اور محبت سے کہا مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے آپ غریب خانہ پر آئے ہیں۔ تناول فرمائیں اور فوراً ایک نوکر کو رکھ ڈگراں والی موٹر سائیکل پر بھیجا کہ پٹواری متعلقہ کو لے کر مع ریکارڈ حاضر ہو۔

ایک گھنٹے بعد پٹواری صاحب آئے بڑے خوش ہوئے کہنے لگے میں تو لاہور کا رہنے والا ہوں علامہ صاحب کو بخوبی جانتا ہوں شاہ چراغ مسجد میں کئی دفعہ علامہ صاحب کا وعظ سنا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میرے ہاتھ سے ان کی زمین کا قبضہ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر فوری طور پر پٹواری صاحب نے پرت قبضہ بنا کر نائب تحصیل دار صاحب کو پیش کیا۔ انہوں نے دستخط فرما کر دوکاپیاں مجھے تھما دیں اور بڑے خلوص و محبت سے ہمیں رخصت کیا۔ میں خود یہ وارنٹ قبضہ لے کر علامہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوا۔ مجھے گلے سے لگا کر بولے مجھے امید تھی کہ یہ کام تم ہی کر سکتے ہو اور تم میری توقعات پر پورے اترے۔ اللہ تمہیں خوش رکھے اور عزت و ترقی عطا فرمائے۔

چند دن بعد مجھے رکھ ڈگراں والی سے ایک محی الدین نامی میواتی جو قادریہ سلسلہ سے بیعت تھے، کا خط ملا کہ آپ نے اچھا کیا علامہ صاحب کی زمین کا قبضہ لیا میں ساتھ کا زمیندار

ہوں انشاء اللہ اپنے یوب ویلوں سے علامہ صاحب کی زمین کو پانی دوں گا تاکہ اس کی حیثیت اچھی ہو جائے اور اچھے دام دے جائے۔ میں قادیوں کا غلام ہوں۔ بہر حال علامہ صاحب کی زمین آباد ہو گئی تھی۔ بعد کا مجھے علم نہیں۔

تیسرا واقعہ:- میرے ایک دوست کے بھائی نے ایف۔ ای۔ ایل کا امتحان دیا۔ اتفاق سے ایک دو پرچوں میں رہ گئے۔ ہاسٹل میں رہتے تھے حکم ملا کہ ہاسٹل چھوڑ دیں کیونکہ پروفیسر امتیاز صاحب پرنسپل لاء کالج کے یہ آرڈر تھے کہ فیل شدہ طالب علم کو ہاسٹل میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ ان کے بھائی انہیں لے کر میرے پاس آئے کہ پروفیسر امتیاز علی شیخ صاحب بڑے سخت پرنسپل ہیں جو حکم دیتے ہیں اسے کبھی نہیں بدلتے۔ صرف علامہ صاحب کی بات مانتے ہیں۔ اب آپ علامہ صاحب کے شاگرد ہیں میرے بھائی کا ہاسٹل میں داخلہ کرا دیں ورنہ یہ پاس نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں انہیں لے کر علامہ صاحب کی خدمت میں لاہور گیا۔ تمام قصہ عرض کیا اور بتایا کہ یہ میرے بہت ہی پیارے دوست اور کلاس فیلو ہیں یہ کام ضرور کرنا ہے۔ علامہ صاحب نے فون اٹھایا اور فرمایا امتیاز یہ قادی ڈیرہ غازی خاں سے آئے ہیں تم انہیں جانتے ہو مجھے ان کی خاطر عزیز ہے یہ کام کرنا ہے۔ شیخ امتیاز صاحب نے فرمایا ”انکل، قادی صاحب کو میرے پاس بھیج دیں انشاء اللہ تعمیل ہوگی“۔

ہم ان کے پاس گئے۔ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ کہنے لگے ”آج تک میں نے فیل شدہ لڑکے کو ہاسٹل میں نہیں رکھا یہ پہلا کیس ہے۔ فلاں کمرے میں جاؤ اور خاموشی سے رہتے رہو۔ انکل علامہ صاحب کا حکم ہے اور برادر م قادی کی خواہش، دونوں عزیز ہیں“۔

یہ چند سطور علامہ صاحب کی نذر عقیدت ہیں۔ جب سے علامہ صاحب فوت ہوئے ہیں روزانہ صبح تلاوت کے بعد انہیں بخشا ہوں اور انشاء اللہ زندگی بھر ایسا کرتا رہوں گا اللہ توفیق بخشنے۔ آمین۔



علامہ صاحب اور شعبہ علوم اسلامیہ کا قیام

پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر

تشکیل پاکستان کے بعد جذبات میں اسلامی بیداری کی لہر زیادہ تھی۔ ہر شخص اسلامی نظام حیات کی ترویج کا متمنی تھا اور شوق بھی رکھتا تھا۔ اس لیے تعلیمی اداروں میں اسلامی علوم کو بطور نصاب پڑھائے جانے کا خیال حکومت سے لے کر عوام کے ذہن میں موجود تھا۔ یہی شوق پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات قائم کرنے کا بڑا محرک تھا۔ کیونکہ پنجاب یونیورسٹی ہی اس وقت پاکستان کی بڑی اور واحد تعلیم گاہ تھی۔ پروفیسر افتخار چشتی فرمایا کرتے تھے کہ حکومت نے اس غرض کے لیے علامہ لیو پول اسد مرحوم کی خدمات حاصل کیں کہ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی تجاویز دیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلی کوششیں علامہ اسد نے شروع کیں اور حکومت کے ایما پر اور عام لوگوں کے ذہنی رجحان اور خواہش پر ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ریکانسٹرکشن Deptt. of Islamic Reconstruction رکھا گیا۔ اس ڈیپارٹمنٹ کا دفتر پنجاب سیکرٹریٹ سے ملحق عمارت ایک کوٹھی میں تھا۔ یہ کوٹھی کے ایل گابا جو کہ نو مسلم تھے ان کی ملکیت تھی۔ اور متروکہ جائیداد کے طور پر حکومت کی تحویل میں چلی گئی تھی۔ علامہ اسد اس کے پہلے سربراہ تھے۔ انہوں نے اسی دوران اسلامی حکومت کے لیے دستوری خاکہ بھی تیار کیا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس وقت پنجاب کے گورنر غالباً جنرل مودی تھے جو انگریز تھے۔ ان کو اسلام یا اسلامی نظام سے کیا دلچسپی ہوتی اس لیے انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ بعد غالباً ایک برس کے بعد ہی اس Deptt. of Islamic Reconstruction کو بند کرنے کا حکم دے دیا۔ اور بہانہ یہ بنایا کہ حکومت کے پاس فنڈز کی کمی ہے لہذا حکومت فالتو اخراجات برداشت نہیں کر سکتی۔ ان کے حکم پر یہ ڈیپارٹمنٹ بند کر دیا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ لیو پول اسد بھی نو مسلم تھے جنہوں نے اپنے مطالعہ کے نتیجے میں اسلام قبول کیا۔ اور کے ایل گابا بھی نو مسلم تھے جن کی کوٹھی میں اسلام کے

نام سے ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا تھا۔ اللہ جس سے بھی کام لے۔

مذکورہ ڈیپارٹمنٹ کی بندش کے بعد ظاہر ہے کہ لوگوں میں نفرت کا جذبہ تو موجود تھا۔ ممکن ہے کہیں سے مطالبات بھی آئے ہوں تاہم اس کے کچھ عرصہ بعد باقاعدہ پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات قائم کرنے کا اہم اور عملی کام علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم کے سپرد ہوا اور پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایک کمرہ اس شعبہ کے لیے مخصوص کیا گیا۔ یہ کمرہ موجودہ فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے اوپر والا کمرہ تھا۔ اسی کمرہ میں شعبہ علوم اسلامیہ کا افتتاح ہوا۔ چشتی صاحب کے بقول ایک میز ایک کرسی اور ایک الماری اس کمرہ کی کل کائنات تھی۔ الماری کو کمرے میں لانے اور رکھنے میں علامہ صاحب خود شریک ہوئے۔ مزدور اور طلباء کے ساتھ مل کر علامہ صاحب نے بھی الماری اٹھائی اور کمرے میں لے گئے۔ بجلی کی تار کسی جگہ عریاں تھی جس کی وجہ سے علامہ صاحب کو الماری رکھتے ہوئے برقی کرنٹ بھی لگا۔

۲۔ مضمون کے اجرا میں تو شاید شروع میں زیادہ مشکلات پیش نہیں آئیں۔ کیونکہ تشکیل پاکستان کے بعد اذہان پر عمومی غلبہ اسلام کا تھا۔ اس لیے فوری طور پر کسی کو بھی اختلاف کا حوصلہ نہ ہوا اور اس حوالے سے منفی سوچ رکھنے والی زبانیں تقریباً بند رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسے منفی فکر کے حامل لوگوں نے اپنی کوششیں شروع کیں۔ یہ کام زیادہ تر اس دور میں ہوا جبکہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر قادیانی نظریات کے حامل ہوئے۔ براہ راست اس مضمون کو ختم کرنے کا تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد اس کا نام تبدیل کرنے کا حکم نامہ جاری ہوا۔ اسلامیات کی بجائے اس کا نام Study of religion with special emphasis on Islam رکھ دیا گیا۔ گویا یہ اس مضمون کو ختم کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور احتجاج ہوئے جس کے پیش نظر یہ نام ختم کر کے اصل نام یعنی اسلامیات یا Islamic Studies ہی رکھا گیا۔ پھر اس مضمون کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہوئی۔ جبکہ لادین اور سیکولر اذہان کا حکومت پر غلبہ ہو گیا۔ یہ 1972-73 کی بات ہے کہ اس مضمون کو نصاب سے خارج کرنے کا بیڑہ اٹھایا گیا۔ باقاعدہ اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئیں کہ اسلامیات کو ختم کرنے کی سفارشات تیار کر لی گئی ہیں اور بہت جلد نوٹیفکیشن جاری ہونے والا ہے۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ

نوٹیفکیشن جاری ہوا تھا یا نہیں۔ اس کے خلاف سب سے پہلا اجلاس گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر افتخار احمد چشتی مرحوم، راقم الحروف، پروفیسر سعید اختر مرحوم اور بعض دیگر حضرات شریک ہوئے۔ اور طے پایا کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور شعبہ اسلامیات کے حضرات کو اس سلسلہ میں متحرک کیا جائے۔ چنانچہ ان حضرات کی تحریک پر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک بھرپور اجلاس منعقد کیا گیا اور ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی تشکیل دے دی گئی جس میں ڈاکٹر امان اللہ خان اور ڈاکٹر خالد علوی بھی شامل تھے۔ حکام بالا سے مذاکرات ہوئے جس کے نتیجہ میں اسلامیات کو بطور مضمون نصاب سے خارج کرانے کی کوششیں دم توڑ گئیں۔

جب زمانہ ضیاء الحق مرحوم کا آیا تو صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ ضیاء الحق دینی ذہن کے حامل حکمران تھے۔ الناس علی دین بلوکھم کے تحت حکومت کے اعلیٰ افسران سے لے کر نچلے طبقے تک سب اسلام کا دم بھرنے لگے۔ مرحوم ضیاء الحق نے اس مضمون کو پہلے میٹرک پھر ایف اے اور بی اے تک لازمی قرار دے دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اسلامیات بطور لازمی مضمون کے شامل نصاب ہے۔ تاہم اساتذہ اسلامیات کی عدم دلچسپی اور نصاب کے سقم کی وجہ سے طلباء میں اس مضمون سے وہ محبت پیدا نہیں ہو رہی جس کا یہ مضمون تقاضا کرتا ہے۔

۳۔ اس بارے میں راقم کو کچھ معلومات نہیں ہیں۔

۴۔ اس دور میں پاکستان کی سب سے بڑی جامعہ پنجاب یونیورسٹی ہی تھی۔ جس کا دائرہ کار تقریباً پورا مغربی پاکستان تھا۔ باقی جامعات کا قیام بعد ہی میں عمل میں آیا۔ ظاہر ہے کہ پھر سب جامعات نے نصابات اور دیگر امور میں جامعہ پنجاب ہی کا تتبع اختیار کیا۔

۶۔ ابتدائی نصاب میں قرآن و حدیث کے علاوہ اسلامی فن تعمیر کا ایک پرچہ شامل تھا۔ جو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی پڑھاتے تھے۔ تقابل ادیان علامہ صاحب کا مضمون تھا۔ ابتدائی نصاب میں کن افراد نے معاونت کی اس بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر غازی احمد صاحب ایسی شخصیت ہیں جو بتلا سکتے ہیں۔ ایک پروفیسر قمر الدین صاحب کا نام بھی ذہن میں آتا ہے جو ابتدائی اساتذہ میں سے تھے۔ جو جلد ہی غالباً کراچی چلے گئے۔ آج کل کہاں ہیں کچھ علم نہیں۔ دوسری اہم شخصیت جو اس کے متعلق علم رکھتی ہے وہ حافظ نذر احمد صاحب ہیں ان سے جلدی رابطہ کیجئے۔

۷۔ ۸۔ ابتدائی کلاسز کا آغاز شعبہ کے آغاز پر ہی ہو گیا۔ اس وقت ہمہ وقتی طلباء تو نہ تھے۔ سب طلباء کسی نہ کسی دفتر میں ملازم تھے۔ زیادہ تعداد ایسے حضرات کی تھی جو اے۔ جی آفس میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ پہلے وقت میں اپنے اپنے دفاتر جاتے اور پھر دوسرے وقت یعنی بعد دوپہر یونیورسٹی آ کر پیریڈ پڑھتے تھے۔ ہمارے استاد مرحوم پروفیسر افتخار احمد چشتی پہلی کلاس کے ابتدائی طلباء میں سے تھے۔ انہوں نے جرنلزم میں بھی ڈپلوما کیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ دن میں کسی اخبار میں کام کرتے اور پھر بعد دوپہر کلاسز میں شمولیت کرتے تھے۔

۹۔ علامہ صاحب کے علاوہ جن ابتدائی اساتذہ کے اسمائے گرامی مجھے معلوم ہیں ان میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مولانا علم الدین سالک، پروفیسر غازی احمد، پروفیسر قمر الدین خان شامل تھے۔ شاید مولوی محمد شفیع بھی ایک آدھ پیریڈ لیتے تھے۔ لیکن اس طرح کہ آپ عدیم الفرستی کے باعث شعبہ میں تشریف نہ لاتے البتہ انہوں نے طلباء کو یہ سہولت دے رکھی تھی کہ وہ فجر کی نماز کے بعد ان کی کوٹھی پر آئیں اور وہاں پڑھا کریں۔ ان کی کوٹھی لارنس باغ (باغ جناح) کے قریب تھی۔ چشتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہم طلباء صبح کے وقت فجر کی نماز ادا کر کے ان کے گھر چلے جاتے اور وہاں ان سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔ بعد کے اساتذہ میں پروفیسر عبدالبشر آذری، ڈاکٹر بشارت کے نام بھی آتے ہیں۔

۱۰۔ ابتدائی طلبہ میں مجھے صرف دو نام یاد ہیں۔ پروفیسر افتخار احمد چشتی، حافظ سمیع اللہ اور ایک طالبہ بھی تھیں۔

۱۱۔ علامہ صاحب کی ذاتی دلچسپی کا مضمون تقابل ادیان تھا۔ غالباً ایک پیریڈ تفسیر القرآن کا بھی ان کے پاس تھا لیکن یہ بات تعین سے نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ تقابل ادیان میں ان کی دلچسپی بہت گہری تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ تقابل ادیان کو بطور مضمون کے انہوں نے ہی متعارف کرایا۔

۱۲۔ اس بارے میں یہ عاجز کچھ نہیں کہہ سکتا۔

۱۳۔ علامہ صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات تو کافی ہیں۔ میں ان شاء اللہ ان واقعات کو اپنی یادداشت کے مطابق لکھتا رہوں گا اور پیش کر دوں گا۔

مکالمات انٹرویو

علامہ علاؤ الدین صدیقی

☆ جناب الطاف حسن قریشی

یہ اگست ۱۹۴۷ء کا وسط تھا۔ میں ان دنوں محکمہ نہر میں ملازم تھا۔ ہمارا دفتر گنگارام بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا۔ میں تین، چار دن پہلے مرالہ ہیڈ ورکس سے تبدیل ہو کر آیا تھا جمعے کا دن تھا۔ ہماری برانچ کے لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے مسجد شاہ چراغ میں گئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس مسجد میں پہلی دفعہ آیا تھا۔ لوگ بے قراری سے کسی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں آپس میں ایک بار ملنے کے بعد آگے کی طرف جھک رہی تھیں۔ اتنے میں میرے ایک ساتھی نے کہا:

”علامہ صاحب آگئے۔“

”کون سے علامہ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب۔“ قریب سے کسی کی آواز آئی۔

ہم سب کی نظریں منبر کی طرف اٹھیں اور ادھر مائیکروفون پر عشق میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ قرآن پاک کے شیریں کلمات فضا میں تحلیل ہو کر کانوں میں رس گھول رہے تھے اور دل میں اترتے جاتے تھے۔ میں علامہ صاحب کو دور سے دیکھ سکا تھا۔ میانہ قد شیروانی میں ڈھل کر قد رے بلند معلوم ہو رہا تھا۔ علامہ صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی مسلسل جدوجہد اور ایثار کی زندگی ہے۔ اس کی زندگی میں کہیں ٹھہراؤ نہیں آتا، وہ تخلیق کے لیے ایک فن کار کی طرح مضطرب رہتا ہے اور اس کی صلابت کار سے بستیاں آباد ہوتی رہتی ہیں.....

سامعین ایک تنکے کی طرح جذبات کے سمندر میں بہہ رہے تھے۔ علامہ صاحب

کے الفاظ شعلے بن کر دلوں کو پگھلا رہے تھے۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ میں نے تقسیم کے خون آشام مناظر دیکھے تھے اور یہاں بے مہری احباب کے چر کے کھا چکا تھا۔ میں اپنے گرد و پیش سے سخت مایوس تھا۔ لیکن علامہ صاحب نے دل کی دنیا بدل دی تھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اور سامعین پر کیا گزری۔ وہ صرف تقریر کی لذت ہی میں کھوئے رہے یا ان کے پہلو میں بھی درد اٹھا۔ میں وہاں سے ایک ایسا جذبہ لے کر آیا جس نے مجھے پھر کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد میں نے علامہ صاحب کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور شاید یہی ناکامی میری کامیابیوں کا پیش خیمہ بنی۔ اگر اس وقت علامہ صاحب سے مل لیتا تو شاید وہ اضطراب ختم ہو جاتا جس اضطراب نے مجھے حالات کی چٹانوں سے ٹکرائے رکھا اور بالآخر ان چٹانوں نے مجھے راستہ دیا۔

میرے ساتھی علامہ صاحب کی تقریر پر تحسین کے پھول پھلنے لگے اور کر رہے تھے لیکن میں بالکل خاموش تھا۔ میں چاہتا تھا کہ عام ذکر سے ہٹ کر خراج تحسین کا کوئی نیا انداز اختیار کروں۔ صرف لفظوں کے پھول تو وہ پیش کیا کرتے ہیں جن کے سینوں میں زخم کے پھول نہیں کھلتے اور جن کے لبو میں چمن کھلانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

لاہور مجھے راس نہ آیا، لیکن آگے بڑھنے کی جو چنگاری روشن ہو چکی تھی اسے نہ وقت بجھاسکا اور نہ فاصلے مدھم کر سکے۔ چار پانچ سال کی کشمکش کے بعد میں ایک دن پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے سامنے کھڑا تھا۔ علامہ علاء الدین صدیقی صاحب اس شعبے کے سربراہ تھے۔ میں ایم اے میں داخلہ لینے کے لیے آیا تھا۔ اندر داخل ہوا۔ علامہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ ڈاڑھی کی تراش خراش ان کے شستہ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ چہرے پر دنوازی تبسم، آنکھوں میں شفقت اور بصیرت کی آمیزش، باتوں میں احتیاط کے ساتھ گھلاوٹ۔ دو برس ان سے اکتساب فیض کیا اور ان کی زندگی کے کئی پہلو دیکھے۔ ان پہلوؤں میں وضع داری کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کی لچک اور ایک خاص انداز کا بہاؤ دیکھا۔ وہ جب ہم سے دل کی باتیں کہنے لگتے تو کہتے ہی چلے جاتے۔ پھر یوں لگتا جیسے وہ ہم

میں سے ہیں اور ان سے زیادہ ہمارے کوئی اور قریب نہیں۔ میں نے وفور محبت سے کئی بار ان کی آنکھوں کو نمناک دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی شعبہ علوم اسلامیہ کے قریب سے گزر رہوتا ہے تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان دھڑکنوں میں کوئی اور بھی شریک ہے۔

علامہ صاحب کی بعض تشریحات سے ہم کئی طلبہ کو اختلاف رہا۔ ہم نے بعض اوقات اپنے موقف کی حمایت میں گرم گرم باتیں کیں، لیکن علامہ صاحب نے حکماً ہماری زبان بند کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی، وہ ہمیں مطمئن کرنے کے لیے ہمیشہ دلائل دیتے تھے۔ ان کے دلائل نے ہمیں مطمئن کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن ان کا طرز عمل اپنا کام کر گیا۔ اس وقت سے ایسا مزاج بن گیا ہے کہ اگر کسی نے طاقت سے کوئی بات منوانا چاہی، تو اس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی اور اگر کسی نے دلائل اور معقولیت سے بات کی تو اس سے شدید اختلاف کے باوجود اس کا احترام کیا۔

ہمیں کبھی کبھی ان پر غیر ضروری مصالحت پسندی کا گمان ہونے لگتا تھا، لیکن بعد میں ہمیں یہی احساس ہوتا کہ یہ ہماری کوتاہ نظری تھی۔ دراصل ان کے کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دماغوں کو جیت لینا چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ دوسروں کے دلوں کو بہت کم ٹھیس پہنچاتے ہیں، لیکن یہ رواداری ایک حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب اسلام کے مبادیات پر آنچ آنے لگتی ہے تو وہ نتائج سے بے پروا ہو کر حملہ آور پر بھرپور وار کرتے ہیں۔ ہم نے یہی دیکھا ہے کہ جو میدان میں آتا ہے، اسی سے لوگ اختلاف بھی کرتے ہیں۔ تمام کاموں کو چھوڑ کر آپ گوشہ تنہائی میں دبک بیٹھیے، آپ سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرے گا۔

علامہ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ دیکھی کہ وہ ہر طبقے کی زبان اور لب و لہجہ سمجھتے ہیں اور جواب اسی کے مطابق دیتے ہیں۔ وہ عوام کی زبان بھی جانتے ہیں اور ایوانوں میں رہنے والوں کے رمز شناس بھی ہیں۔ انہیں محبت کا لہجہ بھی آتا ہے اور دیوانوں کی سی تندہی و بے باکی بھی، لیکن ان کی دیوانگی پر فرزانگی کا گماں ہوتا ہے۔

یہی وہ تاثرات تھے جن کے سہارے میں نے علامہ صاحب سے انٹرویو کی

درخواست کی۔ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے وقت دے دیا۔ میں ۱۶ جنوری کو ٹھیک دو بجے دوپہر علوم اسلامیہ جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی علامہ صاحب فرمانے لگے:

”آؤ الطاف، میں اپنے ذہن کو انٹرویو کے لیے تیار کر رہا تھا اور دیکھو، اس سے پہلے کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب دوں، میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں“:

”فرمائیے۔“

”الطاف، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ریڈرز ڈائجسٹ کے ذریعے عیسائیت کی آواز لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک پہنچتی ہے لیکن اسلام کی آواز ہزاروں تک بھی نہیں پہنچتی۔ انگریزی زبان میں ایسا لٹریچر موجود نہیں ہے جس میں اسلام کی تعلیمات کو سہل اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی صلاحیتوں میں سے کچھ صلاحیتیں اس دین کے لیے وقف کر دو جو اس خدا کا دین ہے جس نے تمہیں یہ صلاحیتیں دی ہیں۔ ہمیں انگریزی میں ایک ایسا جریدہ نکالنا چاہیے جو خالص اسلام کو سلیقے سے پیش کر سکے۔“

”علامہ صاحب، اگر یہ زندگی مستعار اس کی راہ میں کام آ جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔“

”اچھا، قریشی صاحب، اس کا تفصیلی پروگرام بعد میں طے کریں گے، آپ اپنے سوالات کے بم چلائیے۔“ ان کے چہرے پر قدرے شوخ مسکراہٹ تھی۔

میں نے اپنا پہلا سوال پوچھا:

”انسان جوں جوں حضارت کی طرف بڑھتا ہے مذہب سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ مذہب تہذیب و حضارت کا ساتھ نہیں دے سکتا؟“

علامہ صاحب نے جواب میں فرمایا:

”حضارت سے پہلے زندگی سادہ ہوتی ہے۔ معاش کا حصول آسان ہوتا ہے اور فراغت کی فراوانی ہوتی ہے۔ انسان کو مذہبی معتقدات پر سوچ بچار کے لیے کافی وقت ہوتا ہے۔ لیکن شہری زندگی انسان کو مادی مصروفیات میں اس قدر الجھائے رکھتی ہے کہ مبدا اور معاد کے متعلق سوچنے کے مواقع کم سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مذہب کا کام اتنا سادہ ہونا

چاہیے کہ وہ سادہ زندگی کی بھی رہنمائی کر سکے اور اتنا دلپذیر کہ تہذیب کی حسن کاریوں میں اپنی افادیت منوا سکے۔ جو مذہب توہمات اور رسوم و رواج پر زیادہ زور دے گا وہ شہری زندگی میں چل نہیں سکے گا۔ لیکن فطرت کی طرح سادہ مذہب جو اپنے دامن میں پاکیزہ زندگی کی تعمیر کا سامان رکھتا ہو، وہ تہذیب کے ادوار میں بھی روشنی کا مینار ثابت ہوگا۔ حضارت سے مذہب یقناً متاثر ہوتا ہے لیکن اس کی ابدی اور عالمی قدریں جوں کی توں رہتی ہیں۔“

”علامہ صاحب، آپ کسی ایسے مذہب کا نام لے سکتے ہیں جو تہذیب و تمدن کے دور میں بھی پھلا پھولا ہو؟“

”کیوں نہیں، اسلام میں وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں موجود ہیں جن کا تقاضا تہذیب و تمدن کا ارتقا کیا کرتا ہے۔ اسلام نے معاشرے میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے کے بعد ایک نئے تمدن کی بنا ڈالی۔ اس تمدن نے دوسرے تمدنوں کو ایک بڑے عرصے تک ابھرنے نہیں دیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ اسلامی تمدن کا اپنا رنگ پھیکا پڑنا شروع ہو گیا اور غیر اسلامی تہذیبیں اس پر اثر انداز ہوتی رہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اسلامی تمدن ہمیشہ کے لیے مٹ گیا ہو۔“

”علامہ صاحب، آپ کی باتیں علمی اعتبار سے تو صحیح نظر آتی ہیں، لیکن جب ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھتے ہیں، تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ تہذیب کے ہاتھوں اسلام کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے مذاہب کا ہوا ہے۔“

”نہیں، قریشی صاحب، بڑا فرق ہے۔ دوسرے مذاہب ایک تہذیب اور ایک تمدن کی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں۔ وہ اس لیے کہ ان میں بین الاقوامی وسعت موجود نہیں۔ اسلام کی بنیاد جن اصولوں پر ہے وہ عالمگیر صداقت کے حامل ہیں۔ یہ صداقتیں تھوڑی دیر کے لیے غلط عقائد و نظریات کے نیچے دب تو سکتی ہیں، لیکن صداقتوں کے چراغ بالکل بجھ نہیں سکتے ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی ان چراغوں کی لود مہم پڑی، ہزاروں شیدان حق آگے بڑھے، خاک و خون میں نہائے اور ان چراغوں کو تازہ غذا دے گئے۔ کیا آپ مختلف مسلم مملکتوں میں اسلام کی طرف رجوع کر دے گی گونج نہیں سنتے اور کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ انبیائے کرام کی

روشنی کو محفوظ رکھنے کے لیے کتنے سینے مضطرب رہتے ہیں اور کتنے دیوانے دار و رسن کو لبیک کہتے ہیں۔ کیا اس جاندار تمدن کو کبھی ختم کیا جاسکتا ہے اور کیا تہذیب و حضارت کے رنگین سائے اس روشنی کو ڈھانپ سکتے ہیں؟“

علامہ صاحب کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا، لیکن ان کا لہجہ دھیمّا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ باتیں جذباتی لگاؤ کی بنا پر نہیں کر رہے، بلکہ گہرے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ علامہ صاحب نے تقابل ادیان پر سب سے زیادہ کام کیا ہے کیوں نہ کچھ اس سلسلے کی بات اٹھائی جائے۔ میں نے سوال کیا:

”مختلف ادیان کے تقابلی مطالعے کے بعد آپ نے کس مذہب کو زندگی کی وسعتیں اور تجربات سمیٹ لینے کے اہل پایا؟“

علامہ صاحب نے کرسی کی پشت کا سہارا لیتے ہوئے کہا:

”میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی پوری پوری صلاحیت ہے۔ جو بات اس دین کو باقی تمام مذاہب سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ریکارڈ محفوظ ہے اور اس کی تعلیمات تھک نہیں گئیں۔ اس کا دائرہ پوری انسانیت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اخوت اور مساوات اس نظام کے دو اہم پتھر ہیں جن پر احترام انسانیت کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ باقی تمام مذاہب میں تخلیق انسانی کے تصور میں گناہ کی آمیزش ہے، یعنی انسان طبعاً ناپاک اور گناہ گار ہے اور وہ ساری زندگی اس گناہ کی آلودگی کو دھونے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام انسان کو خدا کا نائب قرار دیتا ہے جس کا کام اس کائنات کی تعمیر ہے جس میں اسے بھیجا گیا ہے۔ یہ تعمیری نقطہ نگاہ کتنا حیات آفرین اور امید افزا ہے! اس دین کا پیروکار چوروں کی طرح چھپتا نہیں پھرتا، بلکہ آگے بڑھ کر زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور زندگی کو وہ آسودگی عطا کرتا ہے جس کی انسان کو تلاش رہتی ہے۔

یہ نظام تقویٰ، ایمان اور اسلام کے ذریعے انفرادی تربیت کا جامع پروگرام رکھتا ہے۔ تنظیم اور ایثار کے ذریعے اجتماعی شعور ابھارتا ہے اور قسامرون بالمعروف و تنہون

عن المنکر کے ذریعے عالمگیر ہدایت پوری نوع انسانی تک پہنچاتا ہے۔ یہ تنظیم اور یہ ہمہ گیر نظام اور کسے میسر ہے؟

اسلام کی ایک معجز نما خوبی یہ ہے کہ وہ تمام مذاہب کی صداقتوں اور برگزیدہ شخصیتوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس طرح احترام انسانیت و صداقت کا وہ راستہ کشادہ کر دیتا ہے جو کہیں اور نظر نہیں آتا۔ اس بنا پر تمام انسانوں کے لیے مقام امن اور مقام تعاون بن جاتا ہے۔ الاسلام تمام انبیاء کا مذہب تھا، ان کی امتیں مسلم تھیں۔ اس اعتبار سے جہاں کہیں بھی صداقت موجود ہے، وہ اسلام ہے اور اسلام سے باہر کوئی صداقت نہیں۔ یہ وسعت آپ کو اور کہاں ملے گی؟

اسلام سادہ سہل اور انسانی فطرت کے سب سے قریب ہے۔ اگر دیانت دار آدمی کے سامنے اسلام اور باقی مذاہب بیک وقت پیش کیے جائیں تو اس کا فیصلہ اسلام کے سوا اور کسی کے حق میں نہیں ہو سکتا۔ یہی فیصلہ افریقہ میں ہونے والا ہے۔“

میں ٹھنڈے دماغ کے ساتھ علامہ صاحب کے ارشادات پر غور کرتا رہا۔ وہ اپنی بات مکمل کر چکے تو میں نے سوال کیا:

”علامہ صاحب، آپ کہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب بالخصوص مسیحیت کی بنیاد ایک ایسے فلسفے پر ہے جو زندگی کا نشو و نما روک دیتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں زندگی ہنستی کھیلاتی اور آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔“

”لیکن الطاف صاحب، آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مغرب پر مسیحیت کا نہیں مادیت کا قبضہ ہے۔ مادی فلسفے نے جسم کو کچھ راحتیں بخش دی ہیں، لیکن ان سے اخلاق کی پاکیزگی اور روح کی طمانیت چھین لی ہے۔ وہ کھوکھلی تہذیب جس کی ظاہری چمک دمک ابھی تک کچھ قائم ہے، بس دھڑام سے گرنے ہی والی ہے۔ غیر فطری طریقوں سے کوئی نظام زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”علامہ صاحب، آپ نے مشرق بھی دیکھا ہے اور مغرب بھی۔ آپ ایمان داری سے بتائیے کہ آپ نے مغرب میں رہنے والوں کے اخلاق ساکنان مشرق سے اچھے نہیں پائے؟“

علامہ صاحب نے محبت کی نظر سے مجھے دیکھا اور اردو میں عربی لہجہ داخل کرتے ہوئے فرمانے لگے:

”اچھے اور برے لوگ دونوں طرف ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ایک عالم مسلمان کا اخلاق ایک عیسائی عالم کے اخلاق سے یقیناً بہتر ہے اور چیزوں کی طرح وہاں اخلاق کی بھی نمائش ہوتی ہے۔ الطاف، کیا تم انہیں با اخلاق کہو گے جو تمہارا رومال تو نہ چرائیں، لیکن نقب لگا کر تمہاری قوم کی ساری متاع چرا کر لے جائیں، کیا ہم ان بھیڑیوں کو با اخلاق انسان کہہ سکتے ہیں جو آئے دن یہ دھمکیاں دیتے رہتے ہیں کہ ہم گلستانوں کو گورستانوں میں تبدیل کر دیں گے۔ یہ اخلاق باختہ قومیں احترام انسانیت کے مفہوم سے کلیۃً نا آشنا ہیں۔“

”علامہ صاحب، آپ کو یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسیحیت پر ایمان رکھنے والے جس مستعدی سے اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں، اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں کام صفر کے برابر ہے۔“

علامہ صاحب نے انگریزی زبان میں جواب دیتے ہوئے فرمایا:

”یہ مسیحی مبلغین مذہب کو نہیں، بلکہ اپنی تہذیب کو مذہب کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں۔ مسیحیت میں اتنی جان نہیں کہ وہ عقل سلیم کو متاثر کر سکے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ آج کی مسیحیت فلسفہ زندگی کے اعتبار سے جتنی کمزور ہے اس کی تنظیم اسی قدر مضبوط ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام دلائل و براہین کے اعتبار سے جتنا محکم ہے، تنظیم کے اعتبار سے آج اتنا ہی ضعیف ہے۔“

علامہ صاحب کے بالوں میں سیدھی مانگ میرے خیالات کو دو حصوں میں منقسم کر رہی تھی۔ ایک طرف افریقہ کا وسیع براعظم میرے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جہاں انسان ابھی فطرت کے بہت قریب ہیں اور دوسری یورپ اور امریکہ کی وسیع سرزمین تھی جس پر خرد کم مایہ کی حکمرانی ہے۔ اسی خرد کم مایہ نے ہر مذہب کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے۔ میں نے اسی جنگ کے بارے میں علامہ صاحب سے سوال کیا:

”کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب انسانی فکر پر کچھ ایسی پابندیاں عاید کر دیتا ہے جن سے عقل

انسانی کا ارتقاء رک جاتا ہے؟“

علامہ صاحب نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا:

”پابندی اپنی ذات میں کوئی بری چیز نہیں۔ سڑکوں کے نشانات اور ٹریفک کی پابندیاں انسانی جان کی حفاظت کرتی ہیں۔ بزرگوں کی نصیحتیں اور معالج کے مشورے انسان کو پابند ضرور کرتے ہیں، لیکن ان پابندیوں کا نتیجہ عموماً اچھا ہوتا ہے۔ پابندیاں دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک انسان کی لگائی ہوئی پابندیاں جس میں پابندی لگانے والے نے اپنے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے۔ اسلام ان پابندیوں کی زنجیروں کو کاٹنے کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ حضور ﷺ انسانوں کے بوجھ کو کم کرتے اور ان زنجیروں کو کاٹتے ہیں جو انہیں جکڑے ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے عقل خود غرض کی پابندیاں اور آزادیاں دونوں ہی مضر ہیں۔ دوسری قسم کی پابندیاں خالق انسان کی طرف سے ہو سکتی ہیں۔ خالق اپنی مخلوق کا برا نہیں چاہتا۔ اس کی عاید کردہ پابندیاں انسانی فطرت اور عقل سلیم کے ارتقا کو کیونکر روک سکتی ہیں۔ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ خدا تمہارے لیے سہل اور آسان زندگی پسند کرتا ہے، تمہیں تنگی اور دقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ ہم معالج کی پابندیاں اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ وہ ہمارے جسم اور امراض کے بارے میں ہم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ خالق کائنات کے وسیع علم پر مبنی پابندیاں اس لیے واجب القبول ہیں کہ اسے ہم سے محبت ہے اور وہ ہماری تعمیر چاہتا ہے اور اس نے یہ پابندیاں انسانی فطرت کے تقاضوں کو جانتے ہوئے لگائی ہیں۔“

علامہ صاحب الفاظ تول تول کر استعمال کر رہے تھے۔ ان الفاظ کے پیچھے بصیرت تھی اور والہانہ پن تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدا نے انسان پر مذہب کے ذریعے جو پابندیاں عاید کی ہیں اس پاک سرزمین کے نوجوان ان سے گریزاں کیوں ہیں۔ ان کو آگے بڑھ کر اس سانچے کو قبول کرنا چاہیے تھا۔ یہی سوال میں نے علامہ صاحب سے پوچھ لیا:

”پاکستان مذہب کے نام پر وجود میں آیا، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں کا تعلیم

یافتہ طبقہ مذہب سے بیزار سا ہے؟“

علامہ صاحب ایک دو لمحوں کے لیے رک گئے جیسے غم انگیز حقیقت نے انہیں مغموم کر

دیا ہو۔ پھر دھیمے اور گداز لہجے میں بولے:

”میں تعلیم یافتہ طبقے کی مذہب سے بیزاری کا اعتراف کرتا ہوں، لیکن ملی اقدار سے ناواقفیت اور غلط نظام تعلیم کو میں اس کا سب سے بڑا سبب قرار دیتا ہوں۔ لوگوں پر مذہب کی افادیت واضح کرنے کے مواقع بہت کم ہیں۔ دراصل وہ اس دین سے بیزار ہیں جس کا مظاہرہ جہلاء کرتے ہیں۔ رائج مسیحیت کا کھوکھلا پن مغرب کو مذہب سے بیزار کر گیا۔ اس کا علاج صرف ایک ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو اس طرح عام کیا جائے کہ زندگی میں ان کی افادیت کا احساس ہو جس نے ایک دفعہ عوین کا اصل چہرہ دیکھ لیا، وہ اس سے پھر کبھی بیزار نہیں ہوا۔“

”علامہ صاحب، آپ نے مذہب سے بیزاری کی دو وجہیں بتائی ہیں: اسلام کی بنیادی تعلیمات سے عدم واقفیت اور غلط نظام تعلیم۔ لیکن انگریزوں کے عہد میں یہ نظام تعلیم آج سے بہتر تو نہیں تھا؟“

”آج کے مقابلے میں بہت ناقص تھا اور سچ پوچھیے آج ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں، وہ اسی نظام تعلیم کی پیداوار ہے۔ انگریز نظام تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی زندگی کو بے مقصد بنانا چاہتا تھا، وہ اس میں کامیاب رہا۔ مسلمان بے مقصد زندگی گزارنے پر مطمئن ہو گئے اور اسی وقت سے ہماری عظمت رفتہ کا چراغ گل ہو گیا۔ پھر اس نے ”دین اور دیندار“ کے خلاف منظم سازش کی اور دیندار طبقے کو معاشرتی لحاظ سے اتنا ذلیل کیا کہ عام مسلمانوں میں اس طبقے کے خلاف نفرت بیٹھتی چلی گئی، مگر چونکہ اس عہد میں تصادم ہوتا رہتا تھا، اس لیے مذہب سے شیفٹنگ کا جذبہ سرد پڑنے نہیں پایا۔ ہر تصادم کے بعد مذہبی جوش شدت اختیار کر جاتا تھا اور دین کے تحفظ کا احساس تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد تصادم کے مواقع تو ختم ہو گئے لیکن وہ نظام تعلیم اسی طرح باقی رہا جو مسلمانوں کو مسلسل مار فیا کے انجکشن لگا رہا تھا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں قوم سستی، بے عملی اور دینی بے غیرتی کا شکار ہو گئی ہے۔“

”دینی بے غیرتی“ کے الفاظ علامہ صاحب نے بڑے دکھ کے ساتھ ادا کیے تھے۔ ان الفاظ کو ادا کرنے سے پہلے وہ ایک ٹائیپ کے لیے رک گئے تھے۔ ان کا ذہنی کرب ان کے

چہرے سے عیاں تھا، لیکن میں دل ہی دل میں اس تضاد پر غور کر رہا تھا کہ علامہ صاحب جس کو دینی بے غیرتی سے موسوم کر رہے ہیں، وہی آج کا چلن قرار پایا ہے۔ اسلام سے بیزاری کا ذکر کیے بغیر نہ آپ ماڈرن کہلا سکتے ہیں اور نہ دانش ور۔ اس موقع پر جناب احسان دانش کا فقرہ یاد آیا:

”قریشی صاحب! اب وہ وقت دور نہیں جب ہمارے پوتوں پر انگلی اٹھاتے ہوئے لوگ کہا کریں گے کہ ان کے دادا کے گھر میں نکاحی عورت تھی۔“

اس فقرے کا گھاؤ تازہ ہو گیا تھا۔ ٹیسس اٹھنے لگیں۔ میں نے اسی عالم میں سوال کیا: ”یہ بات آئے دن سننے میں آتی ہے کہ اسلام میں جو فقہی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس رائے کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟“

علامہ صاحب کے چہرے پر اعتماد اور اطمینان کی شگفتگی پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا:

”میں اس رائے کو پوری طرح صحیح نہیں سمجھتا۔ اسلام بحیثیت دین اپنے اندر اتنی جاذبیت اور صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کو ایک مستقل اور نافذ العمل پروگرام دے سکے۔ فردی اختلافات اس پروگرام پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ اختلافات تو فکری زندگی کا ثبوت ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ بنیادی اصولوں سے ہٹے نہ ہوں۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور عقل کی محدود رسائی کبھی صحیح اور کبھی غلط نتیجے پیدا کرتی رہتی ہے۔ اگر یہ نتیجے اساس دین اور مزاج شریعت سے نہ ٹکرائیں، تو کوئی حرج نہیں۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنی وسعت قلبی کی بدولت مختلف مکاتب فکر کو یکساں محترم قرار دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں ہزاروں اختلافات ہیں، اس کے باوجود مسلمان ان کے قائدین کو یکساں عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسلام کی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ نیک نیت اختلافات، بدینتی پر مبنی اتحاد سے یقیناً بہتر ہوتا ہے۔ اسلام نے تفکر اور تدبر کو مقام عبادت کے قریب ٹھہرایا

ہے۔ ماحول، تربیت اور تعلیم کے تنوع سے مفکرین کے نتائج فکر قدرے مختلف ہوتے رہے اس سے ملت اسلامیہ کے شیرازے کو قطعاً کوئی ضعف نہیں پہنچا، جب تک قدر مشترک اللہ کی الوہیت، محمد ﷺ کی رسالت اور اسلام کی ہدایت رہے۔

”لیکن علامہ صاحب، یہ تو ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں فقہی اختلافات اور قرآن و سنت کے مفاہیم اور اطلاقات کے تعین میں اختلافات نے جو صورت اختیار کر لی ہے، اس سے ایک عام مسلمان کا ذہن انتشار کا شکار ہے اور غالباً یہی اختلافات تعلیم یافتہ طبقے کو دین سے دور لیے جا رہے ہیں۔“

”آپ کی بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ حقیقی اختلافات اسی وقت شدت اختیار کرتے ہیں جب اصول و مبادیات آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو عام کیجئے، پھر دیکھئے کہ فقہی اختلافات کی شدت کتنی کم ہو جاتی ہے۔ فقہی اختلافات کو ہوا دینے والے جان بوجھ کر قرآن اور سنت کی واضح تعلیمات کو ذہنوں سے محو کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر معاشرہ اسلام کے مزاج سے روشناس ہو جائے اور اسلام کے اساس سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لے، تو پھر فکری اختلافات ایک حد سے آگے کبھی نہیں بڑھیں گے۔

اس کے علاوہ چونکہ پوری قوم کے سامنے کوئی ہمہ گیر اور ٹھوس پروگرام نہیں ہے، اس لیے اس کا ان اختلافات میں الجھنا بالکل فطری ہے۔ قوم کو زندگی سے بھرپور پروگرام دیجئے اور پھر دیکھئے کہ اسلام اس قوم کو کس قوت کس عزم سے ہمکنار کرتا ہے۔ بے عملی کے دور میں ہر قوم کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

میں نے اپنی اور علامہ صاحب کی گھڑیوں پر نظر ڈالی، دونوں گھڑیوں کے وقت میں فرق تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو اس اختلاف کی طرف سے ہٹا کر انٹرویو پر مرکوز کر دیا۔ کچھ اور سوچنے کے لیے کہاں وقت تھا۔ میں نے اپنی سوچ کی تمام قوتیں علامہ صاحب کی سوچ تک پہنچنے کے لیے مجتمع کی ہوئی تھیں، لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی ریاضت کے مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔ اس کشمکش سے آزاد ہونے کے لیے میں آگے سوال کی طرف بڑھا:

”ہمارے معاشرے میں وہ پرانی قدریں دم توڑ رہی ہیں جن کے ذریعے ایک شاندار ماضی سے ہمارا تعلق قائم تھا۔ ان قدروں کے احیاء کا کام کہاں سے شروع کیا جائے؟“

علامہ صاحب نے قدرے میز پر جھکتے ہوئے جواب دیا:

”نظام تعلیم میں رسول اکرم ﷺ کی سیرت کے اسباق اس طرح سمودیے جائیں کہ طلبہ محسن کل سے والہانہ محبت کرنے لگیں۔ میرے نزدیک سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام کے اولین دور کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر قرآن حکیم کی تعلیمات پیش کی جائیں تاکہ پڑھنے والے یہ جان سکیں کہ ان تعلیمات نے تاریخ میں کیسے کیسے عظیم انسان پیدا کیے۔ ایسا کرنے سے عام سوسائٹی میں عشق رسول پیدا ہوگا اور لوگوں میں اپنی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا ذوق و شوق تیز ہوگا۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ نیک کام کرنے کی تحریکیں فیشن کے طور پر رائج ہونی چاہئیں۔ چھوٹے چھوٹے گروپ اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ اس طریق کار سے پرانی قدروں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔“

”لیکن علامہ صاحب، ایک ایسے ماحول میں جس کا اجتماعی ضمیر قریباً قریباً نیم مردہ ہو، جہاں ایسے مناظر عام ہوں جو نو جوانوں کے لیے شراب کا سانشہ لیے ہوئے ہوں، جہاں بدی منظم ہو کر نیکی کا گلا گھونٹنے کے لیے اپنے بازو پھیلا رہی ہو، وہاں نیکی کی تحریکیں از خود کیسے ابھر آئیں گی؟“

ایک لمحے کے لیے علامہ صاحب کی پیشانی پر اضطراب کی شکنیں نمودار ہوئیں، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نہایت اعتماد کے ساتھ کہنے لگے:

”الطاف، میں کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ جب تک میری قوم میں ایک فرد بھی اساس کا چراغ لیے ہوئے ہوگا، میں اپنے ماحول کو تباہ نہ کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ قوم میں اچھے لوگوں کا فقدان نہیں، صرف ان میں حرکت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ حرکت پیدا ہو کر رہے گی۔ میں یہ بات کیسے مان لوں کہ وہ قوم جو حق کے لیے سردھڑکی بازی لگانے والے سپوتوں کو صدیوں سے جہنم دیتی رہی ہو، وہ دفعۃً بانجھ ہو گئی۔ مجھے اس بات کا شدت سے

احساس ہے کہ یہاں بدی منظم ہو رہی ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ حکومت کو بڑے پیمانے پر بدی کے استیصال کا پروگرام بنانا چاہیے۔ قرآن حکیم میں اسلامی ریاست کا مقصد قیام یہ بتایا گیا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ جب ہم یہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ، دراصل اسی وقت ہم خدا سے یہ عہد کر رہے تھے کہ اگر ہمیں اقتدار سونپا گیا تو ہم نیکی کو پروان چڑھائیں گے، لوگوں کو اچھے کام کرنے کا حکم دیں گے، بدی کو قوت سے روکیں گے۔ میری آرزو ہے کہ حکومت اپنے اصل کام کی طرف جلد سے جلد توجہ دے۔“

علامہ صاحب کی آرزو، پوری قوم کی آرزو ہے۔ قوم وہ مبارک ساعت دیکھنے کی منتظر ہے جب اس سرزمین پر صحیح معنوں میں اسلام کا غلبہ ہو۔ اس اسلام کا جو درس حریت دیتا ہے جو نظروں میں پاکیزگی بھرتا ہے، دلوں کو صاف کرتا ہے، دماغوں کو جلا بخشتا ہے، روح کو تازگی دیتا ہے اور انسان کا احترام سکھاتا ہے۔ جو ساری دنیا کے لیے پیام امن ہے جس کی آغوش میں سب کے لیے شفقت ہے جس کی نظر میں سب ایک جیسے ہیں اور جو برائیوں کے خلاف سب سے منظم طاقت ہے۔

ان حسین تصورات میں یکبارگی ایک نیا خیال ابھرا اور میں علامہ صاحب سے

مخاطب ہوا:

”ہماری نفسیات کچھ ایسی ہے کہ اگر حکومت فرد پر صرف معقول پابندیاں ہی عاید کرے، تب بھی ان کے خلاف شدید رد عمل ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر حکومت نے اسلامی احکامات کو طاقت کے زور پر نافذ کرنا چاہا تو شاید نتائج اچھے نہ نکلیں۔“

علامہ صاحب نے آنکھوں پر سے عینک اتارتے ہوئے جواب دیا:

”ہماری یہ نفسیات ایک صدی کی غلامی کی پیداوار ہے۔ عہد غلامی میں ہم انگریز حاکموں پر کبھی اعتماد نہیں کرتے تھے، اس کے برخلاف ہمیں اپنے قائدین پر مکمل اعتماد تھا۔ آزادی کے بعد انگریزی ساخت کے حکام نے تبدیلی حالات سے نہ خود سبق لیا اور نہ قوم کے قریب آ کر اسے فائدہ پہنچایا۔ بے اعتمادی کی نفسیاتی فضا کو ختم کرنے کا سب سے اچھا طریقہ

یہ ہے کہ حکام عوام کے ایک ایک فرد کو اپنے اعتماد میں لیں۔ اس تبدیلی کے بغیر اصلاح احوال کی تمام تدبیریں بے اثر ثابت ہوں گی۔“

چار بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ علامہ صاحب نے کہیں جانا تھا اور یہ گھنٹی اسی کی یاد دہانی کے لیے تھی۔ علامہ صاحب نے بیس پچیس منٹ کے بعد آنے کا وعدہ کیا۔ میرا دل دھڑکا کہ انٹرویو درمیان ہی میں رہ جائے گا۔ میں نے فوراً ہی ایک اور سوال کیا:

”بین الاقوامی تعلقات اور ہماری پیچیدہ زندگی نے جو معاشرتی، ثقافتی اور معاشی مسائل پیدا کر دیے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کے لیے کیا طریق کار اختیار کرنا ہوگا؟“

علامہ صاحب نے میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے کہا:

”علمی تحقیقات اور مشترکہ فکری مجالس کا قیام عمل میں لایا جائے اور بحث و تحقیق میں کسی فکر یا مسلک فکر پر دروازے بند نہ کیے جائیں۔ اس انداز کی فکری مجالس ہی قوم میں وہ حقیقی شعور پیدا کر سکتی ہیں جو بین الاقوامی نازک اور پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں جامعات کے اعلیٰ درجے کے اساتذہ اور تلامذہ کی مستعدی اور توجہ کی بے حد ضرورت ہے۔“

”علامہ صاحب، کیا یہ مسائل آزاد اجتہاد سے حل ہوں گے یا قرآن و سنت کی پابندیوں کے ساتھ؟“

”میرے نزدیک وہ اجتہاد جو ایمان کی روشنی سے آزاد رہ کر کیا جائے، بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ آزاد فکر شتر بے مہار کی طرح خاردار جھاڑیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے، لیکن شریعت کے مصالح اپنے چلنے والوں کی رفتار، انداز رفتار اور رسائی منزل کی پوری کفالت کرتے ہیں۔ اسلام میں ربانی ہدایت اور نبوی حکمت کو نظر انداز کر کے فلاح کی کوئی صورت ممکن دکھائی نہیں دیتی۔ اجتہاد اسلام میں ایک شرعی اصطلاح ہے جو کتاب و سنت کے تحت رو بہ کار آئی ہے، کھلے فکر کو اجتہاد کہنا شرعی اصطلاح کی توہین ہے۔“

میرا ہاتھ وقت کی نبض پر تھا۔ نبض تیز چل رہی تھی۔ میں نے وقت کا اہم سوال اٹھایا:
 ”پاکستان میں عیسائی مشنریاں جس قوت سے کام کر رہی ہیں، ان کے اثرات کو
 روکنے کے لیے کیا یہ کافی ہے کہ ہم رنج اور غصے کا اظہار کرتے رہیں؟“
 علامہ صاحب نے گردن کو ذرا جنبش دیتے ہوئے کہا:

”اسلام دین کی حیثیت سے اب بھی دنیا کا واحد کامیاب اور کامل دین ہے۔ اسے
 صرف اشاعتی تنظیم کی ضرورت ہے۔ اس کی روشنی کو پھیلانے اور اس کی تبلیغ میں کوتاہی سے
 مسلمان خود مورد عذاب ہو رہے ہیں۔ عیسائی تبلیغی جماعتیں اسلام کے مقابلے میں اس سے
 زیادہ بہتر یا اس کے برابر دین پیش کر کے لوگوں کو اپنے دائرے میں شامل نہیں کر رہیں، بلکہ
 ایثار اور تنظیم کے بل بوتے پر خدمت کے صلے میں عقیدے کو تبدیل کرانے میں کامیاب ہو جاتی
 ہیں۔ اسلام کو منظم نظام تبلیغ و اشاعت کی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان مملکت کی سب سے اہم
 ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے صحیح دینی تعلیم کا انتظام کرے تاکہ وہ اغیار کا شکار نہ
 ہو جائیں اور اسلامی اقدار کو غیر مسلموں کے سامنے اہتمام اور سلیقے سے پیش کرے کہ دنیا کے
 آخری اور عالمگیر دین کو ان تک پہنچانے کی حجت پوری ہو جائے۔“

علامہ صاحب چونکہ اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین ہیں، اس لیے میں نے
 کونسل کے بارے میں بھی ایک سوال داغ دیا:

”اسلامی مشاورتی کونسل کس حد تک اسلامی قانون کے نفاذ میں مددگار ثابت ہوئی ہے؟“
 ”تاحال اسلامی مشاورتی کونسل نے بعض ان مسائل کا جواب دیا ہے جو حکومت کی
 طرف سے بھیجے گئے تھے اور انسداد مفاسد کی کچھ تجاویز صدر مملکت کی خدمت میں پیش کی ہیں۔
 اسلامی مشاورتی کونسل نے قرآن اور سنت کی روشنی میں فیصلے کیے ہیں اور یہ اس کا مستقل ارادہ
 سمجھنا چاہیے کہ وہ دین کی عاید کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرے گی۔ موجودہ آئین میں کونسل کے
 لیے خدمت اسلام کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ الحمد للہ کہ کونسل اپنے فیصلوں پر پوری طرح
 آزاد ہے، اگر اس پر کوئی پابندی ہے، تو وہ کتاب اور سنت کی۔ کونسل نے جو تحقیق قانون کا
 ادارہ قائم کیا ہے، اگر اسے مناسب مواقع حاصل ہوتے رہے تو رفتہ رفتہ ملک کے تمام قوانین

اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہو جائیں گے۔“

علامہ صاحب کے ان لفظوں میں کتاب و سنت سے رہنمائی حاصل کرنے کا عزم سرایت کیے ہوئے تھا۔ عشق رسول کی حرارت جذبات کے آگینوں کو پگھلائے دے رہی تھی۔ اس دور میں جہاں اسلام کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کے لیے رسولؐ کی عملی زندگی کے تفصیلی نقشے کو دریا برد کرنے کی سازش کی جا رہی ہے، اس میں اختیارات کی مسند سے کتاب و سنت سے تمسک کا اعلان یقیناً جرأت مندانہ اور ایمان افروز ہے۔ مجھے علامہ صاحب کے وہ الفاظ ابھی تک یاد ہیں جو انہوں نے ایک تاروں بھری رات میں کہے تھے:

”میرے عزیزو، میری یہ زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اگر میں نے کسی مرحلے پر یہ محسوس کیا کہ مجھے اسلام کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا آؤں گا۔ ہم سب کو خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔“

وقت کی کمی کا خیال رکھتے ہوئے میں نے آخری سوال پوچھا:

”ذہین طبقے کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات دلانے میں یونیورسٹیاں کیا کردار ادا

کر سکتی ہیں؟“

علامہ صاحب نے اپنی کشادہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا:

”یونیورسٹیوں کے اساتذہ معیاری علم و فکر کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر یہ اساتذہ اپنی زندگی کا مقصد تلامذہ کی سیرت و کردار کی تعمیر کو بنالیں تو یہی ایک مقام ہے جہاں صحیح طور پر ذہنی غلامی کی زنجیروں کو توڑا جاسکتا ہے۔ اگر علمی تحقیقات میں صالح اور مفید فکر کو سمولیا جائے تو ملک ہزار غربت کے باوجود علمی ریاست و قیادت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اگر ملی تہذیب و ثقافت کے گوشے اجاگر کیے جائیں اور ماضی میں مسلمانوں نے انسانی تہذیب میں جو بے مثل اضافے کیے ہیں، ان کو صحیح پس منظر میں پیش کیا جائے اور مغربی فلسفہ و تہذیب کی بنیادی لغزشوں اور انسانیت پر ان کے مضر اثرات کو علمی رنگ میں پیش کیا جائے تو طلبہ میں اپنی ذات پر ایک گونہ اعتماد پیدا ہوگا اور یہی اعتماد ان میں فکری امیج پیدا کرے گا۔“

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں ہم آہنگی ہو، یعنی تمام شعبہ ہائے علوم کی سمت ایک ہو۔ تقسیم کے فوراً بعد یہ کوشش کی گئی تھی کہ تمام شعبہ ہائے علوم میں ملی نقطہ نظر کو سمودیا جائے۔ لیکن یہ کوشش بعد میں بلند بانگ دعووں میں دب کر رہ گئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعات اپنے فکری نقطہ اجتماع کو متعین کر کے چلیں کہ انہیں طالب علموں کو کیا بنانا مقصود ہے۔ بے مقصد مختلف سمتوں میں جانے والے اور آپس میں ٹکرانے والے شعبے ذہنی انتشار پیدا کرتے ہیں اور یہی انتشار مغرب کی ذہنی غلامی کو قبول کرتا ہے۔ ایک ایسی کمیٹی ہونی چاہیے جو جامعات کے نصابوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کام کرتی رہے اور مسلسل اس بات کا جائزہ لیتی رہے کہ یہ نصاب ملی تقاضوں کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں۔

پونے پانچ بجے میں علامہ صاحب سے مصافحہ کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جس قوت اور پامردی کے ساتھ انہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا اور جس سحر خطابت نے لاکھوں نوجوانوں کو آرزوئے شوق بخشا تھا، وہ قوتیں اور صلاحیتیں اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے نئی نئی راہیں نکال رہی ہیں۔ ان کا عزم جوان ہے۔ ان کے پہلو میں کسک ہے اور وہ قوم کو عظیم مقصد کے لیے جینے اور مرنے کی لذت سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔

وقت کی قلت کے باعث میرے سوالنامے کا دوسرا حصہ رہ گیا تھا جو مندرجہ ذیل سوالات پر مشتمل تھا:

آپ کی زندگی کے حالات، والدین کی تربیت اور ماحول؟

تعلیم کا آغاز اور مختلف مدارج کے تاثرات؟

طبیعت کس فن کو اختیار کرنا چاہتی تھی؟

تحریک پاکستان کا فکری اور واقعاتی جائزہ؟

کیا مسلم لیگ کو وہ قیادت میسر تھی جو پاکستان میں اسلام نافذ کرنے کی صلاحیت

رکھتی تھی؟

ان سوالات کے علامہ صاحب نے یہ تحریری جوابات دیئے:

”۳ نومبر ۱۹۰۷ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ خاندان چھ سات پشت سے لاہور میں

اقامت گزین ہے۔ مغلوں کے زمانے میں بزرگ علمی مشاغل کی بنا پر شہزادگان کے اتالیق رہے۔ اکثر بزرگ علمی اور دینی خدمات میں مصروف رہے۔ والد بزرگوار فنی مہارت کے اعتبار سے اپنے زمانے میں ایرانی مصوری اور نقاشی کے آخری استاد گئے جاتے تھے۔ تجارت پیشہ تھے اور صوفی المشرّب۔ پانچ بھائیوں میں سے چار نے والد کے فنون میں مہارت حاصل کی اور میں نے علمی اشغال کو ترجیح دی۔ لاہور کے چار مدرسوں میں تعلیم حاصل کی۔ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ۔ مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ دروازہ۔ فورمین کرسچین کالج اور لاء کالج لاہور۔ چاروں درسگاہیں عمدہ خصوصیات کے لیے مشہور تھیں۔ اساتذہ میں ملک عبدالقیوم صاحب پرنسپل لاء کالج، استاد التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب اور شیخ التفسیر مولانا عبید اللہ سندھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ میری تربیت میں سب سے زیادہ دخل میرے والد بزرگوار مولینا فیروز الدین صاحب اور استاذ محترم مولینا احمد علی صاحب کا ہے۔ گھر کا ماحول درمیانے درجے کا دینی ماحول تھا لیکن اخلاقی تربیت پر خاصا زور دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ اس زمانے کا عام قاعدہ تھا۔ شروع سے میرا رجحان علمی رہا۔ بچپن میں بھی کہنے فروشوں کی دکانوں سے پرانی کتابیں خرید کر پڑھنے کا شوق تھا۔ زیادہ تر مذہب کے مطالعے کی بے ترتیب سی کوشش شروع سے آج تک جاری رہی۔ کبھی اپنی پرانی کتابوں کو دیکھتا ہوں جو زیادہ تر مذہب اور ادب سے متعلق ہیں، تو حیران ہو جاتا ہوں کہ قدرت نے میری علمی خدمت کی تیاری میں بڑی فیاضی سے مدد کی ہے۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق آج تک دامن گیر ہے اور مذہبی کتب کا شوق بحمد اللہ سب سے زیادہ ہے اور یہی شوق مجھے یہاں لے آیا ہے جہاں ہوں۔ میرے وہم و گمان میں بھی کبھی نہ آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ ایسے ہمدان سے بھی اپنے دین کی کوئی ادنیٰ خدمت لے گا۔ اپنی بے مانگی کا احساس اب پہلے سے زیادہ ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے مقرر اور خطیب کی حیثیت سے اکثر دینی جلسوں میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ غالبہ اسلام کے جذبے سے ہر ملی تحریک میں بقدر حیثیت و استعداد حصہ لیتا رہا تا آنکہ حصول پاکستان کی کشمکش شروع ہو گئی۔ دل نے ایک دم گواہی دی کہ اسلام کے عروج کے لیے آزاد ملک کا حصول ضروری ہے۔ ملت کے اونچے درجے کے رہنماؤں کے سامنے ہزاروں

اہم سیاسی مسائل ہوں گے مگر تحریک پاکستان میں اپنی شرکت اسی جذبے کے تحت تھی جس نے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کو ادھر مائل کیا تھا۔ یعنی پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ، یہ نعرہ اکثریت کے دل کی آواز تھی۔ اپنے دل کی دھڑکن بھی اسی کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تاریخ اسلام کے عروج کی جو داستان پڑھی تھی، وہ پھر دہرائی جانے لگی ہے۔ میرا میدان سیاست میں آنا خدمت کے راستے سے آنا تھا۔ سب سے پہلے بہار کے خونی واقعات کے زخم خوردہ مہاجرین کی خدمت کے لیے مسلم لیگ میں شریک ہوا اور جو بن پڑا کیا۔ پھر بعض احباب کے حسن ظن نے صوبائی مسلم لیگ کا سیکرٹری بھی چن لیا۔ بعد میں صدارت کا ناکام انتخاب بھی لڑا، مگر میری سیاست چنداں کامیاب نہ تھی۔ اس کی کچھ وجوہ ہیں، مثلاً: سیاست میں اخلاقی قدریں ہارنی پڑتی ہیں، مجھے کوئی ایسی تربیت نہیں تھی۔ نیز جو قیادت سامنے آرہی تھی اس میں اسلامی امنگوں کے پورا کرنے کی صلاحیت بہت کم تھی۔ دوسرے سیاست میں مقابلے ہوتے ہیں جن میں سب کچھ جائز ٹھہرتا ہے۔ اپنا انداز فکر اس کسوٹی پر ناقص ہی ثابت ہوا۔ طبیعت جنگ اور پر خاش، تعصب اور بغض سے ہمیشہ متنفر رہی ہے اور سیاسی کامیابی کے لیے یہ ساز و سامان ضروری سمجھا جانے لگا ہے، لہذا لوٹ کے علم کی دنیا میں پناہ لے لی۔ اب جس کو درست سمجھتا ہوں کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اگر عملی جامہ نہ پہنا سکوں تو دوسروں کو سمجھا تو سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ درویش کو اور کیا درکار تھا، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔



انٹرویو: علامہ علاء الدین صدیقی
 شرکاء: پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ، پروفیسر امتیاز سعید
 مجموعی دورانیہ: ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ
 پروڈیوسر: جناب خالد فاروقی



محترم علامہ صاحب ہمیں فخر اور مسرت ہے کہ آج ہمیں آپ جیسی عظیم اور مشفق اور محترم شخصیت سے گفتگو کا یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ علامہ صاحب یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ نے مذہبی، تبلیغی، تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی میدانوں میں ملک و ملت کی گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے آپ نے عام سادہ زندگی سے آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے ملک کی سب سے قدیم دانش گاہ یعنی پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان کے چیئرمین کے عہدوں پر فائز رہے۔ آج ہم سامعین کی معلومات کے لیے آپ کی زندگی کے بارے میں چند سوالات آپ سے کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں میرا پہلا سوال یہ ہے کہ:

(س) بحیثیت وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی آپ کے تجربات کیا کیا ہیں؟

(ج) اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اپنے مخلص رفیقوں کے ساتھ اپنی زندگی کے متعلق چند باتیں کر رہا ہوں۔ اصل میں وائس چانسلر شپ میری زندگی کی آخری مصروفیات میں سے تھی۔ مجھ سے پہلے میرے فاضل دوست، میرے محسن، مشفق پروفیسر حمید احمد خان صاحب وائس چانسلر تھے اور انہوں نے طویل عرصے کے لیے اپنے عہدے کی سرانجام دہی میں کام کیا۔ لیکن کچھ غلط فہمی پیدا ہونے کے بعد ان کو اس سے علیحدہ ہونا پڑا اور اچانک ہی بغیر کسی نوٹس کے مجھے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی بنادیا گیا۔ اس وقت طالب علموں میں ہیجان تھا اور کچھ غلط فہمیاں

بھی موجود تھیں۔ مجھے سب سے پہلے تو اس چیز کو دیکھنا پڑا کہ طالب علموں میں اور پولیس کی انتظامیہ میں ایک تصادم جو رہا تھا کسی طرح وہ ختم کیا جائے۔ چنانچہ میں نے کوشش یہ کی (اور یہ غالباً میرے وائس چانسلری کے دوسرے دن کی بات ہے کہ پولیس میں اور طالب علموں میں تصادم نہ ہو اور پولیس یونیورسٹی کے اندر نہ آئے اور میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس آفیسر صاحبان کو منانے میں کہ وہ یونیورسٹی کے اندر تشریف نہیں لائیں گے اور طالب علم بھی یونیورسٹی کے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے اندر کام کرنا شروع کر دیا لیکن حالات کافی دگرگوں ہو چکے تھے، سٹوڈنٹ تحریک کے بہت سے مطالبات تھے جو وہ بڑے زور سے پیش کرنا چاہتے تھے اور مجھے ان سب سے اپنے عہدے کے اعتبار سے نپٹنے کی ضرورت پڑی۔ میں نے ایک چیز اپنی استادی کی زندگی میں اپنے پیش نظر رکھی ہے کہ استاد شفقت کے بغیر نہیں اور طالب علم احترام کے بغیر نہیں۔ یعنی ان دونوں چیزوں سے یہ نسبت قائم رہتی ہے۔ تو اس وقت معاملہ ذرا اکھڑا ہوا ضرور تھا طالب علموں میں احترام کا مادہ بھی ذرا قصور پذیر ہو رہا تھا اور ادھر شفقت جو ہے وہ بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی تو میں نے ان دو حربوں کو پیش نظر رکھا ایک یہ کہ طالب علم کو احترام قانون کرانے پر آمادہ کر سکوں اور دوسرے یہ کہ بحیثیت استاد شفقت اور رحمت کے ساتھ ان کے ساتھ پیش آؤں۔ چنانچہ اس طرح مجھے کافی کامیابی ہوئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنے وائس چانسلری کے چار سال کا زمانہ پورا کیا اور اس کے اندر اکثر مسائل جو یونیورسٹی کے تھے ان کو درست کیا۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ کے واسطے کچھ ان کی آمدنی کے سلسلے میں دقتیں تھیں ان کو دور کر سکا اور اساتذہ کے متعلق بھی یہی خیال تھا کہ کسی صورت میں ان کی وہ حالت جو پہلے دور میں تھی وہ اس سے بہتر اور اچھی ہو جائے۔ اور اس کے واسطے میں کوشاں رہا۔ وائس چانسلری کے زمانے میں جو مسائل درپیش ہوئے مجھے ان میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ صرف آخری زمانے میں یہ ہوا کہ انتظامیہ نے ایک ہڑتال کر دی تھی اس کو بھی میں نے بخیر خوبی ان کے ساتھ مل کر ایسی صورت میں فیصلہ کر دیا کہ حکومت ان کو کچھ دینے کے واسطے تیار ہو گئی جو ان کے الاؤنسز وغیرہ تھے۔

(س) جی علامہ صاحب! اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے اور مجھے کہتے ہوئے یہ کوئی

باک محسوس نہیں ہوتی کہ آپ کی پوری زندگی ہی بحیثیت استاد، بحیثیت طالب علم اور بحیثیت ایک ماہر تعلیم کے گزری۔ تو آپ ملک کے تعلیمی نظام کو مختلف ادوار میں بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں تو آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ ملک کے تعلیمی نظام، جو دور حاضر میں ہے اس کے بارے میں کیا تاثرات ہیں اور اس سلسلے میں آپ کن کن اصلاحات کے حق میں ہیں؟

(ج) صورت یہ ہے کہ دور حاضر میں یہ مسائل تعلیمی دنیا میں صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ یہ ساری دنیا میں عالمگیر حیثیت سے یہ مسائل درپیش ہیں۔ دنیا کے اندر نو جوانوں میں ہیجان عالمگیر اور جہانگیر صورت میں پایا جاتا ہے اور اس واسطے اس کے اصلی اسباب کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے ایک مختصر سا فارمولا تو یہ ہے کہ خدا دوری ہمارے نظام کے خلل کا باعث ہوئی ہے اور خداری اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم سے ہم بہت دور چلے گئے ہیں اور اخلاقی اور آداب کی صورت میں جو اقدار پہلے موجود تھیں وہ کمزور ہوتی چلی گئی ہیں اور دوسرے یہ کہ ایک دم ملک میں مغرب کے طوفان کو جوائنڈا چلا آتا ہے اس کو قبول کر لیا ہے تو دھیرے دھیرے سے اس سارے معاملے کو پنپایا جاسکتا ہے۔ علاج پھر اس کا وہی رہے گا کہ ایک طرف سے جو بڑے ہیں ان کی طرف سے شفقت پیش کی جائے اور جو چھوٹے ہیں ان کی طرف سے احترام اور ادب پیش کیا جائے۔

(س) اور اسی سلسلے میں یعنی نصاب کے تعلق میں آپ کیا اصلاح تجویز کرتے ہیں؟

(ج) میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی موجودہ ترقی کوئی جانوروں کے ذریعے سے نہیں حاصل ہوئی، ایک لاکھ چوبیس ہزار پینمبر اس کے کنٹریبوشن (Contribution) میں شامل ہیں۔ انہوں نے انسان کو جانور کی حیثیت سے نکال کر ایک مکمل انسان کی صورت تک پہنچایا۔ اس واسطے اب بھی کوشش یہی کرنی پڑے گی کہ انسانوں کے اخلاق کی طرف بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا جائے اور انسانوں کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے باہمی تعلقات محبت اور رحمت پر مبنی ہو جائیں۔

(س) علامہ صاحب میرا خیال ہے کہ اس دور میں ایک نظام تعلیم کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہمارے طلبہ کی بے چینی ہے۔ تو آپ کے خیال میں اس کے کیا محرکات ہیں اور آپ

کی نگاہ میں اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

(ج) طلبہ کی بے چینی میں مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو میرا طبقہ ہے یعنی اساتذہ کا اس سے بھی تھوڑی سی کوتاہی ہوئی کہ انہوں نے اس جنس گزراں مایہ کو ذرا بے غرضی سے دیکھا اور اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ ان کو درکار تھی اور اب ضرورت یہ ہے کہ طالب علموں کو موقع دیا جائے زندگی کے سنوارنے کا اور وہ نہایت ہی شفقت و رحمت کے ساتھ ان کے سامنے وہ مواقع پیش کیے جائیں کہ وہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کی ایک امنگ پیدا کر لیں۔

(س) علامہ صاحب مذہب سے دور یا بے چینی کی وجہ تو نہیں؟

(ج) میں نے تو عرض کیا ہے کہ انبیاء علیہ السلام نے تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار کیں اور آج کے دور میں وہ تمام دیواریں جو ہیں وہ گرائی جا رہی ہیں۔ یعنی مذہب نے دنیا کے اندر اخلاق اور آداب کا صحیح معیار قائم کیا تھا۔ انسان مذہب سے دور ہو گئے ہیں اور اس واسطے اخلاق اور آداب کا معیار جو ہے وہ پست تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس لیے تعلیمی نصاب کے اندر اخلاقی تعلیم کو اور صحیح آداب کی تعلیم کو شامل کرنے کی ضرورت ہوگی۔

(س) مگر طلبہ میں زیادہ تر بے چینی امتحانوں سے نفرت ہے یا تو اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا جو نظام امتحانات ہے وہ ناکام ہو چکا ہے اور یا شاید ہم اس کو پوری طرح سے امپلیمنٹ (Implement) نہیں کرتے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟

(ج) اصل میں اگر آپ دور رس نگاہوں سے دیکھیں تو اقتصادی بد حالی جو ہے وہ زیادہ تر انسانی پریشانی کا باعث ہوئی ہے اور نو جوان جب اپنا مستقبل محفوظ نہیں پاتا تو وہ ہر چیز سے ٹکراتا ہے، ہر چیز کو ٹکراتا ہے۔ یہی وجہ ہوئی ہے کہ نو جوانوں نے جب اپنی تعلیم کے ذریعے سے اپنی زندگی کی کامیابی قریب تر نہیں پائی تو انہوں نے پھر ہر کہہ و مہ کو برا کہنا شروع کر دیا اور بلند و پست کو پست کرنا شروع کر دیا۔ اگر طالب علموں کو موقع دیا جائے کہ وہ تعلیم آزادی کے ساتھ اچھی طرح سے حاصل کریں اور پھر اس سے فائدہ اٹھاسکیں اور فائدے کے مواقع زیادہ کیے جائیں تو میرے خیال میں یہ ان ریسٹ (Unrest) جو ہے یہ ختم ہو جائے۔

(س) شکریہ علامہ صاحب۔ اب ایک دوسرا موضوع ہے۔ وہ یہ کہ آپ اسلامی مشاورتی

کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے طویل عرصے تک ملک و ملت کی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اس کونسل نے جو بعض نمایاں کام سرانجام دیئے اس کی تفصیل سامعین کے لیے بتا دیجیے؟

(ج) بات یہ ہے جی کہ اللہ تعالیٰ کا احسان رہا ہے مجھ پر اور اس نے مجھے اپنے اس عاجز بندے کو صبر کے مقام سے زیادہ شکر کے مقام پر رکھا ہے۔ جتنے فرائض میں نے انجام دیئے ہیں اکثر ان کے واسطے دعوت دی گئی اور میری درخواست پر کوئی چیز بھی نہیں ہوئی۔ اسی طرح وائس چانسلری کا معاملہ تھا اس کا تقرر بھی اسی طرح ہوا۔ اور اسی طرح چیئرمین ایڈوائزری کونسل کا تقرر تھا وہ بھی مجھے اس سے پہلے کچھ علم نہیں تھا کس چیز کے لیے مجھے دعوت دی جا رہی ہے اور ایک دم مجھے یہ کہہ دیا گیا کہ میں ایڈوائزری کونسل میں شامل کر لیا گیا ہوں اور پھر جو نوٹیفکیشن ہوا، میرا نوٹیفکیشن چیئرمین کی حیثیت سے ہوا۔ اب یہ ایک بڑا موقع منصب تھا جس کے لیے میں اپنے آپ کو پوری طرح اہل بھی نہیں پاتا تھا لیکن میں نے گریز نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ اونچے کاموں کو ایڑیاں اٹھا کر انجام دینے کی کوشش کی ہے لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ایڈوائزری کونسل کے کام کا خلاصہ یہ ہے کہ میں تین ٹرمز چیئرمین رہا ہوں۔ یعنی ۹ سال میں نے اس کی صدارت کی ہے اور اس دوران میں کوئی ایک فیصلہ ایسا نہیں ہوا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ یہ سب سے بڑی اچیومنٹ ہے جو کہ اس کونسل کی طرف سے کی گئی۔ اس کونسل نے بڑے بڑے مسائل پر فیصلے بھی کیے۔ چنانچہ کونسل نے اپنے فیصلے سود کے متعلق، شراب کے متعلق، جوئے کے متعلق اور اسی طرح سمنگنگ کے متعلق فیصلے کیے اور اس کے علاوہ یہ ہے کہ کونسل نے جو ملک کا قانون ہے اس قانون کی ۱۵، ۱۶ جلدیں چھپوائیں۔ آل پاکستان قانون کی جو کوڈ ہے اس میں سے کم از کم نصف کے قریب میرے اس دورانیے میں اس کو ریوائرز (Revise) کیا گیا۔ اور پاکستان کا جو رائج الوقت قانون ہے اس کو اسلام کے قریب لانے اور وہ نقائص دور کرنے جو اس کو اسلام سے ٹکراتے ہیں اس کی کوشش کی گئی ہے۔ ایڈوائزری کونسل نے چھ کوڈ کی والیمز (Volumes) کا پوری طرح اعادہ کیا، ان تمام چیزوں کا جو کہ شریعت کی طرف سے ضروری تھیں کہ ہمارے قانون میں داخل ہو جائیں۔

(س) علامہ صاحب سود کے بارے میں آپ نے بڑی حتمی رائے دی۔ بینکنگ کے

بارے آپ نے واضح رائے کیا دی تھی؟

(ج) جی کونسل کی رائے صرف میری رائے نہیں ہے بلکہ وہ مجموعی طور پر اسلامی مشاورتی کونسل کی رائے ہے کہ وہ سود کو قطعی طور پر حرام قرار دے۔ اس میں تمام سود آتے ہیں۔

(س) ایک دوسری بات کہ عام طور پر جن دنوں میں فیملی لاز آرڈیننس (۱۹۶۱ء میں امپلیمنٹ (Impliment) ہوا) یہ بن رہا تھا ان دنوں پریس میں بڑے اس پر اعتراضات ہو رہے تھے تو یہ میرا خیال ہے ان دنوں آپ کی سپرویزن (Supervision) میں یہ تیار ہوا۔ یہ فیملی لاز آرڈیننس حکومت کو پیش کیا گیا۔ تو آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

(ج) یہ فیملی لاز آرڈیننس میری سپرویزن میں تیار نہیں ہوا یہ مجھ سے پہلے تیار تھا اور اس کو کونسل میں Refer کیا گیا کہ لوگوں میں احتجاج پایا جاتا ہے کونسل اس پر نظر ثانی کر لے۔ چنانچہ کونسل نے اس قانون کو بڑا مفید قانون پایا اور اس کی ایک ایک جزو پر فکری بحث کر کے اس کو دوبارہ واضح صورت میں اس طرح پیش کر دیا کہ جہاں کہیں شریعت بتحرہ کے ساتھ کہیں کوئی تصادم پایا جاتا تھا اس کو ہم نے چھانٹ کر علیحدہ کر دیا۔ اور اس کی جگہ پر ایمنڈمنٹ (Amendment) ترمیم جسٹ (Suggest) کر دی۔ چنانچہ اس کے بعد ہم نے یہ اپنی ریکمنڈیشن (Recomendation) حکومت کو بھیج دی اس کے بعد کا علم نہیں۔

(س) علامہ صاحب! بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چار شادیوں پر پابندی لگانا جو ہے یہ خلاف اسلام اور خلاف قرآن ہے تو اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

(ج) خلاف اسلام اور خلاف قرآن کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کو جس کے متعلق لفظی طور پر قرآن حکیم میں ذکر ہو تو اس واسطے کوئی مسلمان قرآن کو ماننے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ چار عورتوں کی اجازت نہیں دی گئی۔ بات یہ ہے کہ یہ (Triply Restricted) Provision ہے۔ تین اس کے اوپر بڑی کڑی شرطیں لگائی گئی ہیں اور وہ شرطیں بڑی مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔ اگر ان شرطوں کو کسی صورت میں مجبوری کے طور پر سامنے رکھا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ کھلے طور پر اس کی اجازت نہیں کہ ہر وقت ایک آدمی اٹھے اور دو تین چار بیویاں کر لے۔ سورۃ النساء میں تیسری آیت میں قرآن حکیم نے تعدد از دواج کا ذکر کیا ہے

اور وہاں پر یہ کہا ہے کہ ”اگر تم دیکھو کہ تم یتیموں سے انصاف نہیں کر سکو گے یعنی اگر تم معاشرے میں انصاف نہیں کر سکتے تو پھر تمہیں اجازت ہے کہ تم ایک سے زیادہ بیویاں کرو۔ دو یا تین یا چار تک بھی تمہیں کرنے کی اجازت ہے۔ اگر معاشرے میں انصاف پیدا کرنا لازمی ہو، میں نے جرمن معاشرے میں ان لوگوں کو چیتے ہوئے دیکھا کہ وہ کہتے تھے کہ کاش کوئی ہمارے پریذیڈنٹ کو یہ سمجھا دے کہ یہاں پر تعدد ازدواج ہو جائے تو جوان لڑکیوں کی بے راہ روی ختم ہو جائے اور وہ گھر کی مالکہ بن کر رہ سکیں تو یہ سوسائٹی میں ایک پریشانی تھی جس کا علاج ان کی فطرت نے تو ڈھونڈا لیکن ان کے مذہب نے ان کو نہیں دیا۔ اسلام نے یہ کہا کہ اگر سماج میں بے انصافی ہو تو پھر تمہیں تعدد کی گنجائش ہے لیکن ”وَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تَقْسُطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكَحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ“ کہ اگر تم یتیموں اور بیوگان کے معاملے میں انتظام صحیح نہ کر سکو اور سوسائٹی میں بے راہ روی اور بے انصافی پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو تم دو، تین یا چار تک شادیاں کر سکتے ہو حسب مقدور اور حسب استعداد۔ فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة اور لیکن اگر تم نے ایک سے زیادہ شریعت کی حدود کے اندر شادی کی ہے اور تم یہ ڈرتے ہو کہ ان میں انصاف نہیں ہے تو دوسری جگہ پر بتا دیا کہ پھر پورا انصاف تمہیں کرنا ہوگا۔ تم اگر بڑی کوشش کرو تب بھی پورا ایگزیکٹ (Exact) انصاف تو نہیں ہو سکتا لیکن جتنا انسانی مقدور میں ہے وہ انصاف تمہیں کرنا ہوگا اور اگر تم انصاف نہیں کر سکتے ایک سے زیادہ بیویوں میں پھر فواحدة۔ صرف ایک ہی کافی ہے۔ اور اس لیے اسلام کا قانون واحدة میں ملا۔ اور اسلام کی اجازت جو ہے ثنی، ثلاثہ وربع میں ملی۔ لوگوں نے اس کھلے نظام کو اسلام کی شرائط کے ساتھ قبول نہیں کیا لیکن بعد میں جس وقت کھلا زمانہ آیا اور مسلمانوں کی مرفع الحالی نے ان کو بے کاری اور علت کی طرف متوجہ کر دیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان مسائل میں ڈھیل پیدا کرنی شروع کر دی۔ اب تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شریعت کی حدود کو پیش نظر رکھ کر دوسری بیوی نہیں کرتا اور اگر دوسری بیوی کسی نے کی ہوتی ہے شریعت کی حدود کو پیش نظر رکھ کر تو وہ شریعت کا بتایا ہوا انصاف نہیں کرتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلام نے جب یہ کہہ دیا ہے کہ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے ہو تو پھر فواحدة۔ صرف ایک عورت کافی ہے تو یہ واحدة کا

فیصلہ کون کر سکے گا یہ خاوند ہی خود فیصلہ کر سکتا ہے اور شادی سے پہلے فیصلہ کر سکتا ہے کہ میں دو رکھ سکتا ہوں یا نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ دیکھے کہ ایک بیوی سے آٹھ بچے ہیں اور میں دوسری بیوی کر رہا ہوں اور آخری عمر ہے اور میں چھوٹے چھوٹے یتیموں کے واسطے دنیا میں ان کو پریشانی کی حالت میں نہایت عسر کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کر کے جا رہا ہوں تو یہ سارے معاملات اس نے خود سوچنے ہیں۔ اس واسطے اسلام نے کھلے طور پر اجازت نہیں دی کہ ایک سے زیادہ بیویاں کی جائیں۔ لیکن بعض شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ ایک سے زیادہ ہو سکیں لیکن اگر ایک سے زیادہ ہوں تو پھر انصاف شرط اولیٰ ہے۔

(س) اسی سے ایک اور سوال میرے ذہن میں ابھر رہا ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان نے شراب اور جوئے یعنی ڈرننگ اور گیمبلنگ (Drinking and Gambling) کے بارے میں جو فیصلہ دیا تھا اس کی تفصیلات کیا تھیں؟

(ج) صاحب! ایڈوائزری کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی ایک ایڈوائزری کونسل تھی۔ اس کا کام صرف مشورہ دینا تھا۔ ہم نے مشوروں کے انبار لگا دیئے اور وہ حکومت کے سپرد کر دیئے اور وہ کہیں گل سڑ رہے ہوں گے، ہم نے ان تمام باتوں پر جو تحقیق کی کتاب و سنت کی رو سے وہ پیش کر دی۔ شراب کے متعلق اس کے قطعی حرام ہونے، جوئے کے قطعی حرام ہونے، سود کے قطعی حرام ہونے کے متعلق ہم نے واضح طور پر مشورے جو ہیں وہ حکومت کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے اور مشاورت ہی ہمارا حق تھا۔

(س) علامہ صاحب آپ سے ایک اور پہلو پر سوال کرنا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں آپ ہی کی وہ شخصیت ہے جس سے ملک کے تدریسی نظام میں اسلامی علوم رائج کرنے میں اولیت کا مقام حاصل رہا ہے اور آپ نے علوم اسلامیہ کے فروغ کے سلسلے میں بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کی تفصیل سے بھی آگاہ کر دیں۔

(ج) میرے اللہ تعالیٰ کا مجھ پر یہ احسان رہا ہے کہ اسلام اور دینیات اور اسلامیات کی تدریس کے جو نصاب تیار ہوئے اس ملک کے اندر پاکستان بننے کے بعد۔ شروع سے ہی میں اس سے متعلق رہا اور آخر تک، ایم۔ اے کے نصاب تک اس کی تدوین میں، میں شریک رہا

اور جتنی کمیٹیاں گورنمنٹ کی طرف سے بنائی جاتی رہیں ان میں مجھے شرکت کرنا ہوتی تھی اور اپنا مشورہ دینا ہوتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اللہ تعالیٰ کے احسان سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج اس معاملے میں کہ پہلی جماعت سے لے کر ایم۔ اے تک اسلامیات کی تدریس ہوتی ہے، غریب کا بھی کچھ حقیر سا حصہ موجود ہے۔ تمام نصاب جو ہیں وہ میرے تجویز کردہ اور میرے مشورے کے ساتھ بنائے گئے حتیٰ کہ پہلی جماعت سے لے کر پرائمری جماعتوں تک اور پھر میٹرکولیشن (Metriculation) تک اور پھر انٹر میڈیٹ اور بی۔ اے اور ایم۔ اے کے نصاب سارے جو ہیں یہ خود اس بورڈ کے کنوینر کی حیثیت سے میں خود تیار کراتا رہا۔

(س) علامہ صاحب! میری مراد یہ تھی کہ نصاب کی تشکیل کے علاوہ آپ نے کون سے ادارے اس ضمن میں چلائے، کن کی سربراہی آپ کے سپرد رہی اور اس طرح سے آپ نے، یعنی مجھے معلوم ہے آپ اسلامیہ کالج بھی رہے اس سے پہلے آپ جامعہ اسلامیہ میں بھی۔ ان کے علاوہ بھی آپ کچھ اداروں میں رہے، سربراہ کی حیثیت سے یا آرگنائزر کی حیثیت سے؟

(ج) بات یہ ہے کہ پہلے میں نے نصاب کی تجویز اور مشورے کے متعلق فکر (Figer)

کیا ہے اب عملی طور پر میری شرکت اس میں بحیثیت ایک استاد کے ہی ہوئی ہے۔ اس نظام میں میں نے اپنی معمولی زندگی جب شروع کی تو ٹیوشن پڑھانے کی ضرورت ہوئی اور اس وقت بھی ایک ایسا نظام قائم کیا کہ جس سے تدریسی سلسلے میں لوگوں کو سہولت ہو۔ چنانچہ دارالعلوم السنہ شریہ میرے رفیق محترم آقا بیدار بخت خان صاحب کے مشورے اور ان کے تعاون سے بنایا گیا۔ اس کا میں پرنسپل تھا۔ اور آقا صاحب مہتمم تھے اور اس کے اندر عربی، فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر میں نے جامعہ اسلامیہ میں بحیثیت مہتمم کے عربی، فارسی اور کتاب و سنت کی تدریس میں شرکت کی۔ اور اس کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں بحیثیت ناظم امور دیدیہ اور صدر شعبہ اسلامیات کے شامل ہو گیا اور وہاں پر اس شعبے کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبے کی تدوین سے پہلے میں نے قائم کیا۔ اور اس کے بعد پھر وہاں سے پنجاب یونیورسٹی کے اندر مجھے اس چیز کی دعوت دی گئی۔ چیف جسٹس عبدالرشید صاحب وائس چانسلر تھے انہوں نے دعوت دی کہ میں یونیورسٹی کے اندر ایک اسلامیات کا شعبہ قائم کروں اور اس کا انتظام کروں۔ چنانچہ

میں نے اس شعبے کو قائم بھی کر دیا اور اس کا پہلا صدر بھی بنا اور یہ صدارت جو ہے شعبے کی سربراہی میں نے ۲۰ سال تک مسلسل کی۔

(س) ۱۹۵۰ء میں یہ شعبہ قائم ہوا اور ۱۹۶۸ء تک آپ سربراہ رہے۔ اس کے بعد آپ وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

علامہ صاحب ایک اور پہلو ہے آپ کی زندگی کا جو ہمیں معلوم ہے اور بڑا ہی نمایاں ہے۔ اور وہ ہے تبلیغ اسلام کا پہلو۔ اس میں آپ نے جو نمایاں خدمت قوم کی سرانجام دی ہے اس پر کچھ روشنی ڈالیں؟

(ج) میں اپنا فرض ادا نہیں کروں گا اگر میں نے ذکر نہ کیا اپنی اس مادر درس گاہ کا جس میں میں نے بڑے مفید اثرات حاصل کئے اور وہ ہے فارمین کر سچین کالج۔ فارمین کر سچین کالج میں جس وقت میرے والد مغفور نے مجھے داخل کروایا تو پروفیسر بھٹی صاحب کے سپرد کیا کہ بچے کی اخلاقی نگرانی آپ کو کرنا ہوگی۔ وہ بڑے زبردست مسلمان پروفیسر تھے۔ تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس چیز کا وعدہ کیا کہ میں اس بچے کی صحیح تربیت کروں گا تو میرے والد صاحب نے مشن کالج میں مجھے داخل کرایا لیکن ان کی طبیعت میں یہ دغدغہ تھا کہ بچے کی تربیت کہیں بگڑ نہ جائے ایک غیر اسلامی ادارے میں۔ اس لیے انہوں نے مجھے مسجد کے ادارے مدرسہ قاسم العلوم میں بھی داخل کرادیا۔ تو میں بیک وقت اپنے تعلیمی نظام دو جگہ پر۔ ایک یونیورسٹی کی تعلیم اور ایک مسجد کی تعلیم جاری رکھ سکا۔ میرے استاد مولانا احمد علی صاحب لاہوری تھے۔ میرے والد صاحب نے مجھے ان کے سپرد دینی تعلیم کے لیے کیا۔ چنانچہ میں نے قرآن و سنت کی تعلیم حضرت مولانا سے حاصل کی ہے اور مجھے اس چیز کا شرف حاصل ہوا ہے کہ ان کے استاد یعنی میرے دادا استاد حضرت مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی چند دن کا فیض حاصل کیا۔

(س) علامہ صاحب آپ نے شاہ چراغ میں ورلڈ مشن آف اسلام قائم کیا اور ساتھ ہی شاہ چراغ میں بڑے طویل عرصے تک خدمت سرانجام دیتے رہے۔ خطابت بھی کرتے رہے، درس قرآن بھی۔ تو یہ سلسلہ کب شروع ہوا؟

(ج) بات یہ ہے کہ شیرانوالہ دروازے کی انجمن خدام الدین میں شریک ہونا اور مولوی

صاحب کی شاگردی میں شریک ہونے سے مجھے قرآن حکیم اور کتاب و سنت کی خدمت کی طرف اس قدر شوق بڑھتا گیا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی یہ کام شروع کروں چنانچہ جب مجھے قرآن حکیم اور حدیث اور حجۃ اللہ البالغہ، یہ استاد نے پڑھادیں تو انہوں نے مجھے اس چیز کی اجازت دی کہ میں قرآن حکیم کا درس دیا کروں۔ چنانچہ میں نے سول سیکرٹریٹ کی مسجد میں قرآن حکیم کا روزانہ درس شروع کیا۔ پھر اس کے بعد وہ درس کافی عرصہ تک چلتا رہا اور خواجہ عبدالرحیم مرحوم نے مجھے آمادہ کیا کہ وہ درس سول سیکرٹریٹ کی محدود مسجد کی بجائے شاہ چراغ مسجد میں شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ درس قرآن حکیم بطرز جدید شاہ چراغ مسجد میں ہو گیا۔ اس میں کالج کے طلبہ اور بالخصوص میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج اور مغلیہ پورہ انجینیئرنگ کالج کے طالب علم شریک ہوتے رہے اور ہر روز قرآن شریف کا درس ہوتا رہا یہ درس کا ایک دور میں نے مکمل کیا اور ایک دور کوئی پون کے قریب ہوا تو پھر وہ جاری نہ رہ سکا۔ قرآن حکیم کی خدمت کا شوق اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت سے عطا فرمایا اور استاد کی توجہ سے مجھے اس شوق نے اتنا آمادہ کر دیا کہ میں نے ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک باقاعدگی کے ساتھ مسجد کے ساتھ وابستگی رکھی اور اس میں روزانہ قرآن حکیم کا درس بھی دس یا بارہ سال مسلسل ہوتا رہا اور جمعہ کی تقریر ۳۶ سال کے قریب۔ جمعہ کی تقریر مجھے اس مسجد میں کرنی پڑی۔

(س) یہ مشن آف اسلام آپ نے قائم کیا یہ کب قائم کیا گیا؟

(ج) یہ اسی درس کی ایک صورت یہ تھی کہ جو لوگ درس قرآن حکیم میں شریک ہوئے قرآن حکیم ختم کر چکے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی کچھ کام کریں چنانچہ اس کام کے واسطے شاہ چراغ مسجد کے اندر ایک اسلامک سنٹر قائم کیا گیا اور وہ اسلامک سنٹر تمام ہماری اسلامک ایکٹیویٹیز (Activities) جو تھیں اس کا انتظام کرتا تھا۔ چنانچہ اس سنٹر کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ تبلیغ بیرون ملک کرنی چاہیے۔ چنانچہ ورلڈ مشن آف اسلام قائم کیا گیا اور ورلڈ مشن آف اسلام کے ماتحت ہم نے باہر کے ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کئے اور رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ایک انگریزی رسالہ The Light of Islam نکالا جو میرے وائس چانسلر ہونے کے وقت مجبوری سے بند کر دیا گیا تو Light of Islam انگریزی میں نکلتا

تھا اور اس میں مذہبی مضامین ہوتے تھے دنیا کے تمام براعظموں میں اور دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں اس رسالے کو بھیجا جاتا تھا۔ اکثر مفت بھی بھیجا جاتا تھا لیکن پیسے دے کر بھی خریدنے والے بھی اس کے بڑے کافی تھے۔ پھر اس کے بعد شوق تیز ہو گیا اور لوگوں کی طرف سے کچھ اس چیز میں دلنوازی بھی کی گئی تو میں اکثر سیرت پر تقریریں کرتا رہا اور سیرت کی تقریر میرا گویا کہ ایک قسم کا خاصہ ہو گیا۔ سب سے زیادہ تقریریں میں نے اپنی زندگی میں سیرت رسول اکرم ﷺ اور اسوہ حسینؑ پر کیں۔

(س) آپ تو مختلف زبانوں میں تقریریں کرتے رہے ہیں۔ اس بارے میں کچھ؟

(ج) جی، میں نے زندگی میں ۳۰، ۳۲ برس فارسی اور عربی پڑھائی ہے اور تقریر کے واسطے زیادہ انگریزی اور اردو کو استعمال کیا ہے۔ پنجابی چونکہ میری مادری زبان ہے لہذا جہاں ضرورت ہوتی وہاں پر پنجابی زبان میں بھی تقریر کر لیتا۔

(س) ایک سوال میرے ذہن میں آیا ہے کہ سب سے پہلی تقریر آپ نے کس عمر میں کی؟

(ج) تھرڈ ایئر میں تھا میں۔ یعنی کالج کے زمانے سے۔

(س) ریڈیو پر بھی آپ تقریریں خاصی کرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا؟

(ج) اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، میں ریڈیو سے بول رہا ہوں اور ریڈیو سے میرا تعلق بڑا کافی قدیم ہے۔ جب پاکستان بنا تو سب سے پہلے اسلامیات کی تقریر کا سلسلہ میں نے شروع کیا جو ہر روز ۱۰ منٹ جاری رہتا تھا اور اس میں، میں صرف اکیلا ہی سپیکر تھا جو ہر روز براڈ کاسٹ کیا کرتا تھا۔ اس چیز میں مجھے اولیت حاصل ہے کہ اس پر بڑے بڑے فاضلوں نے بعد میں تقریریں کی ہیں۔ پروفیسر محمد شفیع آتے رہے اور دوسرے علماء کرام آتے رہے۔ لیکن سب سے پہلے جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت میں ہی تقریر کرنے والا تھا اور ہر روز دس منٹ کے لیے آیا کرتا تھا تقریر کرنے کے واسطے۔

(س) عنوانات کیا تھے۔ کچھ یاد ہوگا آپ کو؟

(ج) محاسن اسلام تھا موضوع اور اسلام کے محاسن کے متعلق ایک عنوان لے لیا جاتا تھا اور اس پر تقریر کرتا۔

(س) یہ ۴۷ء کی بات ہوئی؟

(ج) یہ پاکستان میں براڈ کاسٹنگ شروع ہونے کے ساتھ ساتھ چلی۔ مجھے تبلیغ کا شوق شروع سے رہا ہے اور جب میں انٹر میڈیٹ میں پڑھا کرتا تھا تو اس وقت میں نے دو مدرسے کھول رکھے تھے عام عیسائیوں کے لیے اور وہ اثر تھا عیسائی انسٹی ٹیوشن میں تعلیم حاصل کرنے کا۔ جس طرح کہ وہ تبلیغی مساعی کرتے تھے مسیحی مذہب کے واسطے وہی شوق میرے اندر پیدا ہوا اور میں نے لاہور شہر کے اندر ایک رڈ اٹیلیہ میں اور ایک موچی دروازہ احاطہ حاجی قادر بخش میں دو مدرسے قائم کیے تاکہ عیسائیوں میں اسلام کی طرف رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میری زندگی زیادہ تر خدمت خلق میں گزری ہے۔ خلاصہ میری تمام کوششوں اور کاوشوں کا تبلیغ دین اور خدمت خلق رہا اور خدمت خلق کے واسطے میں نے مختلف جماعتوں میں کام کیا ہے۔ Servants of Mankind Society کا میں جنرل سیکرٹری تھا اس کے بعد مجلس اتحاد عمل کا جنرل سیکرٹری تھا اس کے بعد میں مسلم لیگ کے اندر، جب بہار میں فسادات ہوئے تھے اور مسلمانوں کو بڑے مظالم کا شکار ہونا پڑا تھا تو اس وقت جو مہاجر آئے ان کے واسطے مسلم لیگ کی جو بہار ریلیف کمیٹی بنائی گئی تھی اس کا میں جنرل سیکرٹری تھا اس کے بعد اس راستے سے مجھے تھوڑا بہت خدمت خلق کی سیاسی صورت کو انجام دینے کا موقع ملا۔ چنانچہ بہار ریلیف کمیٹی کے سیکرٹری کے عہدے کے بعد میرا انتخاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے ہوا۔

(س) آپ نے جو علمی اور تحقیقی کام کیا اور کچھ لوگوں کی ریسرچ گائیڈنس کی۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں کچھ بتائیے؟

(ج) میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ میری سب سے پہلی پبلک تقریر جو تھی وہ رسول اکرم ﷺ اور مغربی محققین کی تحقیقات سے شروع ہوتی ہے اور یہی میرا رجحان رہا ہے کہ مجھے تقابل ادیان کا شوق اپنے بچپن سے رہا ہے۔ میں بازار میں کھڑے ہو کر پہروں تلاش کرتا رہتا تھا کہ کسی مذہب سے متعلق کوئی کتاب ملے تو میں خرید لوں۔ جتنے محدود وسائل میرے تھے اس کے اعتبار سے میں نے وہ وہ کتابیں خریدی ہیں کہ بعد میں جب میں Comparative Religion کا

استاد ہوا تو مجھے ان کتابوں کی قیمت اس وقت محسوس ہوئی جو چند آنوں میں، میں خرید لیتا تھا۔ تو اس واسطے میری زندگی کا رجحان سرور دو عالم ﷺ اور آپ کے دین کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی خواہش تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں تقابل ادیان میں، میں نے حضرت ابراہیم کی سیرت کے متعلق کافی عرصہ کام کیا ہے۔ ابراہیم جدا انبیاء ہیں اور دنیا کے مذہبی سلسلوں میں سے تین تو یقینی طور پر ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام اور صائبین بھی اپنا سلسلہ ان سے جوڑتے ہیں اور ایک روایت کے اعتبار سے زرتشتی بھی اپنے آپ کو ان کے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر ڈاکٹر بھگوان داس نے جو ریسرچ کی ہے اس نے برہمن اور ابراہیم کے اندر تھوڑی سی مشابہت کی بنا پر کچھ نسبت نکالنے کی کوشش کی ہے۔ تو حضرت ابراہیم پر کام کیا۔

(س) مجھے یاد ہے کہ کانفرنس میں آپ نے ایک آرٹیکل پڑھا تھا:

Abraham the father of three religions

(ج) یہ درست ہے اور Abraham the father of three Religions

یہ آرٹیکل بھی چھپا اور دوسرے مقالات بھی شائع ہوئے۔ اس سلسلے میں مختلف آرٹیکلز لکھے گئے لیکن زیادہ طور پر میں نے تقابل ادیان میں چھ جو مشہور و معروف زندہ مذاہب ہیں یعنی ہندو مذہب ویدک دھرم، بدھ دھرم، جین مت، برہمن ازم، زرتشت کا دین، یہودیت، مسیحیت اور اسلام، ان پر میں نے باقاعدہ نوٹس جمع کیے۔ ایک پہلے چھوٹی کتاب تیار کی ”مذاہب عالم“ پھر اس کو وسیع تر صورت میں مرتب کیا جواب میرے پاس مسودے کی حیثیت سے موجود ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کام کو شائع کر سکوں۔ باقی مجھے زیادہ طور پر اپنے شعبے کے صدر کی حیثیت سے ریسرچ گائیڈنس کا اتفاق ہوا اور ریسرچ گائیڈنس میں اس وقت تک کم و بیش ۱۰ کے قریب پی ایچ ڈی مقالات میں نے گائیڈ کیے۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہو گئے ہیں کچھ ابھی لکھے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے علاوہ سو ڈیڑھ سو کے قریب ایم۔ اے کے درجے کے تھیسز ہیں جن کو میں نے گائیڈ کرایا اور یہ تمام کے تمام اسلام کے محاسن اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے۔

(س) علامہ صاحب! مذاہب کے بارے آپ نے جو تحقیق کی ہے اس کا بنیادی نقطہ کیا ہے؟

کیا اس کا مقصد کوئی مذاہب میں مفاہمت پیدا کرنا ہے تاکہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے؟

(ج) جی میں عرض کر دوں مذاہب میں مفاہمت پیدا کرنے سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو سکتی

ہے۔ برہموسماج قسم کی چیز بن جاتی ہے۔ میں نے تقابل ادیان پر جو لیکچر دیئے ہیں اس میں

وضاحت کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ اسلام صرف ایک سچا مذہب ہی نہیں ہے بلکہ دنیا

کا ایک ہی سچا مذہب ہے تو اس واسطے صداقت اسلام سے نہیں بلکہ فوقیت اسلام سے شروع

کرتا ہوں اور فوقیت اسلام تک ہی پہنچتا ہوں اور میں نے ان تمام مذاہب کے ساتھ انصاف کیا

ہے۔ ان کی خوبیوں کو دیکھا ہے اور کیونکہ میں یہ مانتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ولقد بعثنا

فی کل امة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت (نحل۔ ۳۶) کہہ کر یہ ہمیں

بتایا کہ تمام فرقوں کے اندر ہادی ہوتے رہے، ہر قوم کے اندر ہادی ہوا۔ ہر امت کے اندر

رسول ہوا اور وہ تمام اپنے اپنے وقت میں اپنے وقت کی جو ضروریات تھیں ان کے مطابق

آداب و اخلاق لے کر آئے۔ لیکن سرور دو عالم ﷺ سید المرسلین ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں، خاتم

النبین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ نے وضاحت کے ساتھ اس چیز کو بیان

کر دیا کہ میں خاتم النبین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ سو اس واسطے میرا تقابل ادیان

کے اندر تحقیق کا ہمیشہ یہی رخ رہا ہے کہ صداقت ادیان کو تسلیم کرنا، جہاں جہاں صداقت پائی

جاتی ہو لیکن اسلام کی فوقیت کو بھی ساتھ ہی بیان کر دینا کیونکہ اسلام ایک فائق مذہب ہے۔

کامل مذہب ہے۔ محفوظ مذہب ہے اور عالمگیر مذہب ہے۔ اس واسطے تقابل ادیان کے اندر

میری زندگی کا خلاصہ یہی ہے کہ اسلام ایک کامل، محفوظ اور عالمگیر مذہب ہے۔

(س) تحقیقی کام کے سلسلے میں آپ کی لاہریری تو خاصی بڑی ہوگی۔ آپ کے خیال میں

اس میں کتنی کتابیں ہوں گی اور کس کس موضوع پر آپ نے اس میں خاص طور پر کتابیں جمع کیں؟

(ج) آپ نے ایک بڑی دھستی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ کتابوں کے معاملے میں

مجھے بڑے صدمے سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ گزشتہ پانچ چھ برس سے میں اپنی کتابوں کو نہ دیکھ سکا

ہوں نہ اریج کر سکا ہوں نہ ان سے پوری طرح استفادہ کر سکا ہوں۔ یہ میری وائس چانسٹری کا

زمانہ تھا کہ اس کے اندر سوائے ایڈوائزری کونسل کے سلسلے میں جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا ورنہ کتاب دیکھنے کی فرصت و انس چانسری کے زمانہ میں بہت کم نکلی۔ تو وہ کتابیں اب ساری ایک گڑبڑ صورت میں موجود ہیں۔ میرے پاس تقریباً پانچ چھ ہزار کتابیں ہیں۔

(س) علامہ صاحب میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا ہے کہ آج کا نو جوان اگر اسلام کو سمجھنا چاہے تو اس کے پاس وقت کم ہے۔ وہ تھوڑے سے تھوڑے وقت میں اسلام کا بالکل براہ راست مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو آپ اسے کون کون سی کتابیں تجویز کریں گے؟

(ج) دیکھئے آج کل کا نو جوان ایک بڑی قیمتی جنس ہے جس کو ہم ابھی تک پوری طرح سمجھنے نہیں پائے اس ملک کے اندر۔ اور ملک کے باہر بھی نہیں سمجھنے پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جس طرح فرمایا کہ ایک انسان میں دو چیزیں ہیں جن پر رشک کیا جاسکتا ہے ایک صحت اور ایک فراغت ہے اور نو جوان کو اللہ تعالیٰ نے دونوں دیئے ہوئے ہیں۔ اس میں اکتساب فضل کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ نو جوان کو کسی چیز کی افادیت کا یقین دلا دیا جائے تو وہ اس کے حاصل کرنے کے واسطے جان پر کھیلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس واسطے اگر صحیح صورت میں نو جوانوں کے سامنے صحیح علوم کو پیش کیا جائے تو میرے خیال میں نہ صرف ان کی نظریں روشن ہو جائیں گی بلکہ دنیا کی روشنی کا سامان ہمارے نو جوان کر لیں گے۔ اس سلسلے میں میرے نزدیک اسلام کی طرف سے تو کتاب و سنت دو چیزیں خلاصہ ہیں سارے علم کا یعنی قرآن حکیم کا مطالعہ اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت اطہر اور ان کی سنت کا مطالعہ اگر اس کا کوئی دلفریب اور نہایت ہی ماڈرن لائنز پر طریق اختیار کیا جائے اور نو جوانوں کے سامنے رسول اکرم ﷺ کی زندگی اور آپ کے اقوال و افعال اس طرح پیش کیے جائیں جس طرح بڑے لوگوں کے افعال آج کل دنیا کتابیں لکھ لکھ کر پیش کر رہی ہے اور ان لوگوں کی بڑائی بیان کی جا رہی ہے۔ تو محمد کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے اس کارخانہ قدرت میں شاہکار قدرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اگر ان کی سیرت اور ان کے اخلاق نو جوانوں کے سامنے پیش کیے جائیں اور نو جوان ان کو لے کر اٹھیں تو ان سے ہر طرح کی

انقلابی تحریکیں اور ہر طرح کی تعمیری تحریکوں کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

(س) علامہ صاحب آپ کی زندگی کا میرے نزدیک ایک نہایت دلچسپ پہلو ہے بڑا معلوماتی بھی ہے یعنی آپ سے ہمیں پتہ چلتا رہتا تھا کہ آپ یورپ کے سفر سے واپس آئے ہیں کبھی جرمنی کے سفر سے واپس آئے ہیں اور فار ایسٹ میں بھی گئے۔ بہت سے کانفرنسیں آپ نے Attend کیں اور بڑے ہی تعلیمی سفر کئے۔ وہ آپ بتایا کرتے ہیں کہ مڈل ایسٹ میں آپ نے تقریر بھی کی تو آپ ہمیں اپنے تعلیمی سفر، کانفرنسوں کا حال تفصیل سے بتائیے۔

(ج) مجھے صفی مرزا پوری کا شعر یاد دلا دیا ہے آپ نے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

آپ نے ایک نہایت ہی دلچسپ بات شروع کر دی ہے اب ذرا فرصت سے سنئے گا۔ مجھے دنیا میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے سیاحت کے بڑے مواقع عطا کیے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میرے ہاں قدرت کی ودیعت سے صبر کے مواقع کم اور شکر کے مواقع زیادہ رہے ہیں۔ میں نے دنیا میں کئی سفر کیے ہیں سب سے پہلا سفر والدین کی ہمراہی میں بچپن میں بغداد شریف کا تھا۔ مجھے ۴۴ سال کے بعد جس وقت بغداد میں دوبارہ جانے کا موقع ملا تو مجھے اپنی وہ چار سال کی عمر کی بغداد کی یاد جو تھی اس کی تھوڑی سی تفصیلات ذہن میں تھیں۔ میں پہلے بتاتا تھا کہ اس طرح وہاں پر پہلا مقام ہے، اس طرح کی عمارت ہے، ادھر سے جائیں گے تو فلاں مقام آئے گا وغیرہ۔ یعنی سیاحت شروع میں گھٹی میں ہی ڈال دی گئی لیکن اصل میں صحیح طور پر جب میں ۱۹۵۰ء میں سربراہ شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ہوا تو اس کے تیسرے سال ۱۹۵۳ء میں مجھے مڈل ایسٹ (مشرق وسطیٰ) اور یورپ اور UK کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں یہ سفر کیا اور ۱۹۵۶ء میں امریکہ میں ایک سال کے قریب سیاحت کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد مجھے ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں انڈونیشیا دو دفعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اور ایک دفعہ ملائیشیا جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے دو سفر جو تھے وہ تو سٹڈی ٹور کی حیثیت سے میرے مطالعے کی چیزیں تھیں لیکن اس میں بھی مجھے اللہ تعالیٰ نے موقع دیا کہ یورپ، امریکہ میں بھی تقریریں کرتا رہا اور

اسلام کے محاسن کے متعلق جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی فرصت دی وہاں پر میں لوگوں کے ساتھ ڈسکس بھی کرتا رہا اور تقریریں بھی کرتا رہا۔ لیکن یہ جو ساؤتھ ایشیا یعنی انڈونیشیا کے دو سفر ہیں اور ملائیشیا کا سفر ہے یہ ایفرو ایشین اسلامک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں تھا۔ ایک دفعہ بندنوم میں ایک دفعہ جکارتنہ میں کانفرنس ہوئی ایک دفعہ ملائیشیا میں کانفرنس ہوئی۔ ملائیشیا تو میں وفد کے سربراہ کی حیثیت سے گیا۔ اور انڈونیشیا پر و فیسر حمید احمد خاں صاحب کے رفیق کی حیثیت سے ان کے وفد میں گیا تھا۔

(س) میرا خیال ہے کہ یہی کانفرنس اسلامک سمٹ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی؟

(ج) جی، یہ وہی کانفرنس ہے جو اسلامک سمٹ کے مسئلے کو اپنی ابتدائی صورتوں میں سوچتی رہی اور اس کا کمال پاکستان کو حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری حکومت کو سربراہان سلطنت اسلامیہ کو جمع کرنے کا موقع دیا اور دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ یہ موقع حاصل ہوا کہ دنیا کے مسلمان اپنے سارے رنج و غم بھول کر اور آپس کے جھگڑے ختم کر کے اکٹھے بیٹھے۔ سفر کے تعلق میں ویسٹ جرمنی دو دفعہ آتا ہے اور بھی کچھ شہر اور ملک ایسے ہیں جو دو دفعہ آتے ہیں لیکن ویسٹ جرمنی ایک تو ۱۹۵۳ء میں، میں گیا تھا اس وقت تو سٹڈی ٹور تھا اور اس وقت یونیورسٹیز اور لائبریریز دیکھیں اور وہاں پر بعض اساتذہ سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن ۱۹۶۸ء کے بعد غالباً ۱۹۶۹ء میں مجھے دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا اس وقت ویسٹ جرمنی کی حکومت نے یہ انتظام کیا تھا کہ دنیا کی بیس (۲۰) مغربی شخصیات کو انہوں نے دعوت دی تھی کہ وہ جرمنی میں آ کر پروٹسٹنٹ اینڈ کیتھولک کے درمیان ڈائیلاگ کا مطالعہ کریں اور جرمنی کے دینی حالات سے واقف ہوں تو اس سلسلے میں مجھے بلایا گیا تھا اور وہ دورہ بڑا کافی مفید رہا۔ ایک تو میں ان سے جو باتیں کرتا تھا اکثر وہ نئی ہوتی تھیں۔ مجھے وہ پرانی تکلیف یاد آتی تھی کہ کاش ہم نے اس سے پہلے یہ باتیں ان کو پہنچائی ہوتیں۔ لیکن ان سے بھی بڑی مفید باتیں اور بالخصوص جو کوشش آج کل کیتھولک اور پروٹسٹنٹس کو جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے بائبل ہو خواہ نکاح ہو یا ایک چرچ میں دونوں کے نماز پڑھنے کا مسئلہ ہو۔ یہ ایسے سبق تھے کہ میں ساتھ لے کر آیا تھا۔ امریکہ سے

بھی Diversity کے باوجود (Unity) کا سبق لے کر آیا تھا۔ میں نے اس کے بعد اپنی تبلیغ میں ان لوگوں کو یہ بتایا کہ دنیا آج کل جڑنے اور اکٹھے ہونے کی طرف مائل ہے اور تعمیر کی طرف مائل ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارا کارکن فاصلے دور دور کے تیار کر رہا ہے:

تو برائے وصل کردن آدمی

میں برائے فصل کردن آدمی

مولانا روم نے یہ فرمایا تھا، ہم وصل کرنے کے لیے آئے تھے لیکن ہم دنیا میں نفاق پیدا کرنے کے واسطے اپنے آپ کو استعمال کر رہے ہیں۔ کاش کہ ہمیں ان ملکوں کے نئے تجربے جنہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اسی انداز پر ہمیں اپنے دین کے لیے کام کرنے کی توفیق ہو۔

(س) علامہ صاحب! جرمنی کے بارے کوئی دلچسپ بات آپ نے دیکھی ہو یا ان دوروں کے درمیان کوئی قابل ذکر بات ہو تو وہ بھی بتائیے۔

(ج) جرمنی میں دوسری دفعہ گیا تھا اور یہ سفر ایک زائر کی حیثیت سے تھا اس واسطے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کا اس ملک سے جو تعلق تھا، ان کے آثار جو وہاں پائے جاتے تھے اور ایک سڑک جو انہوں نے اقبالؒ کے نام پر منسوب کر دی ہے یہ ساری دیکھنے کا میرا جی چاہتا تھا۔ وہ دریا جس کے کنارے بیٹھ کر وہ اپنے تدبر اور تفکر کے اوقات گزارا کرتے تھے وہ میں نے دیکھے۔ جرمن قوم کو میں نے بڑا فعال پایا۔ قوموں میں اور بھی فعال قومیں ہیں لیکن جرمن قوم کو سب سے زیادہ فعال دیکھا۔ پہلے میں نے لڑائی کے فوراً بعد دیکھا تھا۔ اب دوسری بار کافی وقفہ ہو چکا تھا۔ اور اس وقفے میں، میں نے دیکھا کہ جو برباد شدہ شہر تھے ان کو انہوں نے دوبارہ اس طرح ٹھیک کر لیا ہوا تھا کہ کبھی برباد ہوئے ہی نہیں۔ سفر کے سلسلے میں ایک بات اگر آپ اجازت دیں تو آپ کو سناؤں کہ میں امریکہ میں یونائٹڈ میں تھا تو ایک ایسی کمیونٹی کے ساتھ واسطہ پڑا جن کو پہلے میں جانتا نہیں تھا وہ عیسائیوں کا وہ فرقہ ہے جسے مورمن کہا جاتا ہے۔ مورمن لوگ بڑی حد تک ان کی شریعت جو ہے وہ اسلامی شریعت کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ ان میں تعدد ازدواج بھی پایا جاتا ہے اور ان کے اندر شراب حرام ہے، ان کے اندر زنا حرام ہے۔ یہ ڈیننگ وغیرہ جو مغربی زندگی میں عام ہے وہ اس کے حق میں نہیں، ان میں بھی غمہ محرم کے ساتھ کبھی اکیلا نہیں رہتا۔ ان لوگوں میں

رہا تو میں نے ان کی زندگی کو دلچسپ پایا۔ ان لوگوں نے بھی مجھے کتابیں دیں اور مجھے اپنے معاملات کے بارے میں سمجھاتے رہے۔ ان کی دو مقدس کتابیں ہیں ایک ”بک آف مارنر“ اور ایک ”بک آف ابراہم“ ”Book of Abraham“ وہ ابراہیم کے صحیفہ کو کہتے ہیں اور ”Book of Mormens“ جوزف سمتھ کا صحیفہ ہے۔ انہوں نے میری گفتگو اور میرا شوق مطالعے کا دیکھ کر مجھے دعوت دی کہ ہمارا ایک مقرر، خطیب، خطیب مسیحیت آیا ہوا ہے اور وہ کانفرنس کو ایڈریس کرے گا۔ ہم چاہتے ہیں آپ بھی وہاں پر کچھ تھوڑا سا وقت دیں۔ میں مان گیا اور مجھے انہوں نے ۴۵ منٹ دیئے۔ چنانچہ میں کانفرنس میں جس دن شریک ہوا تو میں نے پہلے کھڑے ہو کر قرآن حکیم کی تلاوت کی۔ وہ قوم اتنی منظم اور اتنی ڈسپلنڈ قوم ہے کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ کوئی دوسری زبان بول رہا ہے تو ایک دم سارے کا سارا مارمن مجمع کھڑا ہو گیا پھر اس کے بعد جب میں نے وہ ختم کیا تو وہ بیٹھ گئے ایک تو ان کے ڈسپلن کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اب میں نے جو کچھ ان کے سامنے پڑھا تھا وہ میں چاہتا تھا کہ ان کو پہنچا دوں۔ تو میں نے ان کو کہا کہ میں نے جو زبان آپ کے سامنے پڑھی ہے یہ ابراہیم جس کی Book of Abraham جو آپ کے مطالعے میں شامل ہے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی زبان ہے۔ اور اس اولاد کی زبان جس کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ تو، تیرے افراد جو ہیں وہ آسمان کے تاروں اور ریت کے ذروں سے زیادہ ہوں گے اور یہ دعا جو میں نے پڑھی ہے یہ حضرت موسیٰ کی دعا ہے اور مجھے جس نے یہ بتایا ہے وہ پیغمبر آخرا الزماں ہیں۔ جس کے متعلق عیسیٰ نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ مبشرًا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (الصف: ۶) بشارت دی ایسے رسول کی جو آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا۔ تو میں نے جس وقت یہ چار چیزیں جمع کیں۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ کا تذکرہ اور حضرت عیسیٰ کا تذکرہ۔ یہاں تک تو وہ واقف تھے لیکن جب میں نے محمد کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان کا ذکر کیا اور آپ کا تذکرہ کیا تو وہ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ میں بھول گیا کہ میرے ۴۵ منٹ ختم ہو گئے ہیں۔ ان کے شوق نے مجھے بولتے رہنے پر آمادہ کیا اور میں بولتا رہا۔ تو جب میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو میں نے کہا میں نے وقت زیادہ لے لیا ہے تو وہ ان کا جو سپیکر تھا، خطیب مسیحیت اس نے آ کر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ پرو فیسر We

لیے سنایا ہے کہ اسلام کا نام ہر جگہ پہنچ سکتا ہے لیکن پہنچانے والے ہونے چاہئیں۔ کاش کہ یہ ملت کہ جس کا یہ اصلی کام ہے اسلام کے پیغام کو پہنچانا شروع کر دے۔

(س) ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر ہو رہا تھا کہ علامہ صاحب آپ نے ایک سماجی کارکن اور رہنما کی حیثیت سے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے اس سے بڑھ کر آپ نے پھر تحریک پاکستان میں حصہ لیا تو اس سلسلے کی تفصیلات اگر آپ بیان کریں تو یہ بڑا مفید ہوگا۔

(ج) میں نے عرض کیا کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور اس واسطے سیاست میں کوئی اتھارٹی نہیں رکھتا ہاں مجھے تجربہ سیاست کا چلتے چلتے ہو گیا اس طرح کہ ایک خدمت خلق کے کارندے کی حیثیت سے بہار ریلیف کمیٹی میں سیکرٹری کی حیثیت سے ان مہاجروں کے لیے جو لٹے پٹے ہوئے آتے تھے ان کی خدمت کی اور وہ خدمت میرے احباب کو مقبول دکھائی دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے مسلم لیگ کے انتخابات سالانہ، پراونشل مسلم لیگ کے انتخابات ہوئے تو مجھے جنرل سیکرٹری اور میاں افتخار الدین مرحوم کو صدر پراونشل مسلم لیگ چنا گیا۔ اب مسلم لیگ کے ساتھ میرا ربط سیکرٹری شپ سے نہیں شروع ہوتا بلکہ خدمت خلق کے سلسلے میں، میں محلے کے اندر اور باہر کی جو چھوٹی مسلم لیگیں تھیں ان میں جایا کرتا، تقریریں کیا کرتا تھا اور لوگوں کو سمجھاتا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ چنانچہ وہ میرا ایک تبلیغی دورہ بھی ہوتا تھا اور میری سیاسی تیاری بھی ہوتی تھی حتیٰ کہ اللہ نے مجھے لا الہ الا اللہ والے مبارک ملک کے اندر رہنے کا مبارک موقع عطا فرمایا۔

(س) علامہ صاحب ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس دور میں کن کن سیاسی شخصیتوں، سیاسی مفکروں اور رہنماؤں سے آپ کی ملاقات رہی ہے اگر کچھ یاد ہوں تو بیان فرمائیں۔ اور اگر مجھے اجازت دیں تو اس سوال کو اور واضح کروں اور وہ یہ کہ تحریک پاکستان اور تعمیر پاکستان میں جن جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں سے بعض حضرات کے ساتھ آپ کو ملنے کا موقع ضرور ملا ہوگا تو ان میں سے چند یا دس چند باتیں ہمیں بتائیں۔

(ج) اصل میں ایسا موقع استعمال ہوتا ہے اپنی عظمت کے بیان کرنے کے واسطے کہ میں

نے فلاں شخص کو دیکھا ہے اور فلاں شخص سے یہ گفتگو کی ہے۔ میں ان لوگوں کی عظمت کو پیش نظر رکھ کے اس نسبت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع دیا کہ میں سیاست کے میدان میں جو ہمارے چوٹی کے لیڈر تھے یعنی قائد اعظمؒ کی صدارت میں اجلاس میں شرکت کی، میں نے لیاقت علی خان قائد ملت کے ساتھ میٹنگز اٹینڈ کی ہیں، چوہدری خلیق الزماں اور سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے ان تمام بزرگوں کے ساتھ لیگ کی سنٹرل ایگزیکٹو کے ممبر کی حیثیت سے میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ مجھے ان سے استفادہ کرنے کا موقع اجلاسوں میں بھی ہوتا تھا، باہر بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے مسلم لیگ کی طرف لے جانے والے بعض دوستوں کا ذکر میں ضروری کرنا چاہتا ہوں، حمید نظامی مرحوم، راجہ حسن اختر مرحوم اور خواجہ عبدالرحیم مرحوم، یہ تین وہ دوست تھے جنہوں نے مجھے لیگ کے واسطے پراپیگنڈہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ پھر لیگ نے مجھے ناظم ربط و ضبط کو آرڈینیشن سیکرٹری مقرر کر لیا اور اس سلسلے میں، میں نے پنجاب میں ایک مہینے کے اندر کوئی تقریباً کم و بیش ۸۰ کے قریب تقریریں کیں۔ دن میں تین تین تقریریں کرتا تھا۔ موٹر پر بیٹھا ہوا ایک جگہ تقریر کرتا تھا، تقریر کے بعد دوسرے شہر جلد جانا ہوتا اور پھر تقریر کرتا تھا۔ چنانچہ پاکستان کے پراپیگنڈہ کے واسطے ایک مہینے کے اندر ۸۰، ۹۰ تقریریں کرنے کا ریکارڈ غالباً اس احقر کو ہی ہے۔ لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک جوش دیا ہوا تھا اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ، یہ آنکھوں کے سامنے ایک نظارہ پیدا کر دیتا تھا جس کے واسطے دیوانہ وار ہر مشکل جو تھی وہ آسان ہو جاتی تھی۔

(س) علامہ صاحب پاکستان کے بارے میں نوجوانوں کا عام تاثر کیا تھا، پاکستان کو کس شکل میں وہ دیکھنا چاہتے تھے اور کیا تصور تھا ان کا؟

(ج) عوام کا تصور یہ تھا کہ پاکستان قرن اول کی طرح کا ایک ملک ہوگا جس طرح کہ پہلے زمانے میں خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام دنیا میں حاوی اور غالب تھا اسی طرح اسلام پاکستان میں حاوی اور غالب ہوگا۔ نوجوان میں ہندوستان میں آزاد ہونے کا جذبہ جو تھا وہ اس کے ساتھ مستزاد تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:

خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زباغ

تو اس صحبت زاغ نے یعنی ہندو کی رفاقت نے جو مسلمان کے کلچر اور ثقافت اور دینی روایات کو ضعف پہنچایا تھا ان سے آزاد ہونے کی ایک سکیم کے طور پر پاکستان گویا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی حیثیت رکھتا تھا کہ ان کو اپنا تشخص حاصل ہو جائے۔ انہیں اپنی آزاد، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا موقع نصیب ہو جائے۔

حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ پاکستان تو اس دن بن گیا تھا جس دن کہ محمد بن قاسم نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جس دن پہلا مسلمان اس سرزمین میں آیا اس نے ایک بالکل ہی آزاد اور مفید معاشرہ پیش کیا جس کو اسلام کہا جاتا ہے۔ اور وہ اس سے بالکل علیحدہ تھا اور اس سے متضاد تھا جو معاشرہ کہ ہندو دھرم کے ماتحت یہاں پر پایا جاتا۔ چنانچہ نو جوانوں میں یہ جذبہ بھی کہ ہندو جو انگریز سے آزاد ہو کر ہم پر حاکم ہونا چاہتا ہے اس سے ہمیں نجات حاصل ہو جائے گی اور اسلام جو کہ ہمارا دین و ایمان ہے اس پر عمل کرنے کی توفیق حاصل ہو جائے گی۔ اس واسطے نو جوان دو جذبوں سے اور جہلاء اور عوام ایک جذبے سے کہ اسلام دنیا میں آئے گا سرشار ہو کر اس کے لیے کام کرتے تھے۔

(س) علامہ صاحب ایک ضمنی سوال یہ ہے کہ قائد اعظم علیہ الرحمۃ سے ملاقات جو آپ کی ہوئی، جو پہلی ملاقات تھی اس سے پہلے آپ کے قائد اعظم کے بارے میں کیا تاثرات تھے اور ملاقات کے بعد تاثرات کیا ہوئے؟

(ج) بھی قائد اعظم سے کوئی ایسی ملاقات ہوئی ہو کہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوں اور ان سے باتیں کرتا رہا ہوں یہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔ قائد اعظم کو بحیثیت لیڈر کے یا جلسوں میں دیکھایا میٹنگز (Meetings) میں دیکھا اور مجھے یہ یاد ہے کہ اس منحنی جسم والے ضعیف انسان کو میں نے اتنا باجبروت پایا کہ ملک کا ایک بہت بڑا مسلمان لیڈر تھا جس کو انہوں نے ترکی (Turkey) میں بھیجا ہوا تھا تو اس نے آپ کو جو رپورٹ دی تو وہ رپورٹ اس سے کچھ مختلف تھی جو قائد اعظم چاہتے تھے تو قائد اعظم نے ان کو کھڑے کھڑے جب (Irrelevant) پایا تو آواز دی (Sit down) تو سٹ ڈاؤن کے ساتھ میں نے دیکھا کہ وہ بھاری بھر کم لیڈر اس طرح کرسی میں گرا جس طرح کہ بجلی گر جاتی ہے تو یہ تو ان کی جبروت اور ان کی ہیبت کا عالم

تھا۔ ہاتھ ملائے جائیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی نازک ترین چیز کو ہاتھ لگا رہے ہیں۔ آپ کوئی تبرک ہے جسے چھو رہے ہیں اور آواز کا کڑکا ایسا تھا کہ جیسے کوئی بجلی کڑک رہی ہے اور جس وقت تقریر کے اندر جوش آتا اور بالخصوص جس وقت وہ ملت کا لفظ بیان کیا کرتے تھے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور انسان کچھ اور ہی محسوس کرنے لگتا تھا کہ میں یہاں سے کسی اور کیفیت میں پہنچ گیا ہوں۔

(س) اچھا قائد ملت لیاقت علی خان سے جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے کسی ملاقات کی کوئی تفصیل یاد ہو یا کوئی دلچسپ قسم کی کوئی بات یا ان کی شخصیت کے بارے آپ نے کوئی تاثر لیا ہو؟

(ج) اصل میں ایگزیکٹو کمیٹی میں، میں ان کے ساتھ شریک تھا اور چوہدری خلیق الزمان اس وقت صدر تھے۔ باتیں تو زیادہ سیاسی ہیں گہری باتیں ہیں لیکن اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ اتنا دھیمہ اور اتنا دھیرے دھیرے چلنے والا سیاست دان میں نے دوسرا نہیں دیکھا۔ سگریٹ لگالتے تھے اور سگریٹ سے سگریٹ لگتا چلا جاتا تھا اور جب تک کسی بولنے والے کی پوری بات نہیں سن لیتے تھے اس وقت تک اپنی بات نہیں شروع کرتے تھے۔ اتنا تحمل اور برداشت میں نے کسی اور لیڈر میں تو نہیں دیکھا یہ ان میں دیکھا اور بات سوچ کے، چچی تلی ہوئی اس طرح کرتے تھے جس طرح سونا تولی جا رہا ہو اور اس کا بالکل حساب کتاب ذرے ذرے کا دینا ہے۔ میں نے ان کو تحمل، برداشت اور نگہداشت کے ساتھ چلنے والا لیڈر پایا۔

(س) اچھا علامہ صاحب مفکر پاکستان حکیم الامت علامہ اقبالؒ سے بھی ملاقات کا آپ کو شرف حاصل ہوا ہو؟

(ج) صاحب! یہ میری بد قسمتی ہے کہ ان سے علیحدہ ملاقات مجھے نصیب ایک دفعہ ہوئی جب کہ میں اپنے تاپا زاد بھائی کے ساتھ ان کے پاس ایک سٹوفکیٹ لکھانے کے واسطے گیا تھا۔

(س) کتنی عمر ہوگی؟

(ج) یہ میرے B.A پاس کرنے کے بعد مجھے سٹوفکیٹ کی ضرورت تھی، نوکری کی خواہش تھی تو تایا جان کے ساتھ ان کے تعلقات تھے اور وہ مجھے وہاں پر لے گئے۔ مجھے اچھی طرح

سے یاد ہے کہ میں نے جرأت کر کے کیونکہ میں فارسی کا سٹوڈنٹ تھا اس واسطے ان کی اس نظم کی طرف ”انقلاب اے انقلاب“ اس نظم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے میں نے کہا جی کہ آپ نے ”یا چناں کن یا چنی“ دنیا کو ہلا دینے والے سلاؤنرز (Slogans) دیئے ہیں کیا کبھی کوئی ایسا انقلاب آئے گا بھی، تو انہوں نے کہا کہ انقلاب لانے کی اہلیت صرف ایک قوم میں ہے اور وہ مسلمان قوم ہے اور جب یہ بھوکا مرے گا تو انقلاب لائے گا۔ مجھے آج تک ان کا یہ فقرہ یاد ہے جو غالباً کسی دوسری جگہ کوٹ (Coat) نہیں کیا گیا ہوگا۔

(س) حکیم الامت نے جو سٹیفکیٹ آپ کو دیا تھا وہ آپ کے پاس محفوظ ہوگا؟
(ج) جی۔ میرے پاس سارے سٹیفکیٹ محفوظ ہونے چاہئے تھے لیکن ایک بھی محفوظ نہیں ہے۔

(س) علامہ صاحب اب آپ سے کچھ ذاتی سوالات پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک سوال تو یہ ہے کہ آپ کا آبائی اندان کون سا ہے؟ اور آپ نے ابتدائی زندگی کا آغاز کیسے کیا؟

(ج) (یعنی برے کے گھر تک پہنچ گئے ہیں آپ) ان کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک درمیانے درجے کے متوسلہ گھرانے کا فرد ہوں اور میرے خاندان کے متعلق کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صدیق اکبرؑ کی اولاد سے ہیں۔ میرے برہمنوں کا بپا پیشہ ہندوستان کے اندر شہزادگان کے اتالیق ہونا رہا ہے اور اس سے پہلے روحانی طور پر شریعت اور طریقت کی خدمت رہی ہے۔ قرآن دور میں میرے آباء جو تھے وہ تجارت اور سوداگری کی طرف مائل تھے چنانچہ قرآن کریم کی خدمت کا جذبہ مارے خاندان کی روایت میں چلا آتا ہے۔ میرے بڑے دادا حضرت محمد بخش صاحب کو کابل کی طرف سے یہ خطاب ملا ہوا تھا ”ملک الصحاف“ کا۔ اور ان کے ہاں قرآن شریف لکھے جاتے تھے اور قرآن شریف کی جلدیں بنتی تھیں اور کاپی سے لے کر کابل تک قرآن شریف قلمی طور پر وہیں سے پہنچتے تھے۔ میرے دادا پنجاب کے مرشدہ تعلیم میں پریس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ریٹائر ہونے کے بعد مطبع صحافی قائم کیا جس میں قرآن کریم کی اشاعت کا بڑا عمدہ انتظام کیا۔ والد مغفور تاجر تھے اور آرٹسٹ تھے، فوٹو گرافر تھے اور فوٹو

گڈز ڈیلر (Photo goods dealer) کی حیثیت سے تجارت کرتے تھے۔ میں نے اپنے باپ کا ہنر نہیں سیکھا۔ باقی کے میرے تمام بھائی جو تھے وہ اسی ہنر سے ہنرمند رہے۔

(س) ڈاکٹر صاحب آپ یہیں لاہور میں ہی پیدا ہوئے.....؟

(ج) میں لاہور میں پیدا ہوا جی۔ اگر صحیح ہے تو ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوا۔

(س) اور پھر کن کن مدارس میں تعلیم حاصل کرتے رہے آپ؟

(ج) پیدا ہونے کے ساتھ تو مدرسہ نہیں چلا گیا تھا۔ لیکن اتنا ہے کہ ابتدائی تعلیم لاہور شہر کی

گلیوں کے اندر ایک محلہ سریاں او جڑیاں کا محلہ ہے اس میں کوچہ کہیاں ہے۔ اس میں پہلی

برانچ تھی یہاں سے میں نے اپنی تعلیم شروع کی۔ اور پہلے تین برس جو تھے پہلی، دوسری اور

تیسری جماعت کے وہ ناظم صاحب کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ خصوصیت کے ساتھ والد صاحب

نے ان سے ٹیوشن کا انتظام کیا ہوا تھا۔ وہ اپنی کرسی کے قریب مجھے ایک سٹول پر بٹھایا کرتے

تھے اور وہیں پر میں نے یہ تین امتحان پاس کیے۔ اس کے بعد شیرانوالہ دروازے میں گیا جو

میری زندگی کے واسطے نہایت ہی اہم درس گاہ ہے۔ اس واسطے کہ شیرانوالہ دروازے میں مجھے

اپنے شفیق اور بزرگ استاد ہیڈ ماسٹر محمد دین کا فیض نصیب ہوا اور انہوں نے اپنے درس قرآن

سے میرے اندر قرآن حکیم کے درس کا ایک شوق پیدا کر دیا اور اس کے بعد اس درس کے

سامنے مسجد لائن والی میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے درس قرآن حکیم نے مجھے درس کی

طرف توجہ دلا کر اس قابل کر دیا کہ میں بھی اپنی حقیر خدمات اس سلسلے میں پیش کر سکوں۔ چنانچہ

پہلا تو مدرسہ اسلامیہ ہائی سٹول شیرانوالہ دروازہ لاہور ہے اور دوسرا مدرسہ مشن کالج ہے۔ میں

سمجھوں گا کہ بھئی نا انصافی ہوگی کہ اگر میں مشن کالج کے احسانات کا ذکر نہ کروں۔ مشن کالج

میں مجھے جذبہ خدمت حاصل ہوا اور ان سے میں نے تبلیغ کرنے کے بہت سے اسلوب سیکھے جو

مجھے اسلام کی تبلیغ میں خود استعمال کرنے کا موقع ملا۔ اور میں اکثر دوستوں سے ذکر کرتا رہتا

ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے دین کو پھیلانے والے اگر یہ مشنری ہوں تو یہ دین ساری دنیا کے اندر

پھیل جائے۔ خدا جانے ہم میں لیا کوتاہی ہے کہ ہم اس خلوص سے اور اس نرمی سے اور اس

خدمت سے کسی کو فریفتہ نہیں کر سکتے اور ادع الی سبیل ربک بال حکمة

والموعظة الحسنة و جادلهم بالتی هی احسن (نحل: ۱۲۵) اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ، حکمت سے اور میٹھی میٹھی نصیحتوں سے اور اگر بحث ہو تو عمدہ طریقے سے بحث ہو، یہ آج ہمارے مبلغ میں نہیں پائی جاتی۔ مبلغ بات بعد میں کرتا ہے جھگڑا پہلے شروع کر دیتا ہے۔ اسلام کے پھیلانے میں کچھ کوتاہیاں ہیں اور اول تو سب سے بڑی یہی کوتاہی کہ ہم نے اسلام کے پھیلانے کو اپنا فریضہ نہیں سمجھا۔ اور حقیقت میں مسلمان دنیا کے اندر آیا ہی اس واسطے تھا ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینہون عن المنکر و اولئک ہم المفلحون (سورہ آل عمران: ۱۰۴) کہ تم میں ایک جماعت ہر وقت ایسی تیار رہنی چاہیے کہ وہ دعوت الی الخیر دے، امر بالمعروف کرے، نہی عن المنکر کرے اور یہی کامیاب لوگ ہیں۔ کامیابی کی شرط امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ملائی گئی۔ افسوس ہے کہ مسلمان نے حکومت تو کی لیکن تبلیغ نہیں کی۔ مسلمان کو دنیاوی عروج حاصل ہوتا چلا گیا اور دینی عروج سے اس کا کم سے کم تر واسطہ ہوتا گیا حتیٰ کہ اس نے اپنی تبلیغی مساعی کو کمزور کر لیا۔ اب ہمارے ملک میں ایک محکمہ امور دینیہ کی وزارت قائم ہوئی ہے امید کرتا ہوں کہ ہمارے بیدار مغز حاکم تبلیغ دین کی طرف خاطر خواہ توجہ دے سکیں۔

(س) اچھا علامہ صاحب ایک بڑا اہم سوال ہے کہ آپ نے اس دوران کن کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا؟

(ج) میرے اساتذہ کا ذکر کر کے آپ نے مجھے کچھ تکلیف دی ہے۔ ایک وسیع سلسلہ ہے ایک قافلہ ہے میرے سامنے چلتا ہوا۔ نیک کردار بزرگوں کا کہ ان سب کا جانا جو ہے وہ میرے واسطے ایک ذاتی صدمہ بھی ہے اور دنیاوی طور پر نقصان بھی ہے۔ لیکن چند ایک بزرگوں کا جن کا بہت زیادہ مجھ پر اثر ہوا ان کا میں ذکر کر دوں کہ اساتذہ کے سلسلے میں سب سے پہلے والد مغفور ہیں کہ انہوں نے میری تربیت شفیق استادوں اور ایک شفیق باپ دونوں طرح کی۔ پھر اس کے بعد ہیڈ ماسٹر محمد دین اور حافظ غلام احمد اور مولانا فضل میراں صاحب۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے قرآن کی طرف توجہ دلائی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے روزانہ درس قرآن کو میں نے اپنی زندگی میں منتقل کیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں برسوں قرآن

حکیم اسی انداز میں سناتا رہا جس طرح کہ ان دو استادوں سے سنا۔ ایک ہیڈ ماسٹر محمد دین اور دوسرے مولانا احمد علی صاحب لاہوری، کہ ان کے درس میں دوسری کتابیں تو مدرسہ قاسم العلوم میں ہم استادوں سے پڑھتے تھے۔ لیکن مولانا سے میں نے قرآن حکیم پڑھا ہے، مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے، حجۃ اللہ البالغہ پڑھی ہے، ترمذی پڑھی ہے، تو ان کے نوٹس میں اس طرح رواں لکھتا تھا کہ وہ بولتے چلے جاتے تھے تو میں رواں لکھتا چلا جاتا تھا۔ اور وہی نوٹس میری زندگی میں کامیاب ہوئے اور میں کہا کرتا ہوں کہ مجھے اگر کوئی سلام کرتا ہے تو وہ مولانا احمد علی کو سلام کرتا ہے۔ وہ میرے اساتذہ کو سلام کرتا ہے۔ میں کیا ہوں؟ میں کچھ بھی نہیں کہ جو کچھ ہے یہ ان لوگوں کا فیض ہے اور مجھے بزرگان دین میں سے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی صحبت کا فیض بھی حاصل ہوا اور حضرت مفتی محمد حسن صاحب کا بھی اور مفتی محمد شفیع دیوبندی (اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے) ان سے بھی کسب فیض کرنے کا موقع ملا ہے اور مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ابوالحسنات قادری، ان دو سے بھی مفید صحبتیں رہی ہیں اور بہت سے بزرگ ہیں حافظ محمود خان شیرانی صاحب کا ذکر بالخصوص کروں گا اور ملک عبدالقیوم صاحب لاء کالج کے پرنسپل تھے ان کا ذکر کروں گا۔ یہ وہ استاد ہیں جن کی شفقت نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ اتنے ہی استاد ہیں۔ میرے استادوں میں وہ عیسائی استاد بھی ہیں جن کی شفقت نے میری تعمیر میں حصہ لیا۔ پروفیسر محمد اسماعیل ہیں، ڈاکٹر لوقس ہیں، ڈاکٹر ویزوولڈ ہیں۔ ان اساتذہ نے بھی میری سیرت کو کردار کی تعمیر میں شریک ہو کر مجھے ممنون کیا۔

(س) مولانا عبید اللہ سندھی صاحب سے بھی آپ کو اکتساب فیض کا موقع ملا ہے؟

(ج) جب ہم حضرت مولانا احمد علی صاحب سے درس لیا کرتے تھے تو ان دنوں وہ اکثر

حضرت مولانا سندھی علیہ الرحمہ کا ذکر کرتے تھے، تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ایک گم شدہ چیز کا ذکر ہے، استاد کا استاد ہے، ملک سے دیس نکالا ہوا ہے۔ اب ہم کبھی زندگی میں نہیں دیکھ سکیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ وہ دیس نکالے سے واپس آئے تو ان کی خدمت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ عید الفطر کے دن حضرت مولانا احمد علی صاحب نے مولانا صاحب کی خدمت میں مجھے پیش کیا جبکہ مولانا نے کہا تھا کہ مجھے کوئی ایسا شاگرد دو جو کہ انگریزی علوم اور

دینی علوم دونوں میں دسترس رکھتا ہو۔ تو حضرت مولانا احمد علی صاحب نے عید کی نماز سے واپس آتی دفعہ منٹو پارک میں مجھے یہ کہا کہ آج ظہر کی نماز کے بعد آپ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ اس کے بعد مولانا سندھی کی خدمت اتنی جاذب توجہ تھی کہ فراغت کا وقت تھا، فراغت کا زمانہ تھا، صبح چلا جاتا تھا اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ مولانا انتھک بولنے والے تھے۔ اور اس بولنے میں، میں نے دیکھا ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ درمیان میں نماز کا وقت آتا تو نماز پڑھ لی جاتی اور پھر ایک نماز سے دوسری نماز کے درمیان کا جو وقفہ تھا اس میں پھر وہ تقریر جاری کر دیتے تھے۔ کئی کئی نمازوں میں ان کی تقریریں جاری رہتی تھیں۔ اس سلسلے میں، میں نے مولانا احمد علی صاحب کو جبکہ آخری عمر میں فالج ہو گیا تھا اور وہ کمزور تھے ان کو میں نے حضرت مولانا سندھی صاحب کی خدمت میں اس طرح دوزانوں بیٹھے دیکھا ہے اور پہروں بیٹھے دیکھا ہے کہ ہم رشک کیا کرتے تھے کہ ہم جوان آدمی تو اٹھ اٹھ کے باہر جاتے ہیں گھٹنے دبا کر آتے ہیں پھر دوبارہ بیٹھتے ہیں لیکن مولانا مسلسل ان کی خدمت میں دوزانوں بیٹھے رہتے تھے۔ حضرت مولانا سندھی علیہ الرحمۃ سے قرآن حکیم کا تیسواں پارہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اور مولانا کی گفتگو اکثر حجۃ اللہ البالغہ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کے متعلق ہوتی تھی۔

(س) علامہ صاحب ایک ذاتی سوال آپ سے پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے والدین کی راہنمائی ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ بچوں کی تربیت میں کن امور کو پیش نظر رکھتے ہیں؟

(ج) خندہ پیشانی جس کو نبی اکرم ﷺ نے صدقہ کہا ہے ”التبسم صدقة“ تو اس کو سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی دولت ہے جو اولاد کے سلسلے میں والدین کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آنا بھی حضور اکرم ﷺ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے۔ آپ نے فرمایا ”من لم یؤقر کبیرنا و لم یرحم صغیرنا فلیس منا“ جو بڑوں کا ادب نہیں کرتا اور چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا فلیس منا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنی سوسائٹی میں شامل نہیں کیا اور آج ہم رحم کے بغیر، احترام کے بغیر چل رہے ہیں تو

اس کا نتیجہ سوسائٹی کی زبوں حالی پر منبج ہو رہا ہے۔

(س) اخلاقی تربیت کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

(ج) اخلاقی تربیت بھی یہ دیکھئے۔ اخلاقی تربیت کا اصول قرآن نے بیان کیا ہے۔ ادع

الی سبیل ربک بالحکمة۔ حکمت سے بات کرنی چاہیے۔ Wisely، شگیشسلی

Seeugaciolisly بات کرنی چاہیے۔ ایسے انداز اختیار کرنے چاہئیں جس سے سمجھنے

والے کو پتہ چلے کہ آپ اسے کچھ دے رہے ہیں۔ ہمارا مقرر اور ہمارا فاضل جس وقت تقریر

کرتا ہے تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کچھ لے رہا ہے، ان سے کپڑے چھین رہا

ہے، ان کی جان نکال رہا ہے۔ اصل میں یہ ہونا چاہیے تبلیغ دین کے سلسلے میں کہ محبت کے ساتھ

دوسرے شخص کو جو کچھ اس کی ضروریات ہیں اس کا قائل کر کے اس کو دے دی جائیں تاکہ وہ

ان کی قیمت کو سمجھے اور دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

(س) اچھا علامہ صاحب آپ نے دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کیا اور مختلف لوگوں سے

آپ کو ملنے کا اتفاق ہوا اور مختلف جگہوں پر آپ نے دینی رجحانات کا بھی مطالعہ کیا ہوگا میرے

ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ آپ نے دنیا کے کن کن علاقوں میں دین برحق کی محبت کو

زیادہ پایا۔ دین حق کی طرف لوگوں کو زیادہ مائل دیکھا؟

(ج) دین برحق کی طرف مائل تو میں نے غیر مسلموں کو دیکھا۔ دین برحق جن کا ہے ان

کے ملکوں میں اس کا چرچا کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے یا صرف جذباتی ہے اور وہ دوسرے جو

ہیں ان میں اتنی تڑپ ہے کہ آپ ان کے سامنے کوئی بات کہنا شروع کریں تو وہ اپنے سات

کام چھوڑ کر بھی اس کی طرف توجہ دیتے ہیں یعنی جتنی تڑپ باہر کے ملکوں میں پائی جاتی ہے

میری زندگی کی حسرت یہی ہے کہ میں نے وہ تڑپ دیکھی لیکن اس تڑپ کا علاج نہ کر سکا۔

(س) اگر میں آپ کی پوری زندگی سے ایک تاثر یہ لوں کہ آپ کی زندگی جدوجہد سے

بھر پور ہے تو یہ میرا تاثر کہاں تک درست ہوگا؟

(ج) صاحب میں ایک غریب کا بیٹا، غربت کی حالت میں دس روپے سے میں نے زندگی

شروع کی تھی اور جب میں ریٹائر ہوا ہوں تو -/4000 روپے ماہوار میرا وظیفہ تھا۔ اس ساری

زندگی کو میں نے اس طرح بسر کیا ہے کہ جو کچھ میرے سامنے آیا ہے، عار کے بغیر میں نے وہ کام کیا بشرطیکہ اس کو صحیح پایا اور جس طرح آپ کسی اونچی چیز کو پکڑنا چاہتے ہوں اور قد نہ پہنچے تو آپ ایڑیاں اٹھاتے ہیں اور ہاتھ اٹھاتے ہیں اس طرح محنت اور کوشش میں، میں نے ایڑیاں اٹھائیں اور ہاتھ اٹھائے اس چیز تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری حالت اس ہندی کے شاعر کی طرح ہے:

میرے میں نہ ودیا نہ باہو بل نہ کھرچن کو دام

تلسی ایسے غریب کی پت رکھے بھگوان

مجھ میں نہ ودیا تھی نہ علم تھا نہ باہو بل نہ طاقت تھی بازو کی اور نہ کھرچن کو دام، اور نہ خرچنے کو دام تھے۔ تلسی ایسے غریب کی، پت رکھے بھگوان۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ایسے غریب کی عزت رکھ سکتا ہے۔ تو اس مالک نے میری عزت رکھی ہے۔ مجھے وسائل وہ خود مہیا کرتا رہا۔ میری بساط سے اونچے کام مجھے دیئے گئے اور میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام لے کر ان کو کیا اور محنت سے کیا۔ غار نہیں کی کسی نیک کام کے کرنے میں۔ اور محنت و مشقت میں نے اپنے واسطے ایمان کے جزو کے طور پر رکھا۔

(س) علامہ صاحب آپ آج کے نوجوان کو اور آج کے عوام کو اپنی زندگی میں کیا روش اختیار کرنے کی تجویز دیتے ہیں؟ آج کا نوجوان جو ہے اس کو اپنی زندگی کن خطوط پر ڈھالنی چاہیے۔ یعنی مطلب یہ کہ آپ کی پوری زندگی کے تجربے کی بنا پر آپ آج کے نوجوان کے لیے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں، کوئی بات آپ کہنا چاہیں۔

(ج) آج کل کے نوجوان کو میں صرف اتنا ہی پیغام دینا چاہتا ہوں کہ نوجوانی زندگی کا سب سے غنیمت وقت ہے اس میں کام کی فرصت بھی زیادہ اور کام کی توفیق بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر وہ صحیح طور پر یہ چاہیں کہ اپنی انفرادی زندگی اور اپنی اجتماعی ماحول کو بدل دیں تو ان کو خلوص کے ساتھ اور نیک نیتی کے ساتھ کام کرنا چاہیے اور اس خلوص میں گھبراہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر نتائج جلدی پیدا نہیں ہوتے تو وہ ذرا گھبرا جاتا ہے۔ نوجوان کی بس ایک ہی کمزوری ہے کہ وہ گھبرا جاتا ہے نتیجے کی جلدی میں۔ اگر وہ تھوڑے سے تحمل اور برداشت سے

کام کرے اور تحمل اور برداشت نو جوان کی زندگی میں اس کے عمل کی قوت کے ساتھ شامل ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ نو جوان ہی دنیا کا وہ حصہ ہے جو دنیا کو تبدیل بھی کر سکتا ہے، دنیا کی تعمیر بھی کر سکتا ہے اور دنیا کی عزت بھی بن سکتا ہے۔

(میزبان) علامہ صاحب ہم آپ کے بہت زیادہ شکر گزار ہیں کہ آپ نے سامعین کے لیے آج اتنا وقت دیا اور بہت سے مفید مشورے دیے اور اپنے تجربات زندگی کے بیان کئے۔ اپنے تعلیمی تجربات بیان کئے اور تبلیغی مساعی بھی۔ بہت ہی شکریہ۔
(علامہ صاحب) میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ مجھے موقع دیا کہ میں یہ باتیں کر سکوں۔



نگارشات
(علامہ صاحب کی تحریریں)

تقویٰ

سورہ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا، کہ ان میں ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان ہی میں سے ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں ناپاکیوں سے پاک کرتا ہے۔ انہیں کتاب ربانی کی تعلیم دیتا ہے اور دانش و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے ورنہ وہ تو اس سے پہلے صاف گمراہی میں تھے“ اور دوسرے مقام پر سورہ جمعہ میں ارشاد ہوا کہ ”یہ رسول ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی بھیجا گیا ہے جو ابھی ان عربوں سے ملے نہیں“ یعنی ان قوموں کا ذکر فرمایا گیا جو عربوں کے نقش قدم پر اسلام سے مشرف ہونے والی تھیں پھر اور مقامات پر سرور دو عالم ﷺ کے ہادی کل اور رحمۃ اللعالمین ہونے کا تذکرہ کیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل اور بھی پیغمبر گزرے تھے وہ اپنی اپنی امتوں کی طرف ہدایت اور پیغام فلاح لے کر آتے رہے مگر رحمۃ اللعالمین کا آنا سب کے لیے تھا۔ آپ ﷺ پہلوں کی تصدیق کرنے والے اور امتوں کو عالمگیر امن و اتحاد کی دعوت دینے والے ہو کر آئے۔ حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ آپ منشاء ربانی کے مخلوق انسانی تک پہنچنے کا ذریعہ بنیں۔ انسانی سیرتوں کو پاک اور مطہر بنائیں اور ان میں کتاب اللہ کا صحیح شعور و فہم پیدا کریں تاکہ وہ آپ سے سیکھی ہوئی دانش و حکمت کے ذریعے اپنی اور دیگر قوموں کی ہدایت کر سکیں۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ”تزکیہ“ ہے تزکیہ کے لفظی معنی ہیں پاک صاف کرنا نکھارنا میل کچیل دور کرنا۔ یعنی نزول کتاب اور بعثت رسول کا مقصد انسانی زندگی کو ہر طرح کی نجاست اور آلودگی سے نکھار کر صاف ستھرا کر دینا ہے، سورہ الشمس میں ارشاد ہوا ہے: ”قسم ہے نفس انسانی کی اور جس طرح اسے درست کیا گیا، سمجھ عطا کی اسے برائی اور بھلائی کی، بے شک وہ جس نے اس کو سنوار لیا یعنی پاک و صاف رکھا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ ناکام ہو گیا“۔ یہاں بھلائی

کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ سے کیا مراد ہے اور اسلام میں اسے کیا اہمیت حاصل ہے؟

تقویٰ لغت کے اعتبار سے تو انتہائی احتیاط اور نگہداشت کا نام ہے اور شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے زندگی اس احتیاط سے بسر کرنا کہ وہ ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ رہے۔ تقویٰ حقیقت میں اس قلبی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو مالک حقیقی کے منشاء کی پہچان کی طرف مائل رکھتی ہے اور انسان اپنے رب کے سیدھے راستے پر چلتا ہے، دائیں بائیں دیکھتا نہیں۔ افراط و تفریط سے یک سر بیچ کر اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ غرض تقویٰ تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی اصل ہے۔ بندہ جب اپنے مالک سے ڈر کر چلتا ہے تو ہر اس بات سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے منشاء سے ٹکراتی ہو۔ ہر برائی سے بچنے لگتا ہے اور ہر آلودگی سے بیزار ہوتا ہے، لیکن اللہ کے خوف سے ہر گز یہ مراد نہیں کہ انسان اس سے ڈر کر دور بھاگے، جیسے شیر یا سانپ کا خوف ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ تقویٰ یا خوفِ الہی سے مراد محبت کی ویسی کیفیت ہے جو اولاد کو والدین کی مرضی کے خلاف نہیں چلنے دیتی۔ غرض اپنے مالک کی محبت نیک بندے کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں چلنے دیتی یہ اس کی رضا کی تلاش میں رہتا ہے اور جس بات میں اس کی رضا نہیں وہ اس کے بندے کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ”یہی تقویٰ“ ہے۔ تقویٰ کی ایک مثال خاردار جھاڑیوں میں سے گزرنے کی ہے کہ گزرنے والا کانٹوں کو دامن سے الجھنے نہ دے اور اسے کانٹوں کی زد سے بچا کر چلے، ساری احتیاط اور ساری حفاظت اس مثال میں آگئی۔ سرورِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا بُعِثْ لِاتِمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ۔ یعنی میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔ اخلاقِ حسنہ کی یہ تکمیل تقویٰ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے سورہ آل عمران میں یوں ارشاد ہوا ہے کہ ”اے دعوتِ ایمانی کے قبول کرنے والے انسانو! تقویٰ سے چلو، یعنی اللہ سے ڈر کے چلو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور موت سے پہلے اسلام پر قائم رہنے میں کوشاں رہو“۔ تقویٰ سے مراد ایک مثبت قسم کی نیکی ہے یا منفی قسم کا پرہیز؟ یہ سوال بھی بہت اہم ہے۔

تقویٰ کو محض گناہوں سے بچنے تک محدود کر دینا صحیح نہیں اور یہ بھی غلط ہے کہ اس

انسانوں کو عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ یعنی ہماری بندگی اس نظام کائنات میں سرخ روئی سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔

ہر عبادت میں انسان کے لیے ایک کامیابی کی صورت ہے، ہر ایک کا منشا پاکیزگی اور تقویٰ پیدا کرنا ہے، نماز اخلاقی گندگیوں اور عقلی گمراہیوں سے بچاتی ہے، روزے سے حلال و حرام اور حق و باطل کی تمیز پیدا ہوتی ہے، قربانی کے متعلق کہا کہ اس کا گوشت اور خون اللہ کو مطلوب نہیں بلکہ تقویٰ تم میں پیدا کرنا مقصود ہے جو تمہیں زندگی کی ذمہ داریوں کے قابل بنا سکے۔

غرض کہ تقویٰ ہی روح عبادت ہے تقویٰ ہی روح عمل۔ قرآن کریم نے تقویٰ کو مثبت نیکی کی حیثیت سے سراہا ہے اسے ساری زندگی پر حاوی قرار دیا ہے، مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ نہ صرف متقی بننے کی خواہش رکھے بلکہ متقیوں کا رہنما اور پیشوا بننے کی آرزو کرے۔ سورہ فرقان میں مومنوں کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

”جھوٹے کاموں میں شامل نہیں ہوتے، لغویت کے پاس سے سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور اللہ کی آیتیں سنیں تو اندھے بہرے نہیں ہو جاتے یعنی غور کرتے ہیں اور ہمیشہ یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں کی آنکھ کی ٹھنڈک، یعنی سرورِ حیات عطا فرما اور ہمیں تقویٰ گزاروں کا امام اور پیشوا بنا۔“

(قرآن حکیم اور ہماری زندگی، جلد دوم: منتخب نشریات صفحہ ۱)



سے ترک دنیا اور رہبانیت مراد لی جائے، اگر ہم ایسا سمجھیں تو یہ ہماری بھول ہوگی۔ تقویٰ کسی فراریا گریز کا نام نہیں بلکہ مثبت قسم کی نیکیوں کی تیاری اور اچھے اعمال کے تہیہ کا نام ہے۔ قرآن حکیم نے واضح طور پر متقیوں کے اوصاف بیان فرما کر بلربار ثابت کیا ہے کہ تقویٰ نیک اعمال کی جڑ ہے اور متقی ان لوگوں کو نہیں کہا جاسکتا جو زندگی کے مختلف مرحلوں سے دور بھاگیں یا چند رسموں کو نیکی کا معیار قرار دے لیں۔“ سورہ بقرہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

”نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم اپنے منہ کبھی مشرق کی طرف پھیر لیا کرو اور کبھی مغرب کی جانب اصل نیکی تو اس کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے آخرت کے دن کو مانے، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں کے ذریعے سے آئی ہوئی ہدایت کو قبول کرے اور اللہ سے محبت رکھتے ہوئے اپنے مال و ودات کو حاجت مندوں، رشتہ داروں اور یتیموں مسکینوں یا مانگنے پر مجبور انسانوں پر صرف کرے اور گردنوں کو غلامی سے نجات دلانے میں لگائے اور نماز کو قائم رکھے اور زکوٰۃ دیا کرے تاکہ ملی اور مالی تنظیمیں مضبوط رہیں اور یہ لوگ جب عہد کیا کریں تو اسے ہر حال میں پورا کیا کریں اور سختی میں تکلیف میں لڑائی میں صبر سے کام لیں، یہی لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں اور یہی متقی ہیں۔“

آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں متقی کی تصویر کسی ایسے شخص کی تصویر نہیں جو کسی جدوجہد کے بغیر دنیا جہان سے بیزار زندگی کے دن پورے کر رہا ہو بلکہ اس کے برعکس قرآن حکیم نے تقویٰ کی فضیلت کا مالک صرف ان ہی لوگوں کو ٹھہرایا ہے جو ایمان کے پکے ہیں، یقین میں کامل ہیں، جو راہ راست سے واقف ہیں اور جو پوری ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ اخلاقی ذمہ داریاں ہوں یا معاشی انتظام ہوں یا سیاسی فریضے یہ لوگ اللہ کی بندگی میں بھی پیش پیش اور انسان کی خدمت میں بھی سب سے آگے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے یہی فعال بندے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں اور ان کی سعی و عمل کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔

اسلام نے عبادت کو مقصد حیات ٹھہرایا ہے۔ واضح ارشاد ہے کہ ”ہم نے جنوں اور

عہد رسالت مآب ﷺ میں معاشرتی نظام

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ہدایت یعنی برائی اور بھلائی کی پہچان اور تمیز رکھی ہے۔ فرمایا:

فَالْهَمُّهَا فَجُورُهَا وَتَقْوَاهَا (الشَّمْس: ۸)

(نفس انسانی کو فجور و تقویٰ دونوں کی پہچان کرا دی گئی)

اس فطری ہدایت کے علاوہ نبوی ہدایت میں وقتاً فوقتاً قوموں کی اصلاح کا انتظام کیا۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ نبوی ہدایت کا سلسلہ عالمی حیثیت سے پھیلا رہا۔ ہر امت کے لیے رسول آئے۔

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (ہر قوم کے لیے ہادی ملا)

کوئی ایسی امت نہ رہی کہ اس کے پاس ڈر سنانے والا نہ آیا ہو۔ قرآن حکیم میں آتا ہے:

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۴)

(کوئی ایسی امت نہ رہی کہ جس کے پاس ڈر سنانے والا نہ آیا ہو)

یہ زبردست تاریخی حقیقت قرآن حکیم نے دنیا میں پہلی دفعہ پیش کی کہ مختلف اقوام میں الگ الگ زمانوں میں ہادی آتے رہے ہیں۔ جن کا کام لوگوں سے خدا کی بندگی کرانا اور انہیں شیطان کے رستے سے بچانا اور ہٹانا تھا۔ نوع انسانی جب شعور کے بلوغ کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا ہادی مبعوث فرمایا جو ہدایت کی تکمیل کر دے۔ دنیا کو بہترین اخلاق اور عمدہ ترین اعمال کی تعلیم تکمیلی حد تک دے دے۔ یہ سرکارِ دو عالم حضرت محمد اکرم ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات تھی جس نے اقضاء عالم کو نور ہدایت بخشا۔ حضور ﷺ سے پہلے دنیا میں اندھیرا تھا۔ حضور سراپا نور جب تشریف لائے، آپ کے تشریف لانے سے عالم بقعہ نور بن گیا۔ پرانی تہذیبوں نے بساطیں لپیٹ لیں ادھورے نظام مٹ گئے اور ان کی جگہ ایک مکمل نظام ہدایت نے لی۔ جس نے اپنے قبول کرنے والوں کو ایک مکمل دستور حیات اور اعلیٰ نظام زندگی عطا کیا۔ سرور

دو عالم کی تشریف آوری ایک عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ جو فرد کا بھی انقلاب تھا اور جماعتوں کا بھی انقلاب تھا جسم کا بھی انقلاب تھا اور روح کا بھی انقلاب تھا۔ جو آنکھ کا بھی انقلاب تھا اور قلب و دماغ کا بھی انقلاب تھا۔ جس نے زندگی کے تمام گوشوں کو نور علی نور بنا دیا۔ جس نے اخلاق عالیہ کی تعلیم دے کر اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب، تمدن سب میدانوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ عرب قوم جس میں حضور سراپا نور مبعوث ہوئے اگرچہ مہذب دنیا سے الگ تھلگ تھی لیکن شخصی اور اجتماعی میدانوں کی خوبیاں اور خرابیاں سب حاصل تھیں۔ عرب معاشرت کی اہم خصوصیات یہ تھیں:

(۱) جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جو طاقت ور ہوتا وہ دوسروں کو دبا لیتا۔ جو مضبوط ہوتا وہ

کمزور کو کھا لیتا۔ اور بھائی بھائی کا دشمن بن کے ایک دوسرے کے خون کا پیا سار ہتا۔

(۲) حلال اور حرام کی تمیز کا نہ ہونا تھا۔ حلال و حرام یہاں تک گم تھا کہ ان کو اپنے باپ کی منکوحہ بیویاں تک ورثے میں لے لینے میں کوئی باک نہیں تھا۔ اور دوسرے کا مال جس طرح ہو سکے غصب کر لینا ان کے ہاں مضبوط لوگوں کی عام روایت تھی۔

(۳) شادیوں کی کوئی مقدار مقرر نہ تھی جو شخص جتنی چاہتا شادیاں کر لیتا۔ مرنے کے بعد

اس کی بیویاں ورثے میں تقسیم ہو جاتیں۔ عورت کو معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔

بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ کشت و خون اور لوٹ مار عام تھی۔ سو، سو سال تک لڑائیاں

چلتی رہتیں۔ غلامی کا رواج عام تھا۔ غلاموں کے ساتھ حیوانوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ ہادی

اسلام کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا کے بوجھ ہلکے کرنے اور زنجیریں اور بندھن جو ان پر پڑے

تھے ان کو کاٹنے کے لیے بھیجا۔ عرب کے دائیں بائیں قیصر اور کسریٰ کا نظام رائج تھا۔ جو عیش و

عشرت کے نظام تھے۔ ظلم و جور کے نظام تھے۔ اسلام نے معاشرہ کی کایا پلٹ دی۔ قیصری اور

کسریٰ نمونوں کو نظر انداز کر دیا۔ اور ایک ایسا نظام معاشرت پیش کیا جس کی بنیاد شرف

انسانیت، وحدت نسل انسانی دعوت خیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر تھی۔ عظمت انسان کو

حریت، مساوات اور اخوت کے درس میں شامل کر دیا۔ انسان کو عزت دار تسلیم کرایا۔ انسان کو

دنیا کے اندر اللہ تبارک و تعالیٰ کے قول کے مطابق:

لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم (التین: ۴)

(اور ہم نے انسان کو بہترین ڈھانچے میں پیدا کیا)

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولقد کرمنا بنی آدم (بنی اسرائیل: ۲۰)

(اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی)

انسان کی عظمت کا احساس انسان کو دلا کر وہ تمام برائیاں اور خرابیاں جو اس کی عظمت کو نقصان پہنچاتی تھیں اور دھبہ لگاتی تھیں وہ اس سے دور کرادی گئیں۔ جس وقت حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں حضرت جعفر طیار نے تقریر کی تو اس وقت انہوں نے گن گن کر وہ تمام برائیاں سنائیں جو عربوں میں پائی جاتی تھیں۔ ایک دوسرے کا پیری ہونا، بھائی کا بھائی کے خون کا پیاسا ہونا، عورتوں کی عزت کو نہ پہچاننا، شرافت کے معاملات میں عدل و انصاف سے کام نہ لینا۔ یہ تمام برائیاں انہوں نے کہا ہم میں پائی جاتی تھیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں میں سے ایک ایسا اللہ کا بندہ پیدا کیا جس نے ہمیں ہدایت دے دی اور وہ تمام خرابیاں ہم سے دور ہو گئیں۔ وحدت نسل انسانی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تبارک و تعالیٰ کو یاد رکھو اور اس سے ڈر کے چلو۔ جس نے تم کو پیدا کیا ایک نفس سے اور پھر اس نے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پیدا کیں“ گویا کہ اسلام نے برابر اور مساوات کی نگاہ سے دیکھا اور عزت والا قرار دیا اور عورت اور مرد دونوں کو چونکہ دونوں انسان میں شامل ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے عظمت والا بیان فرمایا۔ انسان کو عزت دار تسلیم کرانا یہ اسلام کا سب سے بڑا احسان ہے جو اسلام نے دنیا پر کیا۔ انسان اپنے آپ کو ذلیل و خوار بھی سمجھتا تھا اور اتنا حقیر سمجھتا تھا کہ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے گھر وندوں کی پوجا پاٹ کرتا، اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کی عبادت کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ نہیں ہم نے لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم بے شک ہم نے انسان کو بہترین سا ڈھانچے پر پیدا کیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ولقد کرمنا بنی آدم ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ایک ایک حصہ انسانی زندگی کا جو ہے وہ لے کر، اس کی خرابیاں نکال کر پاک و منقی کر کے رکھ دیا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ رسول

اکرم ﷺ کے زمانے میں عورت اور غلام یہ دونوں مظلوم تھے سب سے زیادہ مظلوم تھے۔ اسلام نے سب سے زیادہ توجہ عورت کی طرف دی اور یہ بتایا کہ عورت عزت دار ہے تمہاری پیدائش اور عورت کی پیدائش ایک ہی طرح کی ہے اور تم آپس میں برابر برابر ہو۔ کوئی اونچا نہیں کوئی نیچا نہیں۔ انتظامی ضروریات کے واسطے اگر کوئی تفوق ہو تو وہ علیحدہ بات ہے ورنہ عورت اور مرد کی مساوات بھی بتائی اور یہ بھی بتایا کہ مرد آپس میں سب ایک ہیں۔ گوزے، کالے، چھوٹے، بڑے، امیر، غریب تمام کے تمام آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ رسول اکرم نے اسی طرح دوسرا طبقہ مظلومہ غلاموں کا تھا اس کی طرف توجہ دی اور غلام کو آقا کے برابر کر دیا اور کہا کھانا پینا، رہنا سہنا، چلنا پھرنا یہ سارے کے سارے تم میں مشترک ہیں جس وقت تم اپنے آپ کو دیکھو تو ان ملازموں کو (غلاموں کو اپنے ہاتھ اور پاؤں سمجھو۔ جس طرح ہاتھ اور پاؤں کام کرتے ہیں اس طرح یہ کام کرتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جو اپنے ہاتھ اور پاؤں کے ساتھ سلوک کرتے ہو۔ ان حقوق کی عام مشق اس معاشرے میں کی گئی جو رسول اللہ کے زمانے میں تیار ہوا تھا۔ حضور سرور کائنات ﷺ کا زمانہ اطہر اتنا روشن، اتنا عظیم زمانہ تھا کہ اس میں نمونے اگر گننے لگیں تو لاکھوں اور ہزاروں اور کروڑوں بن جاتے ہیں ان نیکیوں کے جو آج دنیا کو سیکھنا ہیں۔ دنیا کے واسطے بہترین زندگی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں بہترین طور پر چلنے کے اسلوب اور طریق سرور دو عالم ﷺ کے عمل سے اور قرآن حکیم کی تعلیم سے ہمیں حاصل ہوئے۔ ہمیں چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہم کوشش کریں کہ سرور دو عالم ﷺ کے عہد کا نمونہ دوبارہ ہمارے اندر رائج ہو جائے اور ہماری زندگیاں اسی طرح کامیاب ہو جائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے رسول پر لاکھوں اور کروڑوں سلام ہوں۔



والدین کے آداب

انسان جب ہوش سنبھالتا ہے تو سب سے پہلے جن دو انسانوں سے زیادہ مانوس ہونے کا موقع پاتا ہے وہ اس کے والدین ہیں۔ باہر کی دنیا کی ابھی اسے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اس کی کائنات فکر ماں کی محبت اور باپ کی شفقت میں محدود ہوتی ہے۔ مسکرا کر بلائے یا چلا کر اپنی طرف متوجہ کرے۔ یہی وہ مربی ہیں جو اس کی عاجزی کے اس زمانے میں اس کی ہر طرح سے خبر گیری کرتے ہیں۔ اس کی بے زبان کیفیتوں کو ہر لحظہ پیش نظر رکھنے کے لیے والدین اس کی طرف ہمہ تن توجہ بنے رہتے ہیں۔ اپنا سکھ قربان کر کے اس کے دکھ کو دور کرتے ہیں۔ اپنا آرام اور اپنی نیند گنوا کر اسے سکھ کی غیند سلاتے ہیں۔ بول نہیں سکتا اس لیے اس کی ضروریات کا خود خیال کرتے ہیں۔ یہی انسان جو بڑی عمر میں اس قدر قوت و قدرت کا مالک بن جاتا ہے۔ اپنے بچپن میں ایسا عاجز ہوتا ہے کہ اگر اس پر کبھی بیٹھے تو اسے ہٹا نہیں سکتا۔ مچھر کا ٹٹے کو آئے تو اسے دور نہیں کر سکتا۔ والدین کی توجہ نہ ہو تو یہ عاجز و پریشان ہو کر رہ جائے۔ جب یہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو اس کے لیے سب کچھ والدین کرتے ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ والدین کی توجہ اور شفقت اس کی کسی خدمت یا شفقت کے نتیجے اور جواب میں نہیں ہوتی۔ بچے نے بھلا ان کے لیے کیا کیا ہوتا ہے جو اسے حق پہنچ جائے کہ ان سے خدمت لے۔ والدین کی محبت جوابی نہیں ہوتی۔ فطری ہوتی ہے۔ اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ اس لالچ میں کمرے ہوں کہ بچہ بڑا ہو گا تو ہماری خدمت کرے گا۔ اگر ایسا ہوتا تب بھی خدمت میں پیش قدمی کی وجہ سے ان کا حق فائق ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ والدین تو اس بچہ کے لیے بھی جان دینے کو تیار رہتے ہیں جس کے متعلق یقین ہو گیا ہو کہ گھڑی پل میں ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گا۔ حق تو یہ ہے انسان کی کائنات حیات ابتدائے زندگی میں والدین کی محبت و شفقت پر منحصر ہوتی ہے۔ سمجھ آنے پر خدا کو ایمان کی نظروں سے پہچاننا ہے۔ لیکن جب سمجھ شعور کا سوال ہی نہیں ہوتا

اس وقت انسان کی توجہ بظاہر ان ہی دورِ حیم و شفیق ہستیوں تک محدود ہوتی ہے۔ انہیں دیکھتا ہے، انہیں سے مانگتا ہے، ان ہی سے پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعور احسان مندی حاصل ہونے پر جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ میری اور سب کی زندگی کا آخری سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیونکہ وہی پیدا کرتا ہے، وہی پالتا ہے، وہی سامان ترقی عطا فرماتا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے ان وسیع اور غیر محدود احسانات سے دوسرے درجہ پر اگر کسی کے احسانات اس کے سامنے آتے ہیں تو رب کے بعد مربی کے احسانات ہوتے ہیں اور بہترین مربی اس کے والدین ہوتے ہیں۔ جو اس کے بے چارہ پن اور عاجزی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس تک پہنچاتے رہے۔ پس فکر صحیح اور طبع سلیم اللہ تعالیٰ کی لاشریک ذات کے بعد والدین کی احسان مندی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے اور یہی دین فطرت کا حکم ہے۔

قرآن حکیم کے اکیسویں پارے اور سورہ لقمان کی چودھویں آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

اَنْ اَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ۔ یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔

قرآن حکیم نے ایمان والوں کی صفات یوں بیان کی ہیں کہ وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور اسی پر ایمان اور بھروسہ رکھتے ہیں۔ اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں۔ ان کے اعمال کی فہرست میں اللہ کی عبادت کا درجہ سب سے بلند ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد جس چیز کو سب سے اعلیٰ مقام بخشا گیا وہ والدین کے ساتھ عمدہ سلوک ہے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ارشادِ باری ہے: لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا۔ وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرُهُمَا وَ قُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِيْ صَغِيْرًا۔^۲ ”اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرو ورنہ حقیر اور ذلیل ہو جاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اپنے والدین کے ساتھ عمدہ

سلوک کرو۔ اور اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کو اف تک نہ کہو۔ اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے (بات کرو تو) نہایت ہی عمدہ طریق پر، اور نرمی اور عاجزی سے ان کے سامنے جھکے رہو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ اے پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح میرے چھٹپنے میں یہ مجھے رحمت و شفقت سے پالتے رہے۔

اس مضمون کا تذکرہ اور مقامات پر بھی آیا ہے اور اسی طرح توحید کی تلقین اور شرک سے بچنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ جو اسلام کی اصلی بنیاد ہیں۔ والدین کی محبت اور اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے اطاعت والدین کا درجہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی توحید کو ماننے اور شرک سے اجتناب کرنے کے بعد سب سے اہم کام والدین کی خدمت اور اطاعت ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ. وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ. ۳

”اور ہم نے لقمان کو دانائی و حکمت عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو۔ جو شکر کرتا ہے تو اس کا شکر خود اسے فائدہ دیتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے شکر کی حاجت سے بے نیاز ہے۔ خود سب خوبیوں کا مالک ہے۔ لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔“

کیسا دانشمند باپ ہے کہ تربیتِ اولاد کی بنیاد توحید سے محبت اور شرک سے بیزاری پر رکھتا ہے۔ یہی دگر تو انسان کو سب برائیوں سے پاک رکھتے ہیں۔

پھر اگلی ہی آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَ

فَصَالَهُ فِي غَامَيْنِ اِنْ شَكَرْ لِي وَلَوْ اَلَدَيْكَ اِلَى الْمَصِيْرِ ۝
 ”اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے۔
 (کیونکہ ماں باپ کے اس پر بہت احسانات ہیں) اس کی ماں نے
 کمزوری پر کمزوری سہہ کر اسے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور دودھ پلایا
 دو برس میں دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔ پس (اے انسان تجھے چاہئے کہ)
 تو میری اور اپنے والدین کی شکرگزاری کر۔ تجھے میری ہی طرف لوٹ
 کر آنا ہے۔“

اس کے بعد والدین کی اطاعت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ بھی
 واضح فرمادیا کہ ہر اطاعت میں یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ بندے کی اطاعت سے خدائے تعالیٰ
 کی توحید و طاعت میں حرج نہ واقع ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَ اِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ
 فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ
 اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۵
 ”کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک
 کرے جس کا تجھے علم ہی نہیں۔ تو اس حالت میں بے شک ان کا ان کا کہنا
 نہ مان مگر دنیا میں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آ اور ان لوگوں کی راہ پر چل
 جو میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ آخر کار تم سب کو لوٹ کر میرے ہی
 پاس آنا ہے۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔“

اس آیت سے یہ ظاہر ہوا کہ والدین مشرک بھی ہوں تو اگرچہ شرک میں ان کی
 اطاعت نہیں کی جائے گی مگر ان کے ساتھ حسن سلوک ترک نہیں کیا جائے گا۔

روایت ہے کہ ایک مسلمان خاتون رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں
 حاضر ہو کر کہنے لگی کہ حضور میری والدہ مجھ سے کچھ مالی امداد چاہنے کے لیے آئی ہے لیکن چونکہ
 وہ مشرک ہے اس لیے میں اسے وہیں چھوڑ کر دریافت کرنے آئی ہوں کہ میں کافرہ والدہ سے

حسن سلوک کر سکتی ہوں؟ ۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جلدی لوٹ جا اور اس کی حاجت روائی کر۔ یعنی حضور نے اسے یہ تعلیم دی کہ اسلام حسن سلوک کے راستے میں کفر و ایمان کی تفریق نہیں کرتا اور پھر والدین سے حسن سلوک کا درجہ تو عبادت الہی سے دوسرے درجہ پر ہے۔

قرآن حکیم کے چھیسویں پارے میں سورہ احقاف کے دوسرے رکوع میں والدین کے ساتھ احسان اور عمدہ سلوک کے ساتھ پیش آنے کی تاکید ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا. حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا
وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا. وَحَمَلُهُ، وَفِصْلُهُ، ثَلَاثُونَ شَهْرًا. حَتَّىٰ إِذَا
بَلَغَ أَشُدَّهُ، وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَ
إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ ۷

”اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی ہے۔ کیونکہ اس کی والدہ نے اسے تکلیف سے اٹھائے رکھا اور (بڑی) تکلیف سے جنا۔ اور اس کو اٹھائے رکھنے سے دودھ چھڑانے تک تیس مہینے ہوتے ہیں۔ پھر وہ (بڑھتا رہا) حتیٰ کہ وہ جوان ہو گیا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا۔ (اور احساس پختہ ہوا) تو اللہ تعالیٰ سے اس نعمت غیر مترقبہ کے متعلق دعا مانگنے لگا:

اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھے عطا فرمائی اور میرے والدین کو اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں نیک عمل کروں جسے تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد کی بھلائی عطا فرما۔ (اے پروردگار) میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں تیرے فرمانبردار بندوں میں ہوں۔“

اولاد پر اگرچہ احسان ماں باپ دونوں کا ہوتا ہے۔ لیکن آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں ماں کی تکلیفوں کا خاص طور پر ذکر آیا ہے۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ اس نے دریافت کیا اس کے بعد۔ آپؐ نے پھر یہی فرمایا کہ تیری ماں۔ تین دفعہ ماں کا ذکر کے فرمایا۔ اس کے بعد تیرا باپ ۸۔ غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماں کی شفقت اور قربانی کی بنا پر اس کا درجہ بیان کرنا چاہتے تھے۔

آپؐ کا ارشاد یہ بھی ہے کہ جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے ۹۔ یعنی تم ماں کی خدمت سے جنت کے حق دار ٹھہر سکتے ہو۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ باپ جنت کے دروازوں کا عمدہ ترین دروازہ ہے ۱۰۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ خدا کی رضامندی والد کی رضامندی میں اور خدا کی ناخوشی والد کی ناخوشی میں مضمر ہے ۱۱۔ جہاں اسلام زندگی میں والدین کی عزت اور محبت اور ادب و احترام کا سبق دیتا ہے وہاں ان کے مرنے کے بعد ان کے لیے مغفرت مانگنے کی تاکید کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا
كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۱۲۔

”ماں باپ سے نرمی اور عاجز سے پیش آؤ اور ان کے حق میں دعا کرتے رہو کہ انے میرے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم کچھو“۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعایوں مذکور ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۱۳۔

”اے ہمارے پروردگار جس دن اعمال کا حساب ہونے لگے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو بخش دے۔“

یہی ہم سب کی دعا ہونی چاہیے۔

(والدین کے آداب : تقریر ریڈیو پاکستان
ب عنوان قرآن حکیم اور ہماری زندگی)

حوالہ جات

لقمان ۱۲/	۱
الاسراء ۲۲-۲۳	۲
لقمان ۱۲-۱۳	۳
لقمان ۱۲/	۴
لقمان ۱۵/	۵
مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب البر، ۳/۶۷۳	۶
الاحقاف ۱۵/	۷
مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب البر، ۳/۶۷۳	۸
ایضاً	۹
مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب البر، ۳/۶۷۳	۱۰
ایضاً	۱۱
الاسراء ۲۳/	۱۲
ابراہیم ۴۱/	۱۳



اتحاد بین المسلمین

”وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا
تا کہ اسے دوسرے دینوں پر غالب کرے۔“ (القرآن سورۃ ۴۸)

مقام اسلام

رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دین حق دے کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ ایک ایسا
دین جس کو تمام ادیان عالم پر فوقیت و غلبہ حاصل کرنا تھا۔ اسی دین کی مقدس تعلیمات کی بنیاد پر
نبی کریم ﷺ نے ایک اعلیٰ اقدار کا حامل مثالی اسلامی معاشرہ قائم کر کے دکھایا جو اپنے مخصوص
ثقافتی اور تمدنی اصول رکھتا ہے۔ جس کے افراد باہمی ربط اور محبت، شفقت و رحمت اور کفر و
باطل کے مقابلے میں شدت و سختی کے اوصاف سے متصف تھے۔ اس مثالی معاشرے کے افراد
کا ایک مخصوص اصلاحی پروگرام ہے، ایک ممتاز فرض منصبی ہے جس کے چار بنیادی ستون ہیں۔
امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر۔ دعوت الی الخیر اور تفرقہ بازی سے اجتناب۔

تبلیغی اور غیر تبلیغی مذاہب

مذاہب عالم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تبلیغی مذاہب اور دوسرے غیر
تبلیغی مذاہب۔ غیر تبلیغی وہ مذاہب ہیں جو ایک خاص قوم اور نسل سے آگے بڑھنے کا دعویٰ نہیں
رکھتے اور نہ ان کے پیروکار اس کا پرچار کرتے ہیں جیسے یہود و ہنود، تبلیغی مذاہب وہ ہیں جن کے
اصول عالمگیر ہوں اور ان کے پیروکار تمام دنیا کو اس میں شامل کرنے کے لیے تبلیغی اور مشنری
سرگرمیاں عمل میں لاتے ہیں۔ اس وقت اسلام کے علاوہ دنیا میں دو اور مذاہب ہیں جو تبلیغی
ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں تبلیغی مذاہب میں شمار ہونے کا حق
نہیں رکھتے۔ ان میں ایک کے پاس تو مذہب و روحانیت کے کوئی جامع اصول ہی نہیں اور
دوسرے مذہب کے پیروکار اپنے ہادی کی اصل اور بنیادی تعلیمات سے انحراف کر کے اپنے

مذہب کو تبلیغی مذاہب میں شمار کرنے پر مصر ہیں۔ حالانکہ ان کے پاک ہادی نے اعلان کیا تھا کہ میں تو صرف بنی اسرائیل کے لیے آیا ہوں۔ ان کے پیروکار ہیں کہ ساری دنیا کو اپنے ہی مذہب میں شامل کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے آغاز کار میں ہی عالمگیر اصول پیش کیے اور ادیان عالم پر اپنی فوقیت اور غلبے کا اعلان کر دیا۔ اقصائے عالم میں تبلیغ حق کرنا اسی مذہب کے پیروؤں کا اہم ترین ملی فریضہ قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کی غفلت

لیکن آج عالم اسلام ایک افسوس ناک حالت سے دوچار ہے۔ یہ حق و صداقت کے عالمگیر اصول رکھنے والا دین حق چاروں طرف سے کفر و باطل میں گھرا ہوا ہے۔ وہ لوگ جو خاص مخاطبین کے لیے آئے تھے۔ وہ آج اپنے اپنے مذاہب کی تبلیغ میں دنیا بھر میں کوشاں نظر آتے ہیں مگر اسلام کے پیروکار غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کا احساس ہی نہیں۔ کتنے شرم کی بات کہ عالم انسانیت کفر و ظلمت کے طوفانوں میں گھرا ہوا ہے مگر دین حق کے پاسبان خاموش ہیں۔ ہم نے کتنے مبلغ یورپ اور امریکہ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجے ہیں۔ ہم نے افریقہ کے تاریک براعظم میں اسلام کی کتنی شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی ہے؟ ہمارے کتنے علمائے دین ہیں جو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ کر اسلام کی اشاعت کو تبلیغ کا فریضہ ادا کر رہے ہیں؟ ہم نے آج تک کتنے گمراہ انسانوں کو حق و ہدایت کی راہ پر لگایا اور کتنے انسانوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا ہے؟ کتنے مظلوم اور پریشان بندگان خدا کو ہم نے اسلام کی چار دیواری میں پناہ دی ہے۔ ہم نے اگر کچھ کیا تو صرف یہ کیا کہ جو لوگ حصار اسلام میں محفوظ ہیں انہیں اٹھا اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ ہم نے تکفیر بازی کی توپوں سے ملت اسلامیہ کے آہنی حصار میں جگہ جگہ شکاف پیدا کر دیے اور اپنے ہی بے رحم ہاتھوں سے اپنی ملت کے اعضاء کو کاٹ کاٹ کر الگ کرنا شروع کر دیا۔ ہم سے یہ تو نہ ہوسکا کہ باہر سے لوگوں کو بلا کر لاتے اور چمن اسلام کی رونق کو بڑھاتے لیکن جو پہلے موجود تھے انہیں دھکے دے دے کر باہر نکال دیا اور محمد عربی ﷺ کے مقدس کاشن کو ویران کر کے رکھ دیا۔

برادران اسلام آج ہم اپنے فرض منصبی سے کس قدر دور جا پڑے ہیں۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر دعوت الی الخیر اور تفرقہ بازی سے اجتناب امت مسلمہ کا طرہ امتیاز تھا۔ مگر آج ہم اس امتیازی شان سے محروم ہو چکے ہیں۔ آج ہم میں کوئی اس بات کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے کہ وہ اپنے فرض کو پورا کر رہا ہے۔ کیا کوٹ اور پتلون پہننے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں؟ کیا جبہ اور عمامہ زیب تن کرنے والی علماء کرام کی جماعت اپنے فرائض کو کما حقہ ادا کر رہی ہے؟ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ انگریزی خواں حضرات تو اسلام کو مولوی کے حوالے کر کے سبکدوش ہو گئے اور مولوی صاحبان تکفیر بازی اور اندرونی خلفشار میں الجھ کر رہ گئے۔ یہ حضرات بجائے اس کے کہ اس ہادی اعظم کی مقدس تعلیمات کو عام کرتے بے فائدہ بحثوں میں پڑ کر ایک دوسرے کا سر پھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کہیں بشریت رسول پر طبع آزمائی ہو رہی ہے۔ کہیں نور کی بحث کو لے کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ بات صاف ہے کہ جو لوگ محمد عربی ﷺ کو نور کہتے ہیں وہ نور کو دنیا کی ظلمت دور کرنے کے لیے کیوں نہیں پیش کرتے۔ یورپ، امریکہ اور افریقہ میں جا کر دین کی روشنی کیوں نہیں پھیلاتے۔ وہ حوصلہ شکن ظلمتوں پر نور محمدی کی شمعیں کیوں نہیں جلاتے۔ بشریت کی بحث میں الجھنے والے آج ظلم و طغیان اور دکھ درد کی ستائی ہوئی بشریت کو محمد عربی کی روشن سیرت کیوں نہیں سناتے۔ وہ انسانیت کو کیوں نہیں بتاتے کہ اس کی تمام تر مشکلات کا حل، اس کے تمام دکھوں کا مداوا اس محسن کل کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے میں ہے، پیغمبر اسلام انسانیت کو نور اور بشر کے جھگڑوں میں الجھانے کے لیے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ ظلمت و گمراہی اور کفر و فساد سے نجات دلانے کے لیے دنیا میں مبعوث ہوئے تھے اور آپ نے لوگوں کو اپنے رسول برحق ہونے پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی۔ آج دنیا کو پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی ضرورت ہے، اسے حلقہ بگوش اسلام کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غلامان محمد کو سرکار دو جہاں کی غلامی سے محروم کرنے کی!

اتحاد انسانیت اور اتحاد مسلمین

اتحاد انسانیت ہی اسلامی تعلیمات کا حقیقی منشا ہے، لیکن آج خود امت مسلمہ کو اتحاد و اتفاق کی شدید ضرورت ہے۔ آج ہم تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہے ہیں، عالم اسلام ظلم و کفر میں گھرا ہوا ہے۔ انسانیت پر جنگ کی تباہی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پاکستان

کی سرحدوں پر دشمن کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ اس خطہ زمین کے امن کو شدید خطرہ لاحق ہے اور ہم ہیں کہ ایک دوسرے کی تکفیر اور باہمی حسد و عناد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ یاد رکھیے کسی مسلمان کو کافر کہنا ہمیشہ حرام تھا، دل آزاری ہر زمانے میں گناہ عظیم تھی، مگر اس نازک موقع پر تو معاملہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ آج امت میں انتشار پیدا کرنے اور ملک کے شیرازے کو منتشر کرنے کی بجائے ملت اسلامیہ کے دلوں کو باہمی الفت و اخوت کے مضبوط رشتوں میں جوڑ کر بنیان مرصوص بنانے کی ضرورت ہے۔

ایک طرف تو یہ حال ہے کہ وطن عزیز کو جو شدید خطرات درپیش ہیں ان کے پیش نظر مرکزی کابینہ کے خصوصی اجلاس بلائے جا رہے ہیں۔ قومی اسمبلی کے ہنگامی اجلاس طلب کیے جا رہے ہیں اور صدر مملکت زعماء ملت سے صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف خدمت دین کے بعض داعی فروعیات میں الجھ کر رسول عربی ﷺ کی بھولی بھالی اور سادہ لوح امت کو انتشار و افتراق میں مبتلا کر رہے ہیں۔ مسلمان مسلمان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ گروہی سرگرمیوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔ مذہبی جلسوں میں ہلڑ بازی اور سر پھٹول ہو رہی ہے۔ یہ صورت حال کتنی افسوس ناک ہے، ملت کو متحد کرنے کا فریضہ تو حضرات علماء کرام کے سپرد تھا۔ اسلام کی حفاظت اور کفر کی یلغار کے لیے سینہ سپر ہونا تو محمد عربی ﷺ کے دینی وارثوں اور مسند نشینوں کا کام تھا۔ حضرات علماء کرام نے اس جنگل کی آگ کو بجھانے کی کوشش نہ کی تو ان کے دینی وقار کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور نئی نسل علماء سے متنفر ہو جائے گی اور یہ بات اسلام کے لیے ایک عظیم صدمے کا باعث ہو گی۔ کیونکہ علمائے دین ہی نے شمع دین کو روشن رکھنا ہے اور روشن رکھا ہے۔ انہوں نے اگر دیوار کی تحریر نہ پڑھی تو باعث برباد ہو جائے گی۔

تفرقہ بازی پر عذاب کی وعید

قرآن کریم نے جہاں ملت اسلامیہ کو ایک تبلیغی نظام اور اصلاحی پروگرام کے اصول دیئے ہیں وہاں یہ بھی حکم دیا کہ ”لا تکونوا کالذین تفرقوا“۔ سابقہ امتیں علم و ہدایت لینے کے بعد افتراق کا شکار ہو گئیں۔ ملت اسلامیہ کو پہلے دن ہی اللہ تعالیٰ نے متنبہ کر دیا

کہ تفریق و انتشار اس امت کا شیوہ نہیں اور یہی بیماری ہے جو گزشتہ اقوام کی موت و ہلاکت کا باعث ہوئی۔ تفرقہ بازی کا بازار گرم کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ”عذاب عظیم“ کی تہدید فرمائی ہے۔ یہ عذاب کفر و شرک یا بت پرستی پر نہیں بلکہ تفریق بین الامت کے جرم کی پاداش میں بیان ہوا ہے۔

برادران ملت! ہوش میں آئیے۔ آج ہم اسی طرح تفرقہ بازی کا شکار ہو رہے ہیں۔ جس طرح سابقہ انبیاء کی امتیں باہمی حسد و عناد اور بغض و رقابت کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ جی امت کے اختلاف کو رسول اللہ نے رحمت قرار دیا ہے لیکن کون سا اختلاف؟ یہی اختلاف جس کا شکار آج ہم ہیں؟ کیا یہ مخاصمت و عداوت ایک دوسرے کے خون کا پیا سا ہونا، اپنے بزرگوں کو کافر بنانا اور نفرت و حسد کی آگ کو ہوا دینا رحمت ہے یا زحمت ہے؟ اختلاف امت سے مراد یہ مخالفت اور دشمنی نہیں ہے۔ اس سے مراد تو وہ اختلاف رائے ہے جو ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور ابن حنبلؒ میں تھا لیکن وہ ایک دوسرے کو ملت اسلامیہ کے سچے خادم اور اپنے بھائی تصور کرتے تھے۔ وہ اس اختلاف کے باوجود بھی ایک دوسرے کا نام ”رحمۃ اللہ علیہ“ اور بڑے احترام و عقیدت سے لیتے تھے۔ اس اختلاف سے وہ اختلاف مراد ہے جس کی مثال امام محمد اور امام شافعی نے پیش کی تھی۔ امام محمد حضرت امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد تھے۔ مگر انہوں نے جب ایک مسئلے میں اپنے استاد کی رائے کو چھوڑ کر امام شافعی کی رائے پر فتویٰ دیا تو لوگوں نے کہا اے محمد! تو نے اپنے استاد کے مسلک سے انحراف کر کے امام شافعی کی رائے پر عمل کیوں کیا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ میں نے یہ رائے امام شافعی کے علم اور تفقہ فی الدین کے عظیم مرتبے کو دیکھ کر پسند کی ہے۔ اور امام شافعی نے جب ایک مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر عمل کیا تو لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا میں نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے زہد اور تقویٰ کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اتنے عظیم زہد و تقویٰ کا مالک انسان اپنی ذاتی رائے اور خواہش پر ہرگز نہیں چل سکتا۔ یہ ہے وہ اختلاف جسے رسول اکرم ﷺ نے رحمت قرار دیا تھا۔ اس سے مراد بزرگان سلف کی تکفیر اور بدنامی ہرگز نہیں۔ وہ سب اللہ کے نیک بندے تھے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق دین کی خدمت کر گئے۔ اب

ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ گڑے مردے اکھاڑ کر ان نیک روحوں کو ستانا چھوڑیے۔ حسد و عناد اور بغض و عداوت کی آگ کو الفت و محبت اور اتحاد و اتفاق کے پانی سے بجھائیں۔ فروغی اختلاف اور باہمی تکفیر بازی سے اجتناب کریں اور آج ملک و ملت کو جو خطرہ درپیش ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

ملت اور اکابر ملت سے اپیل

میں ملت اسلامیہ کے بھی خواہوں سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ اپنے فرض کو پہچانیے اور اختلاف و انتشار پیدا کرنے والے لوگوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر ان کی منت و سماجت کر کے پیغمبر اسلام کی ناموس کا واسطہ دے کر اور ملت کو پیش آمد شدید خطرات کا احساس دلا کر چپ کرانے کی کوشش کریں۔ آپ ہر اس آدمی کی بات سننے سے انکار کر دیں جو محمد عربی ﷺ کی امت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں علماء امت سے ملک و ملت کے نام پر درد مندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کا احساس کریں بے فائدہ بحثوں اور فضول جھگڑوں میں اپنے معتقدین کے وقت اور ملت اسلامیہ کی قوت کو ضائع نہ ہونے دیں۔ تعمیری کاموں کے لیے میدان میں نکلیں:

زائکہ و تکبیر رازِ بود تست

حفظ و نشر لا الہ مقصود تست

تا نخیزد بانگِ حق از عالے

گر مسلمانی نیا ساقی وے

دین حق کی تبلیغ و اشاعت کے اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ملت کو متحد اور منظم رکھنے کی تدبیر پر عمل پیرا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو انفرادی اور اجتماعی فریضوں کے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



خطبہ صدارت

خواتین و حضرات!

چوں نو بتے بہ ما شد آتش بجام کردند

صبح سے اتنی مفید باتیں سن چکا ہوں کہ کم از کم اتنا یقین ہے کہ جو گھر سے لے کر آیا تھا۔ اس سے متعلق تو دماغ صاف ہو گیا۔ آپ یہ ہے کہ یہاں پر اتنا مفید مواد حاصل ہوا کہ مجھے اگر آٹھ دن کی چھٹی دے دی جاتی تو میں آج کی کارروائی کی ایک اچھی رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا۔ یوں باتوں کو دہرا دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات فائدہ بھی ہوتا ہے کہ باتیں یاد رہ جاتی ہیں لیکن باتوں کو ساتھ ساتھ سمیٹتے چلے جانا چاہیے۔ اس وقت ہم جن گروہی بحثوں سے بحث کر رہے ہیں، وہ دو تھیں۔ نظریہ پاکستان کے استحکام میں کن عوامل سے مدد مل سکتی ہے؟ نظریہ پاکستان کے حامیوں کو کن خطرات کا سد باب کرنا چاہیے؟ نظریہ پاکستان پر پروفیسر اشتیاق حسین قریشی کی کل کی تقریر اتنی واضح، اتنی دلکش اور اتنی دلفریب تھی کہ میرے خیال میں نظریہ پاکستان کے متعلق اس کے بعد کوئی شکوک باقی نہ رہنے چاہئیں تھے اور نہ رہے ہوں گے لیکن چونکہ بحث نظریہ پاکستان ہی کی کرنی ہے، اس واسطے پہلے سمجھنا چاہتا ہوں کہ یہ پاکستان تو ایک چیز ہوئی، اس کا جغرافیہ نقشے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظریہ پاکستان کیا چیز ہے؟ میں خود سوال کر رہا ہوں، اس واسطے کہ ہر روز سوال کیا جاتا ہے اور ہر بار جواب دینے میں کچھ اپنے ہاں بھی تبدیلی ہوتی ہے، کچھ دوسرے کے سوال میں بھی تبدیلی ہوتی ہے لیکن اس وقت تک تیقن سے ہم صحیح منزل تک نہیں پہنچے کہ نظریہ پاکستان کیا ہے؟ ہمارے فکر کی رفتار اس کشتی کی طرح ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا تھا کہ

وہ کشتی ہی کیا جو کسی کے سہارے چلے اور وہ بھی کنارے کنارے

ہواؤں کی تندی سے کشتی کی منزل کبھی اس کنارے کبھی اس کنارے

ہم نے آج تک اپنے تجربات کبھی اس کنارے، کبھی اس کنارے کی صورت میں ہی

حاصل کیے ہیں۔ تعلیمی بحثیں اور پاکستان ایک سیاسی بات ہے۔ نظریہ پاکستان سب سیاستوں کی جڑ ہے، بنیاد ہے، احساس ہے اور میں آپ کی اجازت سے (اگرچہ میں پہلے وضاحت کر دوں کہ تادیر آپ کو نہیں روکے رکھوں گا) نظریہ پاکستان کی تاریخ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا میں مختلف مذاہب ہیں اور ان مذاہب میں بعض کو الہامی ہونے کا دعویٰ ہے۔ بعض حقیقی طور پر الہامی کتابیں بھی رکھتے ہیں اگرچہ ان کی صورتیں انہوں نے مسخ کی ہوئی ہیں۔ ان تمام مذاہب میں سے کسی مذہب نے وہ دعاوی پیش نہیں کیے، جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔ ہم جس وقت لفظ ”اسلام“ استعمال کرتے ہیں، تو دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک تو مسلمانوں کا یہ تصور کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلام ہی کی دنیا میں تبلیغ ہوئی اور انبیاء علیہم السلام اسلام سکھاتے رہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے جس وقت نسل انسانی ایک مکمل، مضبوط، مجموعی حیثیت سے نظریات دینی کو قبول کر سکتی تھی، اس وقت اسلام نے آ کر خدائی ہدایت کا ایک مکمل مجموعہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کی تفصیل تو بڑی لمبی ہو سکتی ہے لیکن اختصار سے تقابل ادیان کے ایک طالب علم اور ایک حقیر سے طالب علم کی حیثیت سے اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے مذہب نے نہ آخری ہونے کا دعویٰ کیا ہے، نہ جامع ہونے کا دعویٰ کیا ہے، نہ مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے، نہ عالمی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں تمام مذاہب کی تاریخ کو چیلنج کر رہا ہوں، خطرے میں کھڑا ہوں لیکن اگر وقت ہوتا تو اس کی مثالیں بھی آپ کے سامنے پیش کر دیتا کہ آج دنیا کی تاریخ میں، مذاہب کی تاریخ میں صرف ایک ہی مذہب ہے، جو اپنی اصل پر قائم ہے، جو پوری زندگی پر حاوی ہے، جو زمان و مکان کی قیود پر غالب ہے، جو تمام نسل انسانی کے لیے ہے، جو تمام زمانوں کے واسطے ہے، جو دنیا کی ہدایت کی آخری سرحد ہے۔ یہ میں نے اس لیے دہرایا ہے کہ جو قوم جس طرح کا نظریہ رکھتی ہے، اس کے اعمال اسی طرح کے نظریے پر مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی قوم نے ایک چھوٹی سی وادی کو آباد کرنا ہی اپنے پیش نظر رکھا ہو تو اس کے کاروبار، اس کے فکر کا انداز، اس کے فعل کی صورتیں تمام کی تمام محدود ہوں گی۔ اگر کسی نے شہر بسانے کا ارادہ کیا ہو تو وہ اور طرح کے وسائل و ذرائع استعمال کرے گا۔ اگر کسی نے شہروں

کے انتظام سے ملکوں کے انتظام تک جانا ہو تو اس کے لیے ظاہر ہے کہ تیاری کی صورت بھی اور ہو گی، اصول بھی اور ہوں گے، انتظام بھی اور ہوگا، انتظام کا اہتمام کرنے والے گر بھی اور ہوں گے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے، جو تمام نسل انسانی کو مخاطب کر سکے اور صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جو تمام نسل انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے ”یا ایہا الناس“ کہتا ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں ”O Humanity-O Mankind“ کیا جاسکتا ہے۔ ”اے فرد نسل انسانی! یعنی بار بار افراد نسل انسانی کو مخاطب کرنے والا مذہب اور ہے اور چند افراد کے ایک مجموعے نسلی یا قومی یا جغرافیائی یا تاریخی حصے کو مخاطب کرنے والا مذہب اور ہے۔ اسلام یہ احساس برتری پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے ہدایت کا آخری نسخہ، ہدایت کا مکمل اور دائمی نسخہ لے کر آیا ہے۔ اصل میں نظریہ پاکستان اس تصور پر مبنی ہے کہ اسلام دوسرے ادیان کے برابر بھی نہیں کھڑا کیا جاسکتا، اس میں بھی اس کے مقام کی توہین ہے۔ یہ ان کے مساوی بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اس میں اس کے مقام کی ناقدر شناسی ہے۔ اس کو ماننا پڑے گا اور دنیا کو منوانا پڑے گا کہ یہ دنیا کی آخری دولت ہے، ہمہ گیر دولت ہے، جہاں گیر دولت ہے، عالمگیر دولت ہے۔ اس تصور سے، مسلمان بدویہ تصور لے کر کہ میں دنیا پر چھا جانے والا ہوں، اپنی سند اپنی بغل میں دبا کر کہ

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف

وتنہون عن المنکر

کہ جو قومیں اٹھائی گئیں، ان میں تم بہترین قوم ہو۔ تم دنیا کو بھلائی سکھاؤ گے۔ تم نیکی کا حکم دو گے۔ برائی سے روکو گے۔ تم بھلائی دنیا میں پھیلایا کرو گے۔

یہ پیغام، یہ نسخہ، یہ سند کسی دوسرے کے استناد کے سامان میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے بجا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اس دنیا میں رہتے ہوئے، چلتے پھرتے انسانوں کے ساتھ چلتے پھرتے ہوئے انسان کی حیثیت سے اگر دوسروں سے مختلف سمجھے تو اس کے درست اور Justified ہونے کی دلیل میں نے پہلے پیش کر دی ہے۔ نہ کسی کو حتمیت اور آخریت کا دعویٰ ہے، نہ کسی کے پاس آخری سامان ہے، نہ کسی کے پاس لایا ہوا سامان ہدایت محفوظ ہے اور پھر

اس سامان ہدایت سے نتیجہ کیا ہے؟

نتیجہ یہاں پیش کیا گیا:

اولئک علی ہدی من ربہم و اولئک ہم المفلحون۔ ۲

یہ لوگ جو اس طرح خدائے بزرگ و برتر کو مانتے ہیں، وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور وہی فلاح پانے والوں سے ہیں۔

دنیا میں حاجت، دنیا میں محتاجی، دنیا میں نقائص، دنیا میں قصور، دنیا میں غلطیاں، دنیا میں لغزشیں رہ جائیں گی، اگر پرانے نصابوں کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اس لیے ایک ہی نصاب ایسا ہو سکتا ہے، جو تمام عالم کو مخاطب کرے اور وہ نصاب اسلام ہے۔ اب اس اسلام کو لے کر مسلمان کبھی اونٹوں پر، کبھی پیدل، کبھی گھوڑے پر سوار، کبھی سیاح کی صورت میں، کبھی تاجر کی صورت میں، کبھی صوفی کی صورت میں، کبھی مجاہد کی صورت میں دنیا میں پھیلتا رہا ہے اور آواز ایک ہی تھی کہ آؤ اس چیز کی طرف، جو تم سب کے واسطے سامان ہدایت ہے۔ یہ کرنے والا مسلمان وہ تھا جس کی بدولت آج دنیا میں ہماری ایک وسیع تعداد موجود ہے۔ اگرچہ وسیع تعداد کے متعلق بھی غالباً ایک سیمینار کرانے کی ضرورت ہے کہ انگریز جب لکھتا ہے، مسلمان کو ۲۵ کروڑ لکھتا ہے اور مسلمان جب تقریر کرتا ہے (مجھے بھی پچاس سال ہو گئے سنتے ہوئے) ۴۰ کروڑ ہی کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ۸۰ کروڑ کے برابر دنیا کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ ۸۰ کروڑ مسلمان دنیا میں صرف اس احساس بہتری کا نتیجہ ہے، اس احساس برتری کا نتیجہ ہے کہ میرے پاس اچھی چیزیں ہیں۔ ان اچھی چیزوں کو خود بھی اختیار کرنا چاہیے اور دوسروں تک بھی پہنچانا چاہیے۔

زاں کہ در تقدیر رازے بود تست

حفظ و نشر لا الہ مقصود تست

(اللہ کے نام کو بلند کرنا ہی تیری زندگی ہے اور لا الہ الا اللہ کی حفاظت

اور نشر و اشاعت کرنا ہی تیری زندگی کا مقصد ہے)

پس مسلمانوں کو علامہ اقبال کہتے ہیں کہ:

تانا خیزد بانگ حق از عالے
گر مسلمانی نیاسائی دے

(جب تک کہ دنیا کے، کائنات کے ذرے ذرے سے حق کی آواز بلند

نہ ہو جائے۔ اگر تم مسلمان ہو، تو ایک لمحہ بھی آرام سے نہ بیٹھنا)

یہ وہ تڑپ تھی جو مسلمان کے ساتھ چلتی تھی یا مسلمان آگے بڑھتا چلا جاتا تھا یا اگر کہیں رکتا تھا تو یہ تڑپ اس کو بلند و بالا رکھتی تھی۔ یہ تڑپ آ کے ہندوستان کے امتزاج حق و باطل میں کمزور ہو گئی۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستان کے اندر ایک ایسی تہذیب و تمدن موجود ہے جس نے مگر مچھ کی طرح منہ کھولا ہوا تھا، تہذیبوں کو کھانے کے واسطے۔ ان کے نزدیک انسانیت کی تقسیم یہ تھی کہ اس نسل کے لوگ شریف اور باقی تمام کے تمام پلید اور اچھوت ہیں وہ پلیدوں اور اچھوتوں کو ختم کر دیتے تھے، ستیاناس کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر مونجے دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے بیسیوں تہذیبوں کو ہضم کیا ہے لیکن ایک تمدن جو ان سے ہضم نہ ہو سکا تھا، تاریخ ہند کے اندر وہ اسلام کا تمدن اور اسلام کی تہذیب تھی۔ بھائی پرمانند نے لکھا تھا کہ ہندو کی تعریف یہ ہے کہ جو شخص بھارت میں رہے اور ہندو کہلانے کے لیے تیار ہو جائے، وہ ہندو ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں پوچھیں گے کہ وہ ایک خدا کو مانتا ہے ۱۰ کو مانتا ہے ۳۰ کو مانتا ہے یا ۳۳ کروڑ کو مانتا ہے یا نہیں مانتا، یہ ہم نہیں پوچھیں گے۔ ہمارے نزدیک ہندو وہ ہے جو ہندوستان میں رہے۔ بھارت دیش میں رہے اور ہندو کہلائے۔ میں اب اس دوست، جس نے سوال کیا تھا کہ کیا فرق تھا ان دونوں میں اور دو قوموں کا نظریہ کس طرح چلا تھا؟ ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام جب ہندوستان میں آیا کسی اور جگہ گیا، وہیں یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہو جاتے رہے۔ ایک نظریہ اسلام کا اپنا ہوتا ہے، جسے مسلمان پلے باندھ کر چلتا تھا۔ اس کو اپنی دنیا اور آخرت کا کفیل سمجھتا تھا اور پھر اس کے مقابلے میں وہ نظریات ہوتے تھے، جو پہلے سے وہاں پر رائج ہوتے تھے۔ مسلمان کو سکھایا یہ گیا تھا کہ:

”ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة

وجادلہم بالتی ہی احسن“

تیرا کام دنیا میں پھرنا ہے، تو پکارتا چلا جا انسانوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف۔ حکمت سے، دانائی سے، دانش سے، فلسفے سے دوسروں کو دعوت دیتا چلا جا اور ان کو ساتھ ملاتا چلا جا۔ اور میٹھی میٹھی نصیحتیں بھی کر اور پیاری پیاری باتیں بھی سنا۔ ان کی زندگیوں کو سنوار۔ اس طرح ان کو اپنے ساتھ ملاتا چلا جا۔ اگر مقابلہ ہی آ پڑے۔ مجادلے کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر احسن طریق پر ان سے مجادلہ کر۔ ایسے طریق پر گفتگو کر کہ تیری گفتگو ان کے سینے میں گھر کر لے۔

یہ طریق تبلیغ سیکھ کر مسلمان دنیا میں آیا۔ ادھر ادھر پھرا، ہندوستان میں بھی آیا۔ ہندوستان میں ایک بڑی سخت قوم کے ساتھ اس کی مڈ بھٹڑ ہوئی۔ اس قوم کا تصور یہ تھا کہ انسان تو تین طرح کے ہیں۔

- ایک برہما دیوتا کے منہ سے نکلے ہوئے برہمن
- ایک برہما دیوتا کے بازوؤں سے نکلے ہوئے کھشتری
- اور ایک برہما دیوتا کی رانوں سے نکلے ہوئے ویش

اور تیسری شق پر اپنے نظام کو ختم کر دیا۔ باقی جو کچھ بھی تھا، وہ برہما دیوتا کے پاؤں کے نیچے کی میل تھی۔ اب اس قوم سے اسلام کو یہاں واسطہ پڑا۔ وہ اسلام جو خدائے بزرگ و برتر کی ساری مخلوق کو ”یا ایہا الناس“ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس اسلام کو یہاں پر ایک ایسی تہذیب و تمدن کے ساتھ ٹکرائی پڑی، جس کے اندر انسانیت کو گرایا جاتا تھا (Untouchable) اچھوت ہی نہیں تھے ان کے ہاں کے لفظ بلکہ Unlookable بھی ان میں تھے۔ نہ صرف وہ لوگ موجود تھے جن کو چھوا نہیں جاسکتا تھا بلکہ وہ لوگ بھی تھے، جنہیں دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ اونچی جاتی والے دیکھتے نہیں تھے۔ قریبی زمانے تک جنوبی ہند کے اندر کھلے بازاروں کے ساتھ دونوں طرف جو مکان ہوتے ان کے پیچھے تنگ گلیاں ہوتیں، جن کے اندر وہ بد بخت اور منحوس انسان، اس زمانے کی نحوست سے آلودہ چلتے تھے اور ہاتھ میں ایک گھنٹی لے کر چلا کرتے تھے تاکہ ان کی آواز سے اونچی جاتی والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی ایسا آ رہا ہے، جس کو میں نے

دیکھنا نہیں۔ ایک طرف وہ مسلمان جس کو چار ڈانگ عالم میں خدا کا نام پھیلانے اور انسانیت کی برتری، انسانیت کی یکسانیت اور انسانیت کی مساوات اور اخوت سکھانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے مقابلے پر یہاں پر یہ قوم تھی جس کی ایک عرصے تک رگڑ رہی۔ یہاں پر ہم نے وہ دریادل اکبر اعظم بھی پیدا کیے، جنہوں نے اس رگڑ کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن کیا ذکر کروں کہ باوجود ایک ہندو رانی کے راجہ ہونے کے، اچھوت کے اچھوت ہی رہے۔ کھانا ان کے ساتھ نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ وہ تمدن تھا کہ جس تمدن نے پھر آ کر ہمارے رگ وریشے پر اثر کرنا شروع کیا اور اقبالؒ کہتے ہیں کہ اس کا آخری نتیجہ یہ ہو گیا کہ

”خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ“

مسلمان جو خالص سونا تھا، وہ یہاں آ کر مٹی میں ملا۔ اس نے دوسرے کا رنگ اختیار کرنا چاہا اور اپنے رنگ کو بگاڑنا چاہا۔ میں اب اختصار کے ساتھ اس بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے نتیجے میں ہر دور میں بزرگ پیدا ہوتے رہے، جو یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ اپنی فلاسفی آف لائف یا فلسفہ زندگی، اپنی آئیڈیالوجی کو عمل میں لائے اور دوسروں تک پہنچائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اسی کام کے لیے مامور ہوئے اور انہوں نے مسلمان قوم کے تشخص اور مسلمان قوم کی علیحدہ شخصیت کا سبق دیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں مدغم ہو جانے سے بچانے کی تحریک جاری کی۔ یہ تحریک ہندوستان میں عام ہوئی۔ باوجود اس کے کہ بادشاہ کفر کے ساتھ جوڑ جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوششیں، علما کی، اولیا کی، صوفیا کی یہ کوششیں اس چیز کی طرف لے گئیں کہ مسلمان اپنے قدموں پر کھڑا رہے اور اپنے آپ کو قائم رکھ سکے۔ اسی کوشش میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی مسلمان کو یہ بتایا کہ تو ان میں کا نہیں، تو ان میں مل کر بگڑنے کے لیے نہیں آیا ہوا بلکہ تجھے ان کو سنوارنا تھا تیرے ذمے ان کا سنوارنا تھا۔ تیرا بگاڑ تیری انتہائی غفلت اور لغزش کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد پھر تاریخ نے اور بہت سے لوگ دیکھے تا آں کہ سرسید احمد اسی آواز کو لے کر اٹھے کہ اے مسلمان تو طائرِ سدرہ نشین ہے۔ تیرا مقام یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ مل کر اس طرح کمین ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی مسلمانوں کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا سبق دیا۔ دارالعلوم

دیوبند میں، اور نگ آباد میں، دینی رنگ میں یہی سبق دیا گیا کہ مسلمان کو مسلمان بنایا جائے تاکہ اپنی اصلیت پر قائم ہو کر دنیا میں نتیجہ خیز ہو سکے۔ میں اس ”نتیجہ خیز“ لفظ پر آپ کو لانا چاہتا تھا کہ مسلمان ملکوں کا بھوکا نہیں تھا بلکہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی صداقت اور خدا کی طرف سے پہنچے ہوئے حق کو وہ چاہتا تھا کہ دنیا کے اندر عام ہو جائے اور خدا نے اس کو تسکین کے طور پر کہا تھا:

”ولا تهنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان كنتم مؤمنين“

(کہ تم غم نہ کرو۔ کم ہو تو پرواہ نہیں ہے۔ پریشان نہ ہو جاؤ۔ سست نہ

پڑو۔ تم ہی غالب آؤ گے، اگر تم مومن ہو)

اب ”مومن“ کیا ہے؟ مومن ایمان سے ہے اور ایمان علم، یقین اور ارادے کی مجموعی کیفیت کو کہا جاتا ہے۔ مومن وہ ہوتا ہے جسے اسلام کا یقین ہو، اس کی درستی کا یقین ہو اور اس کے مطابق چلنے کا ارادہ ہو، اسے مومن کہا جاتا ہے۔ یہ تعریف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ہے کہ ایمان علم یقین اور ارادے کی مجموعی کیفیت ہے۔ آج ہم ایمان کے اس حصے میں ہیں جس کا تعلق علم اور یقین سے ہے اور اس حصے کو ہم نے درست کر لیا تو ہم اپنے ارادوں کو بھی درست کر لیں گے۔ مسلمان کی فضیلت دنیا میں اس چیز میں نہیں کہ یہ زیادہ اچھے کھانے کھاتا ہے یا کھانوں کے نام گنوا سکتا ہے یا اچھے کپڑے پہنتا ہے، طمطراق دکھاتا ہے، تزک و احتشام دکھاتا ہے نہیں بلکہ مسلمان خدا کا ہر کارہ ہے اور اس کا ایک پیغام لے کر دنیا کے اندر پھرتا رہتا ہے جب تک کہ:

تا نہ خیزد بانگ حق از عالے

گر مسلمانی نیاسائی دے

(جب تک کائنات کے ذرے ذرے کو مسلمان نہیں کر لو گے، اس وقت

تک تمہیں بیٹھنا نہیں چاہیے۔ اگر بیٹھ گئے تو تمہارے اسلام میں

کمزوری ہے)

چنانچہ پاکستان جس وقت بنایا گیا تھا تو پاکستان کوئی ملک یا زمین یا جغرافیہ یا تاریخ کا کوئی ورق کاٹ کر علیحدہ کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ جس طرح علامہ اقبالؒ نے ڈاکٹر نکلسن کو کہا

تھا۔ جب انہوں نے کہا کہ آپ نے مخاطب مسلمانوں کو کیا ہے اور قدریں عالمی پیش کرتے ہیں Universal Values پیش کرتے ہیں اور مخاطب ایک محدود جماعت کو کرتے ہیں تو حضرت علامہ اقبالؒ نے ان کے خط کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ میں اسلام کی جوازلی، ابدی، عالمی، دائمی قدریں ہیں، ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہوں لیکن مسلمان کو اس لیے مخاطب کرتا ہوں کہ دنیا میں مجھے ایک یہی قوم اپنی روایات کے لحاظ سے ایسی دکھائی دیتی ہے، جو ان عالمی قدروں کو اپنا سکے، انہیں سنبھال سکے، انہیں عمل میں لاسکے اور انہیں دنیا تک پہنچا سکے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے اس خط کے اس حصے سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان دنیا کے اندر جوع الارضی کا شکار نہیں ہے۔ اسے زمین کی بھوک نہیں بلکہ یہ ایک پیغام رساں ہے، ایک پیغامبر ہے۔ اس پیغام کو لے کر یہ دنیا میں چلتا پھرتا رہتا ہے اور دنیا کی قوتوں کو جگاتا رہتا ہے تاکہ وہ نیکی پر آسکیں، بھلائی اختیار کرسکیں، برائی سے بچ سکیں۔ یہ کام ہمارے بڑوں نے کیا لیکن ہندوستان سے باہر۔ یہ کام ہمارے بڑوں نے ہندوستان میں بھی کیا لیکن بقدر واجب اکثر بادشاہت اور سلطنت کی طرف توجہ رہی۔ نتیجہ اس کا یہ رہا کہ اسلام کی جو Values تھیں جو Moral یا روحانی قدریں تھیں، جن کی بنا پر اسلام آگے چلتا تھا، یہاں پر ٹھنڈی ہونے لگیں۔ جس وقت اس چیز کو ہمارے بزرگوں نے دیکھا کہ سلطنت بھی چلی گئی اور دینی روایات کی حمیت اور اس کی حمایت، یہ دونوں ہی چلی گئیں تو پھر حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا کہ:

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
(دو صدیوں کی غلامی سے ان کا دل ٹوٹ گیا۔ ان میں وہ امنگ نہیں
رہی کہ ہم اونچے ہیں، ہم اونچے ہونے والے ہیں، ہم دوسروں کو اونچا
کر سکتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی محبوب ملت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب کی
امت ہیں)

”اور سل را ختم وما اقوام را“

(وہ رسولوں میں خاتم المرسلین اور ہم اقوام میں خاتم الاقوام ہیں)

ہم دنیا کے اندر آخری بڑی قوم ہیں، جس کو دنیا میں ہدایت کے لیے پیش کیا گیا۔ علامہ اقبالؒ نے شعر میں تو یوں کہا لیکن ان کی پریشاں نظری کا دارو یہ سوچا کہ کچھ عرصہ ان کو ان سے علیحدہ کر دیا جائے، جو ان کی خرابی کا باعث ہو رہے ہیں۔ صحبت زاع کو شاہیں بچے سے علیحدہ کیا جائے اور شاہیں بچے کو صحبت زاع سے علیحدہ کیا جائے۔ اس کو کہا جاتا ہے ”پاکستان“۔ پاکستان نہ نوکریوں کے واسطے تھا، نہ پاکستان اقتصادی بد حالی کے دور کرنے کے واسطے تھا، نہ پاکستان ہماری غربت کے علاج کے طور پر پیش ہو رہا تھا۔ حقیقت میں پاکستان کا اعلیٰ ترین مقصد تو اسلام کو دنیا میں عمل میں لا کر دکھانا تھا۔ باقی چیزیں جو تھیں وہ جس طرح تنخواہ کے ساتھ TA/DA مل جاتا ہے وہ تو مسلمان کی TA/DA میں باقی کی چیزیں آجایا کرتی ہیں۔ مسلمان کو یہاں پر بلند کرنے کے واسطے کہ یہ اپنی شان دکھاسکے اور دنیا کے سامنے اس رونق کو دوبالا کر دے، جو رونق کہ اسلام کی تھی تاکہ دنیا والے ادھر آئیں۔ اس کے واسطے حضرت قائد اعظم نے فرمایا کہ:

Pakistan is going to be a laboratory for experimenting Islamic values.

(پاکستان ایک لیبارٹری یا معمل بننے والا ہے، اسلامی قدروں کے دوبارہ تجربہ کرنے کا)

اب یہاں پر سے پاکستان کی تاریخ شروع ہوتی ہے اور جس کی تعریف کل سے آپ سنتے رہے ہیں۔ ہم کہاں پر ہیں، ہماری لیبارٹری کہاں ہے، ہمارے Experiments کہاں ہیں اور ہمارے تجربوں کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ حاصل کرنا، دوبارہ حاصل کرنا گویا کہ چوروں کی طرح گھر میں گھستے ہیں، ڈرتے ہوئے گھستے ہیں، اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور راستہ نہیں ملتا اور اسلام صحیح راستہ دیتا ہے، صحیح روشنی دیتا ہے لیکن افسوس کہ اس کی روشنی اس وقت اس کے اپنے ماننے والوں کو بجائے راستہ دکھانے کے چندھیار ہی ہے۔ اگر ہم نظریہ پاکستان کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ایک لفظ میں کہہ سکتا ہوں کہ ”فوقیت اسلام“ نظریہ پاکستان ہے۔

اس ملک کے اندر آپ فکر میں، عمل میں، تجارت میں، زراعت میں، سیاست میں،

تہذیب میں، تمدن میں، نظام مملکت میں، نظام دین داری میں اگر اسلام کی برتری اور اسلام کی فوقیت کو مسلم کرا دیں، تو پاکستان بن جاتا ہے ورنہ نام رکھنے کو تو بڑے بڑے نام رکھ لیے جاتے ہیں۔ بچارے کا قد ساڑھے تین فٹ ہوتا ہے تو وہ سر بلند خاں نام رکھ لیتا ہے۔ کوئی اسے روک تو نہیں سکتا۔ اگر آپ پاکستان میں پاکستان کے نام سے غلط مال بیچنا چاہیں تو دکان کچھ دن تو چلے گی لیکن معلوم ہوگا کہ یا آپ نے دھوکا کیا یا دوسرے نے دھوکا کھایا۔

تو میں اپنی گزارشات کو جو زیادہ طور پر جذباتی تھیں ختم کرتا ہوں اور ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے خیالات کو سننے کے بعد میرے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے، جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکا ہوں۔ میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور وہ ٹیکسٹ بک بورڈ کی اتھارٹیز کی خدمت میں نہایت ہی احترام کے ساتھ کہ جہاں وہ اتنے مفید کام کر رہے ہیں ان کو ایک ”اسلامک ریسرچ سیل“ یقیناً بنانا چاہیے اور فوری طور پر بنانا چاہیے اور کتابوں کا محاسبہ زبان کے اعتبار سے، طرز پیشکش کے اعتبار سے، نفس مضمون کے اعتبار سے، ہر طرح اپنی کتابوں کا بھی محاسبہ وہ کر رہے ہیں، کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ باہر سے آنے والی کتابوں کا بھی محاسبہ کیا جائے تاکہ ملک کو ایسی غذا نہ ملے جو ہمیں زندگی کی بجائے موت کے گھاٹ اتار دے۔

حوالہ جات

۱	آل عمران/۱۱۰
۲	البقرہ/۵
۳	النحل/۱۲۵
۴	آل عمران/۱۳۹

پیش لفظ

چوہدری محمد یوسف کی کتاب مفسر قرآن
(سوانح حیات شیخ التفسیر مولانا احمد علی
لاہوری کے لیے یہ پیش لفظ تحریر فرمایا)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبال)

خدام الدین و مخدومان ملت کا ایک روحانی قافلہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزشتہ چند برسوں میں جہان فانی سے نکل کر راہی ملک بقاء ہو گیا۔ عظمت کا ایک دور تھا جسے آنکھیں پھر نہ دیکھ سکیں گی۔ اس مقدس کاروان میں مفسر، محدث، فقیہ، اولیاء، اصفیاء سب ہی شامل تھے۔ ان میں شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری اس لیے خصوصاً قابل ذکر ہیں کہ ماضی قریب میں اس سرچشمہ فیض سے سیراب ہونے والوں کی وسیع تعداد اطراف و اکناف عالم میں پھیلی ہے، خدمت قرآن حکیم کے اعتبار سے اس زمانے میں شاید ہی کسی بزرگ نے اتنی شہرت پائی ہو۔ پاکستان و ہندوستان سے باہر افریقہ، مشرق وسطیٰ، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں خود اس احقر کو ان افراد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جنہیں اس چشمہ فیض قرآن سے فیض یاب ہونے کی عزت ملی، بلکہ بعض اوقات اس ذرے کو راقم الحروف کو اس آفتاب سے جو تعلق تھا، وہ باہر کے ممالک میں بھی باعث صد عزت و احترام بنی۔ استاذی کی شہرت علم و عمل اقتضائے عالم میں پھیلی ہے۔

محمد یوسف چوہدری ایم، اے نے ”خدام الدین“ میں ایک مفسر قرآن کے عنوان سے مرحوم کے سوانح حیات سے متعلق ایک سلسلہ مضامین شائع کیا تھا، اب ان کا ارادہ ان کو

کتابی صورت میں شائع کرنے کا ہے۔ اگرچہ ان مضامین کا تاریخی پہلو قدرے تشنہ ہے تاہم بہت مفید معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ مصنف موصوف نے اس سیاہ کار کو چند حروف بطور پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ مرحوم کا جو عظیم احسان اس حقیر کی گردن پر ہے۔ اس کے پیش نظر باوجود عدم فرصت قلم اٹھانے کا وعدہ کیا اگرچہ تعمیل میں خاصی تاخیر ہو گئی۔

مولانا مرحوم نے نصف صدی سے زیادہ کتاب و سنت کی شاندار علمی خدمت انجام دی۔ درس قرآن حکیم، درس مشکوٰۃ شریف و درس حجۃ اللہ البالغہ ان کی تدریسی خصوصیات میں مشمول تھے۔ علماء و صلحا، ماہرین و متخصصین، طالبان شریعت اور مشتاقان طریقت غرض ہر ذوق کے تشنگان علم و دین کو حسب مدارج فہم، قرآن حکیم کے معارف سے آشنا کرنا ان کا خاص کمال تھا۔ مغربی علوم کے دلدادگان کو علوم قرآنی کا عاشق بنادینا ان کی کرامت تھی۔ عوام کے دلوں میں قرآن کے ساتھ ایک والہانہ وابستگی پیدا کر دینا۔ ان کی دلنواز شفقت و محبت کا اعجاز تھا۔

مصنف کتاب کا شوق و ہمت قابل داد ہیں۔ سوانح حضرت شیخ التفسیر کے علاوہ زور قلم نے بہت سے علمی معارف بھی اس سلسلے میں منسلک کر دیے ہیں جو ارباب ذوق کے لیے بہت مفید ہوں گے۔ حضرت شیخ التفسیر کی پاکیزہ زندگی میں جذبہ خدمت دین و شوق حریت کا ایک حسین امتزاج تھا۔ جس نے ایک بے پناہ قوت عمل کی حیثیت سے ہزاروں مردہ دلوں کو شگفتگی عطا کی۔ اس چراغ روحانیت نے لاکھوں چراغ روشن کر دیے۔ اس روشنی کی جھلکیاں آپ کو اس کتاب ”ایک مفسر قرآن“ میں ہی ملیں گی۔

اے قدوس حق نواز! جس طرح مرحوم نے قرآن حکیم کے ختم نہ ہو سکنے والے انوار و معارف کو تیرے بندوں میں عام کرنے کی کوشش کی۔ تو بھی ان پر اپنی رحمتوں کی ہمیشہ جاری رہنے والی بارش برسا۔ الہ العالمین! ان کے جاری کردہ فیض کو ہمیشہ جاری رکھ اور ان کے جانشینوں اور نام لیوا مصنف کتاب کو توفیق خدمت اسلام پیش از پیش بخش! آمین۔



مکاتیب علامہ علاء الدین صدیقی بنام منشی عبدالرحمن خان

یونیورسٹی ہال، لاہور

مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۸ء

مکرم و محترم جناب منشی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

طالب خیریت بخیریت، آپ کا عتاب نامہ موصول ہوا۔ آپ حق بجانب اور بندہ
قصور وار اور معذرت خواہ۔ نظیری کا شعر یاد آتا ہے

تا منفعل زرنخش بے جانہ ہمیش

مے آرم اعتراف گناہ بنودہرا

اگر میرا وہ عریضہ آپ کو مل گیا ہوتا جو میں نے ملتان سے واپسی پر آپ کی مسافر نوازی
کے شکریہ کے طور پر لکھا تھا تو غالباً خطاب اتنا تلخ نہ ہوتا۔ میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مکمل
سیٹ اپنی تصنیفات کا مجھے تحفہ عنایت فرمایا تھا۔ میں یوم اقبال کی دو تین تقریبوں میں طویل
تقریروں کے ارتکاب کی سزا میں ایسا شدید بیمار ہوا کہ آج تک طبیعت پوری طرح نہ سنبھلی۔

یاران فراموش کردند عشق والی کیفیت تو نہیں ہوئی لیکن فراموش کردند کار ضرور ہو
گیا۔ یاد دہانی کے لیے شکریہ۔ میں انشاء اللہ العزیز اولین فرصت میں آپ کی تازہ تصنیف
”عورت انسانیت کے آئینہ میں“ پر ذاتی تاثرات کا اظہار بذریعہ تحریر پیش کروں گا۔ آپ
نہایت شاندار اور مفید قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور
مزید مفید خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

احقر کو دعا میں ضرور یاد فرمائیں۔ والسلام

احقر العباد محمد علاء الدین صدیقی

مکاتیب: علامہ علاء الدین صدیقی
بنام: منشی عبدالرحمن خان

سینٹ ہال - لاہور

۲۱ فروری ۱۹۶۹ء

مکرمی و محترمی

السلام علیکم

آپ کی مخلصانہ مبارک باد کے لیے تہ دل سے ممنون ہوں۔
میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس خلوص و محبت کے لیے جزائے خیر
دے اور دین و دنیا کی ہر نعمت سے بہرہ یاب کرے۔
میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے فکر درست اور عمل صحیح کی توفیق بخشے
مخلص

علاؤ الدین صدیقی

منشی عبدالرحمن خان "انداز سخن" تخلیق مرکز۔ لاہور ۱۹۷۳



انگریزی حصہ

all evils and discarding all immoral practices. If in spite of his claim to believe he does avoid sins, there is something lacking in his belief.

When Ibn Abbas was asked how faith could be snatched away from a man, he interlaced his fingers and then separated them saying 'in this way', 'when one repents his faith or belief returns to him thus' and he interlaced his fingers.

4. Tirmidhi, Sunan, k. al-Iman/ v/19

Four qualities of a hypocrite are described here to be: betrayal of trust, false speech, breach of promise, and serious lack of self-control in controversy. A Muslim has to avoid these under all circumstances.

5. *Tauba* or repentance is a virtue of high order. The messenger of Allah (peace be on him) is reported to have said, "One who repents is like the one who never committed sin."

IV. Repentance

“When a person commits fornication his Iman (faith) leaves him, and when he repents, it returns.”(5)

References:

1. Al- Hashar/7

2. i. Bukhari, Al- gami, K.al-Adab,vii/70-71 Polytheism or associating other thins or beings with Allah, is the gravest sin in Islam. The Holy Qur'an says, “Surely Allah will not forgive the act of associating other deities with Him, but that He will forgive all besides that whom He pleases, and he who associates others with Allah, he has forged a great sin.” (Al-Nisa'/48)

“Most surely joining others with Allah is a grievous wrong,” the Holy Book says in another place. (Luqman/13)

ii. Next to divine worship, in the list of virtues according to Islam, comes obedience to parents. This has been asserted repeatedly in the Qur'an, which says, “And your Lord has commanded that you shall not worship any one but Him, and goodness to your parents. If either or both of them reach old age while you are living, say not to them ‘Fie’, and do not scold them rather address them with gentle words. (Al-Isra'/ 23)

“Disobedience to parents is a major sin. We have enjoined on man goodness to his parents” says the Qurn (Al- Ankabut/8)

iii. Murder is one of the most serious offences according to Islam. One person killed without justification is estimated by the Quran to be equal to the killing of humanity in general. The Holy Book says, “Whoever kills a soul, unless it be for man slaughter or for mischief in the land, it is as though he killed all men; and whoever keeps it (a soul) a alive, it is as though he kept all men alive.” (5:32). A Muslim is he from whose hands and tongue the Muslims are safe. The punishment for international murder of a Muslim is Hell.

iv. In another version of this Hadith ‘false evidence’ is reported in place of ‘deliberate perjury.’ Both are very serious offences in Islam.

3. The fundamental creed of Islam includes belief in the Oexistence of an omnipresent, omnipotent and omniscient God, in the messengership of Muhammad (peace be on him) and in the accountability of man for his deeds, in the life after death. Naturally a belief in the aforesaid things would result in shunning

PROPHETIC WISDOM

“Whatever the Messenger gives you, take it, and whatever he forbids you, then keep back therefrom.”(1)

I. Major Sins

MUHAMMAD the messenger of Allah (peace be on him) is reported to have said:

“The major sins are: (i) Associating (ii) other objects of worship with Allah, disobedience to parents murder, and deliberate perjury.”(2)

II. Loss of Faith

“When one commits fornication he is not a believer, when one steals he is not a believer, when one drinks wine he is not a believer, and when plunders and people raise their eyes at him he is not a believer, and when one of you cheats he is not a believer. So beware! beware!”(3)

III. Hypocrisy

“Four qualities are such that when these are found in a person he is a mere hypocrite. And anyone who possesses one of these qualities he possesses a trait of Hypocrisy. These qualities are: when he is trusted he betrays the trust, when he talks he lies, when he makes a promise he breaks it, and when he argues he abuses”.(4)

And yet another thing that you love---Help from Allah and a victory near at hand. So convey the glad tidings to the believers.(5)

way, Allah rewards them with forgiveness of sins. Their mistakes are pardoned and they enter the eternal abode of Peace and Bliss.

Future life

That the realities of future life have been described in the Qur'an metaphorically is borne out by the well known report of Abu Huraira, who said that the Prophet (peace be on him) said, "Allah says I have prepared for My righteous servants, what no eye has seen, no ear has heard, and no mind can grasp"; read if you like (in the Qur'an), "Now no person knows what delights of the eye are kept hidden for them—as a reward for (good) deeds." (32:17). Syed Ameer Ali writes, "The chief and predominating idea in Islam respecting a future life is founded upon the belief that, in a state of existence hereafter, every human being will have to render an account of his or her actions on earth, and that the happiness or misery of individuals will depend on the manner in which they have performed the behest's of their Creator. His mercy and grace are nevertheless unbounded, and will be bestowed alike upon His creatures." P.198.

5. Al- Saff/13: Deserving the eternal favours of Allah is certainly a great achievement but Islam not only promises the bounties of life hereafter but also very clearly promises the triumph and victory of Truth and the truthful in the life in this world. A Muslim therefore prays, "Our Lord, grant us good in this world, as well as good in the world to come, and protect us from the torment of the Fire".

(Al-Baqarah/ 202)

O you who believe! shall I point out to you a bargain, which will save you from a painful punishment.

You shall believe in Allah and His Apostle, and strive your utmost in Allah's way with your property and your lives; this is best for you if you know.(3)

He will forgive you your sins and cause you to enter gardens beneath which rivers flow, and beautiful mansions in gardens of eternal bliss. That indeed is the great achievement.(4)

JIHAD---The struggle for the preservation and propagation of Truth

3. Al- Saff/ 10-11: The enemy's challenge to Islam can only be met by strenuous effort and sincere service of the cause of Allah. This cause is the cause of Truth, Justice and Goodness. This is what Islam stands for. A believer is required to make selfless sacrifices, and struggle his utmost for the cause of truth. This is what *Jihad* means. It means the utilization of one's physical, mental, and spiritual capacities in the way of Allah. It also means monetary sacrifice of all kinds for the propagation, welfare and service of Islam. It is based on solid faith in Allah, full confidence in the prophetic message and utmost struggle for the cause of truth and righteousness.

Eternal bliss

4. Al- Saff/ 12 Nature never forgives lethargic persons or nations who are negligent of their duties to their Lord and to their fellow brethren. It rewards those who stand and strive for truth----believe it, act on it, preach it and are prepared to bear the consequences of their faith and conviction. The Divine message says:

"By the Time (and its passage through ages),
Certainly man is in loss,
Except such as have Faith,
Perform righteous actions,
Preach and propagate the Truth,
And preach and propagate Patience (to bear the results of truthfulness).

(Al-Qur'an 103:1-3)

But there is a way following which one merits bounties of Allah. This is the way of sacrifice. Those who sacrifice their all in His

THE GREAT ACHIEVEMENT

They desire to extinguish the Light of Allah (by blowing) with their mouths, but Allah will complete his light, though the unbelievers may dislike it.(1)

He it is who sent His Apostle with the guidance and the religion of truth, that he may make it overcome all religion, though the Polytheists may dislike it.(2)

The inextinguishable Light

1. Saff/ 8: When Islam came, all anti-Islamic forces struggled hard to subdue its followers, and suppress its propagation. The followers of the Prophet were in a very small number. The enemies of Islam were large in number and mighty in power. Their constant opposition and perpetual tyrannies were quite disheartening. The believers longed for success and victory against the enemy but the circumstances were disappointing. Almighty Allah in these verses consoled the believers and promised victory and success. This prophecy was not only fulfilled in the time of the Prophet (Peace be on him), but has all along in history been the source of strength to the Muslims. But be it remembered that Allah helps those who help themselves. Whenever the Muslims have tried to serve the cause of Allah honestly and sincerely, the Almighty Lord has helped them out of difficulties and made them victorious over the enemy. Success is for those who serve the Lord.

Triumph of religion

2. Al- Toubah/33: Islam is the youngest of all the historic religions of the world. It respects the memory of all messengers of Allah and their messages. Islam, while it corroborates the truth of earlier divine messages, has certain claims for itself. It asserts unequivocally that it is the final, the perfect and the eternal guidance for all mankind. It also has full faith and confidence in its final triumph over all systems of thought and action. Those who believe in other powers than God's may like or not Islam is destined to be victorious in the end.

13. There is an outer boundry of Islam, which surrounds all who claim to be Muslims and wish to be called as such. This outer enclosure has been suggested by such liberal statements of the Holy prophet (peace be on him). The Holy Qur'an states: "And say not to anyone who offers you *salaam* (salutation), "you are not a believer (*Mumin*)". (4:94). Islam has prohibited calling a believer a disbeliever. "*Zabeeha*" technically is an animal slaughtered according to Muslim practice, which basically includes the mention of Allah's name, and flow of blood from the arteries of the slaughtered animal.
14. Muslims are enjoined to live in perfect unity, and to guard against disintegration (3:102). Their duty is to love and serve others and not to harm and injure them.

10. Islam literally means "submission" or "peace", and in religious phraseology it denotes complete submission to divine guidance, and a peaceful and cooperative attitude towards his creatures. Technically speaking "Islam is based on the following five fundamental practices: The testimony that there is no God but Allah, and that Muhammad (peace be on him) is His servant and messenger; the observance of prayer; the payment of Zakat (poor tax); fasting during Ramazan, and the pilgrimage (to Mecca). (Bukhari & Muslim)
11. *Salat* means "supplication" or "Prayer". The Holy Qur'an includes it in the fundamental practices of all religions, and they were not commanded but to serve Allah, being exclusively obedient to Him, upright, and to keep up prayer and pay the poor-rate, and that is the right religion (98:5). In Islam very great emphasis is laid on the right and regular observance of prayer. *Salat* or "prayer" is one of the five fundamental practices of Islam (of note 5 above). The number of prescribed daily prayers is five, and their times are fixed. They are to be observed in the form prescribed and practiced by the prophet (peace be on him). The jurists are of the opinion that he who denies the injunction of prayer is a disbeliever, and he who constantly neglects its observance is a transgressor (*fasiq*) and deserves punishment. "Surely prayer keeps (one) away from indecency and evil" (29:45) and is the greatest means for the purification of the soul and sublimation of the mind.
12. *Jihad* literally means "struggle" and according to the Qur'anic idiom it stands for the struggle for truth. It covers a variety of efforts to propagate the truth, and includes the defence and protection of the faith and the faithful. Extreme necessity sometimes essentialises the use of weapons, it is permitted in Islam, provided there is no alternative, and there is a serious apprehension of severe damage to the cause of Allah. In this form *Jihad* is called *Qital* (fighting). There is a serious misunderstanding about *Jihad* in the minds of certain western people, who would simply appreciate and admire this teaching, if they do justice to its understanding. Injustice and transgression are not allowed by Islam; and any struggle involving these, can never be justifiably called *Jihad*. There is no use being apologetic about this teaching. The Muslims do not come out for killing others for nothing, but they at the same time are not prepared to be killed by the aggression of others. Protection of life individually and collectively and defence of truth are the noblest and most sacred duties of a Muslim.

References:

1. *Iman* is the Arabic word for 'Faith' and in the Holy Qur'an it has been used for complete acceptance of Islam- the Religion revealed to and preached by the Holy prophet Muhammad (peace be on him). *Iman* has been described as a collective state of mind including 'knowledge and certainty of truth and the intention to practise it in accordance with the certain truth. Technically Iman means a belief in God, His Angels, revealed Books, all the prophets and the day of Judgement.
2. Muslim, *Al-Jami'*, / K. Al- Iman, I/31
3. Muslim, *Al-Jami'*, / k.Al-Iman,I/46
4. Muslim, *Al-Jami'*, /K. Al-Iman, I/30
5. *Zikr* or remembrance of Allah is of two kinds (1) Repeating the glorious name of Allah and (2) remembering Him and feeling His presence always. The first action is an exercise to help imbibing the second one, which state of mind and soul is the real requirement from a believer. The remembrance of Allah is certainly the greatest spiritual force available to man (29:45)
6. Here the Holy prophet (peace be on him) while describing *Iman* or 'faith, lays down a standard of virtue and righteousness, which is liking for others what you like for yourself and disliking for others what you dislike for yourself.
7. Love and respect for the prophet is the basis of *Iman* and Islam, because if the Messenger is not respected, the message is bound to be ignored and neglected. Without respectful love for him no success and no salvation is possible. This love for the prophet is best demonstrated by following in action the glorious truth, he has brought and explained for us, and judging the affairs of life according to the moral, and spiritual standards set by divine guidance that was revealed to him. The Holy Qur'an says: if you love Allah, follow me: Allah will love you, and forgive your sins. Allah is Forgiving Merciful". (3:30) "Then by thy Lord; They believe not until they make you a judge in what they differ amongst themselves, then they find not in their hearts any distress on account of what you have decided and submit to it. With full submission (4:65). Thus love and regard for the prophet, and following him in belief and action go together in Islam.
8. Muslim, *Al-Jami'*, K. Al-Iman, I/49
9. Musnad Ahmad b. Hanbal

BASIS OF FAITH: LOVE AND RESPECT FOR THE PROPHET⁽⁷⁾ (PEACE BE ON HIM)

"One is not a believer unless I (The prophet) am dearer to him than his father and his son and the rest of mankind." (8)

WHO IS A FAITHFUL

"When your virtues please you and your vice displeases you, you are a faithful (Mumin).(9)

ESSENCE OF RELIGION

"The basis of religion is Islam(10) (Submission to Allah) its pillar is *salat*(11) (Prayer), and its climax is *Jihad*".(12)

WHO IS A MUSLIM

"He who prays like us, and faces our *Qibla*, and eats our *zabeeha*, is a Muslim".(13)

"A Muslim is one from whose tongue and hands other muslims are safe".(14)

MODESTY

"Modesty (*Haya*) is a branch of *Iman* (the faith)".

WHAT IS SIN?

"When something pinches your mind (it is a sin) leave it".

PROPHETIC WISDOM

FAITH (IMAN)

Mohammad, the messenger of Allah (peace be on him) is reported to have said:-

MEANING OF FAITH (IMAN)

"*Iman*(1) means that you should believe in Allah, his Angels, his Books, his Apostles, and the last day, and that you should believe in the decreeing of both good and evil".(2)

RELISH OF FAITH

"He who accepts Allah as his God, Islam as his religion relishes (the excellence of) *Iman* (faith)." (3)

EXCELLENCE OF FAITH

"*Ihsan* (or excellence of faith) is that you worship Allah as if you are seeing him, and if you do not see him, he is seeing you."(4).

DESCRIPTION OF FAITH

"You love for Allah's sake, and hate for Allah's sake and keep your tongue busy in the remembrance(5) of the name of Allah, and you like for others what you like for yourself, and you dislike for others what you dislike for yourself".(6)

10. The Holy Quran
11. Al- Nisa/ 105
12. Al- Nahl/ 64
13. Al- Nahl/ 64
14. Sad/ 29
15. Al- Baqarah/ 151

References:

1. The Holy Qur'an in its own text has been called both 'Kitab' a book, and '*Al-Kitab*' the book. In the Arabic language the word KITAB means a writing, a book or scripture, a letter, and it is used for 'divine guidance, and a 'prescribed course' too. This name of the Holy Book aslo shows that it was given to the people as a written scripture. As a matter of fact the Holy Qur'an is the only revealed book, which was reduced to writing during the life-time of the prophet to whom it was revealed. Its other and more popular name is Al-Qur'an which means 'The Recitation'. The Qur'an is universally admitted to be the most widely recited book in the world. The Encyclopaedia Britannica (vol.xv,p.889) ealls it 'the most widely read book ever-written'. Prof. Hitti in his History of the Arabs (p.126) says: "though the youngest of the epoch-making books, the Qur'an is the most widely-read book ever written."
2. This verse of the Qur'an gives the fundamental principles of Faith, viz:1) Belief in Allah:2) Belief in Angels:3) Belief in revealed books:4) Belief in the messengers of Allah, and5) Belief in the Day of Judgement. This is like an essential working hypothesis of the Faith of Islam. A '*Mumin*, or a believer is he who believes in all these points and does not make any exception. The belief in Allah and the Last Judgement imparts the basic faith with its consequent sense of responsibility, and the other three points are its fundamental offshoots which procure the programme of life, and the necessary guidance and assistance needed for carrying out the same. These points of faith are mentioned at different places in the Holy Qur'an, and have been fully explained by the prophet (peace be on him). In another place the Holy Book says: "The Messenger believes in what has been revealed to him from his Lord, and (so do) the believers. They all believe in Allah and his angels and His books and His messengers. (They say) we make no difference between any of his messengers."
3. Al- Nisa/ 136
4. Al- An'am/ 156
5. Al- Baqarah/ 2
6. Al- Zumar/ 28
7. Al- Jathiya/ 20
8. Ibrahim/ 1
9. Ibrahim/ 1

LEADS FROM DARKNESS TO LIGHT

"A BOOK which we have revealed to you, so that you may bring forth mankind, from the darkneses into the light, by the permission of their Lord, to the way of the Almighty Glorious One".(8,9)

CRITERION OF JUSTICE

"Verily, We have sent to thee this BOOK(10) with truth, so that you may judge" between people, according to what Allah has revealed to you. Be never the intercessor for those who have been guilty of a breach of trust.(11)

REMOVES DOUBTS AND DIFFERENCES

"And we have not revealed to you the Book except that you make clear to them that where in they differ, and as a guidance and a mercy for the people who believe".(12)

PONDER OVER ITS VERSES

"This is a blessed Book which we have revealed to you, that they may ponder over its verses,(13) and that men of understanding may receive admonition".(14)

KNOWLEDGE OF THE BOOK COMES THROUGH THE PROPHET

"Even as we have sent among you a messenger from among you, who recites to you our verses and purifies you and teaches you the Book and the wisdom and teaches you that which you did not know".(15)

AL-KITAB (THE BOOK)

THE REVEALED BOOK

"O YOU WHO BELIEVE, BELIEVE IN ALLAH AND HIS MESSENGER AND THE BOOK(1) WHICH HE HAS REVEALED TO HIS MESSENGER AND THE BOOK WHICH HE REVEALED BEFORE. AND WHOEVER DISBELIEVES IN ALLAH AND HIS ANGELS AND HIS BOOKS AND HIS MESSENGERS AND THE LAST DAY,(2) HE INDEED STRAYS FAR AWAY."(3)

THE BLESSED BOOK

"And this is a blessed Book we have revealed; follow it and be righteous, so that you may be shown mercy." -Al-Qur'an.(4)

GUIDE FOR THE RIGHTEOUS

"This Book, there is no doubt in it, is a guide for those who fear God" (i.e. are righteous)(5).

CLEAR AND UNAMBIGUOUS

"This is a BOOK in the Arabic language, without ambiguity therein, so that all may fear God" (i.e. be righteous).(6)

GUIDANCE AND MERCY

"And certainly we have brought them a BOOK, which we have explained with knowledge, and which is a guidance and mercy for the people who believe".(7)

1. The testimony that there is no God but Allah, and that Muhammad is his servant and messenger,
2. The observance of the prayer,
3. The payment of Zakat (Alms-Giving),
4. The pilgrimage (to mecca), and
5. The fasting during ramazan. (7)

References:

1. Al-Takwir/ 26-28
2. Aal Imran/101
3. Al-Nisa'/ 69
4. Bukhari, Al-Jami, Bab Kaif Kana Bad, Al-Wahy, I/2
5. Ibn Majah, Al-Sunan, II/1388
6. Muslim, Al-Jami, K.Iman, I/29
7. Ibid; Bukhari, Al-Jami, K. Al-Iman,I/8

major attributes. The fifth verse describes the relation between Man and God, which is a relation of complete submission and perfect reliance. The sixth and seventh verses teach a succinct but comprehensive prayer for all times, and demonstrate the open-heartedness of the Muslims who pray for all collectively and wish to remain always on the path of all rightly guided people.

Al-Fatihah forms an essentially repeated part of the five daily prayers prescribed by Islam.

RIGHT PATH

"And whoever holds fast to Allah, he indeed is guided to a right path".(2)

"And whoever obeys Allah and the Messenger, they are with those upon whom Allah has bestowed favours from among the prophet and the truthful and the martyrs and the righteous. The best of company are they."(3)

PROPHETIC WISDOM

Muhammad, the prophet of Allah, (peace be on him), is reported to have said:-

"Actions are judged by intentions".(4)

"Verily Allah looks not to your appearances nor to your riches, but he looks to your hearts and deeds".(5)

"*Iman* (faith) means that you should believe in Allah, his Angels, his Books, his Apostles, and the last day, and that you should believe in the decreeing of both good and evil."(6)

"Islam is based on five things (Fundamental practices):

AL-FATIAH **THE OPENING**

1. IN THE NAME OF ALLAH, THE MOST BENEFICENT, THE MOST MERCIFUL.
2. PRAISE BE TO ALLAH, THE LORD OF THE WORLDS;
3. THE MOST BENEFICENT, THE MOST MERCIFUL;
4. MASTER OF THE DAY OF JUDGEMENT.
5. THEE ALONE DO WE WORSHIP, AND THEE ALONE DO WE ASK FOR HELP.
6. GUIDE US ON THE RIGHT PATH.
7. THE PATH OF THOSE WHOM THOU HAST BLESSED, THOSE WHO HAVE NOT INCURRED THY WRATH, AND THOSE WHO HAVE NOT GONE ASTRAY." (Amen)

According to Islam, the universal religion of humanity, divine guidance came to all the nations of the world, at different times in human history. The summum bonum of all revealed guidance was "worship Allah and shun the evil". Islam corroborates the truth of all revealed guidance that came before it, and makes it incumbent on its followers to respect and revere the memory of the great Teachers of Religion. The final and perfect guidance, according to Islam, is incorporated in the Qur'an, which states, "Then whither do ye go? This (the Qur'an) is nothing but a reminder to the people of the world: for everyone amongst you who wish to walk straight".(1)

The Qur'an thus, according to the Muslim belief is a Book of guidance for all people and for all times.

Al-Fatihah, the prayer quoted above in bold type, is the opening chapter of the Holy Qur'an. Besides being a comprehensive and universal prayer for all times, it is considered to be the essence of Qur'anic teachings. The first four verses declare the glory of Allah and describe His

Muslim thus is in reality a combination of Faith, Discipline and Right Action.

II

After having dealt with the above components of the character of an individual in a Muslim society, the Qur'an turns to the society itself. The virtues enumerated after that are mostly social virtues, and will be discussed in the next issue.

To conclude, may it be pointed that *Iman*, *Taqwa*, and Islam in their real sense, are the fundamental values of the Religion of Islam, and if the Muslims wish to regain their lost glory they have to turn to them seriously. In this ultra-materialistic era turning to these spiritual values is most essential in order to regain and retain the balance of life.

References:

1. Aal- Imran/ 102-104
2. Al-Nahl/ 97
3. Al-Hujurat/ 13
4. Al-Ma'idah/3
5. Aal-Imran/ 18
6. Aal-Imran/84

"Surely the noblest of you with Allah is *Atqakum* i.e. the most righteous or the most dutiful of you".(3)

There are scores of verses of the Qur'an which describe *Taqwa* as the noblest quality of a believer. As a matter of fact *Taqwa* is the 'spirit of religion', and in all rituals and pious actions this *Taqwa* is the real aim of the faithful and the wish of the creator.

Islam

The third attribute of a believer mentioned in the first verse quoted above is Islam, which literally means 'submission' and 'peace' both, and in religious terminology denotes 'submission to the will of Allah' and 'being peaceful with His creation'. Technically Islam means an effort to follow in belief and action the Message given in the *Kitab* (the Holy Qur'an) and the *sunnah* (the practice of the Prophet).

About Islam, the religion of submission to 'Divine will' or Divine guidance', the Holy Qur'an says:-

"This day have I perfected for you your religion and completed my favour to you, and chosen for you Islam as religion".(4)

"Surely the (true) religion with Allah is Islam".(5)

"And whoever seeks a religion other than Islam, it will not be accepted from him, and in the Hereafter he will be one of the losers".(6)

Now these three qualities viz: *Iman*, *Taqwa*, and *Islam*, i.e. Faith, Dutifulness, and Submission to Divine Will are the chief moulding factors of the individual character of the believer. Without these three attributes he is not a perfect Muslim. The individual character of a

8. Union of hearts, (*Talif-i-Quloob*);
9. Brotherhood (*Ukhuwwat*);
10. Divine guidance (*Hidayat*);
11. Invitation to Good (*Dawat ilal Khair*);
12. Enjoining th Right (*Amr bil Ma'roof*);
13. Forbidding the Wrong (*Nahy anil Munkar*);
14. *Falah* (Prosperity, success);

Iman

Turning back to the Qur'anic text quoted above, right in the beginning, we come across "O you who believe; The phrase means "the people who have faith in Allah and in the message of Muhammad (peace be on him) taking him to be a messenger of Allah, and the last of his prophets. Generally it is this belief or 'faith' alone that 'Iman' is taken to mean, and the actions are usually separately mentioned with it e.g. "*Alladhina Amanu Wa Amilussalihah*" i.e. people who believe and act rightly'. In the Islamic religion 'faith' alone is not considered sufficient for 'salvation' and 'eternal prosperity'. It requires righteous action to accompany it. The Holy Qur'an says:-

"whoever does good, whether male or female, and is faithful (believer), We shall certainly make him live a good life, and We shall certainly give them their reward for the best of what they did".(2)

Taqwa

The second attribute of a believer mentioned in the above verse is *Taqwa* which means 'acting carefully in the right manner, and is therefore, generally translated as 'piety, righteousness, or dutifulness'. *Taqwa* is considered to be the highest virtue in Islam, and Allah says:-

ROAD TO SUCCESS

"O you who believe, keep your duty to Allah as it ought to be kept, and die not unless you are Muslims.

"And hold fast by the covenant of Allah all together and be not disunited. And remember Allah's favour to you when you were enemies of each other then He united your hearts, so by His favour you became brethren. And you were on the brink of a pit of fire, then He saved you from it. In this way Allah makes clear to you His message that you may be guided.

"And from among you there should be a party who invite to good, and enjoin the right, and forbid the wrong. And these are they who are successful".(1)

In the above verses of the Qur'an, Allah has enumerated the most important items of the Islamic programme of development and success for the individual and the society both. Before we explain this programme in detail, let us give its constituents or components in brief. In the order, they are described in this part of the Qur'an, the are:

1. Belief (*Iman*);
2. Dutifulness or piety (*Taqwa*);
3. Submission (*Islam*);
4. Adherence to the Qur'an (*I'tisam bi hablillah*);
5. Unity of the Umma (*Jamiat*);
6. Avoidance of disintegration (*Adam-i-Tafriq*);
7. Remembrance of Divine favour (*Zikr-i-Nimat*);

in general and from Islam in particular, because the Muslims have been ordained as a nation for upholding virtue and suppressing vice and mischief. The Holy Book declares:-

References:

1. Aal- Imran/ 101-102
2. Aal- Imran/ 105
3. Al- Anfal/ 46
4. Al- Room/ 41

Egypt, Syria and Lebanon have violated all laws of political propriety, and defied the international standards of peaceful co-existence. History will always remind the dauntless valour of Shah Husain of Jordan, who, against odd, has stood bravely for the cause of Arab security. The Zionist Judaism is the fostermother of American Christianity, and the gross feeder of its unstable diplomacy. Both the Arab nations and the non-Arabs stand in serious danger at the hands of aggressive Zionism and acquiescent Christianity, which have joined heads and hands against the sons of Islam. Is it not high time for the Muslims to stand compact with a devout determination to sink or swim together. Let them not harbour ill-will or entertain malice towards any nation or any country, because that would be against their religious tenets and traditions, but at the same time let them not take insults and assaults lying down. Let them unite in defence against common dangers. Let them unite.

Unity of the Muslims is not only required for resisting and combating common enemies, but it is also essential for World Peace and social justice. Islam is the religion of Peace as its very root meaning indicates. In order to take proper share in World Peace the Muslim peoples need joining heads and hands and standing together as dauntless supporters of freedom and independence for all. Let them unite and serve the cause of justice.

The last, but in no way the least, is the problem of the miserable humanity suffering at the hands of sin, corruption, and spiritual degradation.

“Corruption has appeared on land and sea because of (the evil) which men’s hands have done, that He (Allah) may make them taste a part of that which they have done, so that they may return.”(4)

For the eradication of these ignominious evils a bold joint stand is required from all religions of the world

us ... of a remedy for this state of
brok heartedness and frustration."

He suggested a remedy _ the independent homeland for Indo-Pak Muslims. Pakistan, the great champion of Muslim unity and protagonist of the cause of independence and freedom of all Muslim peoples wherever they are, is the outcome of Iqbal's bright and brilliant ideological plan and Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah's sincere and selfless leadership and by Allah's grace is shaping very well. The great champion of Muslim Unity and World Peace, the Shahinshah of Iran Arya Mehr Muhammad Raza Pehlavi, His Majesty King Faisal of Saudi Arabia, Demeral of the Turkish Republic and Jamal Abdul Nasser, President of UAR are the brilliant stars of glory which are kindling new hopes of new life. The Regional Cooperation for Development has not only united the three sister nations of Iran, Turkey, and Pakistan but has also opened new horizons of peaceful neighborhood and cooperative development, the two fundamental and essential requisites for World Peace.

The birth of independent Indonesia is the result of the continued struggle for independence by the brave Indonesians under the leadership of Dr. Seokarno and Dr. Suharto and other brave soldiers in the cause of freedom.

While the above facts help in painting an optimistic picture of the Muslim World, there are other factors, which cast darkest shadows of gloom on the Muslim mind. For example, the Kashmir problem and the question of Cypress are the ugliest eyesores in recent Muslim history. Even these and some other similar points fade out when the greatest of our problems i.e., the problem of Palestine comes before us. In spite of the continuous efforts of His Eminence the Grand Mufti of Palestine, the veteran soldier of Muslim freedom, no solution is yet in view. The recent gross outrages perpetrated by the Zionist Israel on Jordon,

of quick industrial progress. A new minor power emerged in Egypt under Muhammad Ali, but long after his death Egypt became plaything of the European powers too. India was already British. France seized Algeria and established a protectorate over Tunisia and finally Morocco; France and England absorbed the Muslim states of West and Central Africa. The coastal states of East Africa, South Arabia and Malaya all went to the British. By the time the century ended, Europe had completely dominated the Muslim world.

These lessons of history awakened the Muslims from their slothful slumber. Masterminds like Sayyid Jamaluddin Afghani in the Middle East and Sir Sayyid Ahmad in India kindled torches of hope for the victims of the disastrous shipwreck. New vistas were opened. New horizons became visible. Ideas of nationalism and democracy began to strike root. Sayyid Jamaluddin Afghani 'awakened the Muslims from lethargy and a sense of defeat.' This century was mostly spent by the Muslim people in planning to meet the challenge of time. The historian quoted above continues to depict the march of events in the twentieth century and says, "The twentieth century saw the Muslim rulers with their crowns either lost or in danger of being lost. It also saw the Muslim people struggling to find a voice of their own, Everywhere they were trying to think for themselves in political, social and spiritual matters."

Twentieth century is certainly a century of awakening for the Muslim peoples. The rise of Turkey, Iran and Egypt and the awakening in Africa are events of great importance. The Indian Muslims who had been depicted in the following words by Iqbal, the master mind of the Muslim World:-

"The slavery of two hundred years has broken the hearts of the Indian Muslims. Let

glory and power of Islam and afforded a plank to its enemies to stand and crush the Muslims. This happened gradually, and as nothing material and effective was thought of or done to stem the onslaught, this phase ended in the initiation of a process of decay of the Muslim power. Christendom began to muster forces to trample the tranquillity of the Muslim people and to try to strangle their political entity. Time rolled on, and on account of the lack of unity and solidarity, the Muslim powers became weaklings and mercenaries and thus we reached the nineteenth century of the Christian era. Had not the Holy Quran warned the Muslims beforehand when it said:

“And be not like those who have split up and differed after clear signs had come to them. And for such there is an awful doom.”(2)

“And obey Allah and His Messenger, and dispute not one with another lest you be weak-hearted, and your power to endure be gone. And be steadfast. Lo! Certainly Allah is with the steadfast.”(3)

The Muslims heeded not the word of Allah and the chastisement came in the form of disintegration of forces and decline of power. Thus mostly denuded of the pristine charm of Muslim Brotherhood and Unity, we entered the nineteenth century of the Christian Era. “The Nineteenth century was an unhappy one for Islam. Muslim power declined everywhere and Muslim prestige became a thing of the past. The Ottomans still had an empire, but in Europe they were only tolerated because no one power wanted the other to have a major share of the spoils. The West European powers were determined that Russia should not swallow up Turkish lands, and get possession of the Dardanelles. The Persian lands now in the hands of the Qajars, were lost or mortgaged to foreign powers in pursuit

“O you who believe, observe your duty to Allah with perfect observance and die not unless you are Muslims (i.e., you surrender to Him whole-heartedly).

“And hold fast by the rope of Allah (or the covenant of Allah i.e., the Quran), all of you together, and be not disintegrated. And remember Allah’s favour to you: when you were enemies of one another, He united your hearts with love, and by His favour you became brothers. And you were on the brink of a pit of fire, then He rescued you from it. Thus Allah makes clear to you His verses (i.e., revelations) that you may be guided.”(1)

The italicized part of these verses merits special attention. There is a double stress in ‘all of you together’, and, be not disintegrated or disunited.’ The followers of Islam are enjoined to stand together, and avoid split. This was the real might of Islam—purity of hearts and unity of action. Those who were submerged in sin and disunited in hearts became so clean and so united that angels would envy their purity and oceans and mountains would not dare stop their onward march for the sublimation and integration of suffering humanity. The mighty Empires of Caesar and Kisra crumbled before the strength of fraternity and unity of the followers of the Holy Prophet (peace be on him). Soon after the advent of Islam the powers that were, vied with one another to submit to the glory of Islam and share its greatness. This united front of the Muslims soon became the most dominant force in world politics. In the field of culture and civilization the Muslims led the world from ‘darkness to light.’

Then came the second phase of history. Internecine rivalries of the Muslim kings and princes damaged the

MUSLIMS OF THE WORLD! UNITE

'Muslims of the World Unite' is not a slogan coined under pressure of an emergency, but it is the permanent fundamental policy of a nation, which forms nearly one-fourth of the living population of the world. The number of the followers of Islam living in the world has been approximately estimated as nearly 700,000,000. All of them have basically one faith and one creed. La ilaha ill-Allah Muhammadur Rasulullah (there is no god but Allah and Muhammad is His messenger) is the basis of their belief. Belief in the finality of the Prophethood of Muhammad (peace be on him) is the corner-stone of their faith. They aver sincerely "We are satisfied with Allah as our Lord, with Muhammad as our Prophet, and with Islam as our Faith." The Holy Quran, for all the Muslims, is the final direct and perfect word of God, which embodies all truth, is free from all doubt, and is capable of guiding mankind till eternity. History bears out that the Holy Quran is the only Book, out of all revealed or claimed to have been revealed Books, which has stood the test of time, which has escaped untempered with through ages, and the complete text of which has remained intact in its entirety since the time of its revelation. As a matter of fact, the universal acceptance of the Quran as a final and perfect guidance for humanity is the fundamental binding force for all the followers of Islam. The Holy Quran aims at excellence and perfection at the individual level, and unity and fraternity of mankind on the collective level. This aspect of the individual's purity and the collective oneness of humanity has been stressed again and again in the Holy Book, which says:

anniversary of the revelation of "the Final Message of Allah."

References:

1. Al- Alaq/ 1-5
2. Bukhari, Al-Jami; I/2-3
3. Abdullah Yousuf Ali, The Holy Quran (English Translation) Introduction, pp.9-10
4. Al- Alaq/ 1-5
5. Al- Baqrah/ 151
6. Draper, Intellectual Development of Europe, II/42

It was this "Unlettered" Teacher of Humanity who opened new vistas of learning for his followers. It was through this mental and intellectual revolution wrought by the Holy Prophet that those who took pride in their "illiteracy" became the Teachers of the nations and laid the foundations of a refined civilization and an intellectual era.

For the intellectual achievements of the early Muslims, we refer our readers to the monumental work of Dr. Draper,

"A History of the Intellectual Development of Europe" and give a brief quotation from it:

"I have to deplore the systematic manner in which the literature of Europe has contrived to put out of sight our scientific obligations to the Muhammad's. Surely they cannot be much longer hidden. Injustice founded on religious rancour and national conceit cannot be perpetuated forever...The Arab has left his intellectual impress on Europe, as before long, Christendom will have to confess; he indelibly written it on the heavens, as any one may see who reads the names of the stars on a common celestial globe."(6)

The subject needs a separate comprehensive treatment. Suffice it to say that it was under the influence of '*Iqra*' that the Holy Prophet (peace be on him) initiated a new era of intellectual achievement that changed the face of world history. Let us recite the "*Iqra*" again, and become the servants of Science and Learning and make our creative contribution to world developments. This would be certainly a mote celebration of the fourteen hundredth

and writing. This *Ummi* became the founder of a religion and a nation, which led the world in the field of learning for centuries. The Muslims became the torchbearers of knowledge in the world and the forerunners of Renaissance in the West.

What was the incentive for the Bedouins of the desert of Arabia, which made them masters of learning and torch-bearers of Sciences at a time when the west was groping in the dark. The only incentive they had was the teachings of the Quran and the attitude of Muhammad (peace be on him) towards learning.

The Holy Quran has laid great stress on acquiring knowledge. The story of Creation mentions knowledge as the winning point, which established the superiority of 'man' over the 'angles'. If the beginning of our human life mentions 'knowledge' the final programme of perfection, i.e. Islam, also has its initial and basic declaration of knowledge in the first five verses of the Sura '*Alaq*':

"Read in the name of your Lord who created;
Created man from a clot.
Read ! and your Lord is Most Bounteous,
Who taught by the pen.
He taught man what he did not know;"(4)

Qur'an:

The Holy Quran mentions Almighty Allah as a *Mu'allim* or Teacher of the prophets, and calls the prophets in turn teachers of their people. Knowledge and imparting of knowledge thus stands highest in the eyes of Islam. The Quran says about the Holy prophet (peace be on him):

"We have sent among you a Messenger from among you, who recites to you Our Messages and purifies you, and teaches you the Book and the Wisdom, and teaches you that which you did not know."(5)

the mount of Hira, henceforth known
as the Mountain of Light, the mere shell
of an intense memory. Was it a dream?
Terror seized his limbs and he straightway sought
her who shared his inmost life,
and told her of his sense of exaltation,
and the awful void when the curtain closed.

- C. 32. She understood, rejoiced, and comforted him ;
gave strength to his shaken senses ;
wrapped up in warmth his shivering body,
unused as yet to bear the strain and stress
of an experience rare to mortal men.
She knew it was no dream or delusion,
she went and consulted her cousin Waraqa,
a devout worshipper of God in the Faith of Christ,
learned in spiritual lore. He listened
and with her rejoiced that he, Muhammad,
was God's chosen one to renew the Faith.
- C. 33. She said : Blessed be thou, Chosen One!
Do we not see thy inner life,--true and pure?
Do not all see thy outer life,--kind and gentle?--
Loyal to kin, hospitable to strangers?
No thought : of harm or mischief ever stained thy
mind
Nor word ever passed thy lips that was not true
Or stilled not the passions of narrower men.
Ever ready in the service of God, thou art he
of whom I bear witness: there's no God but He,
and thou art His chosen apostle."(3)

Thus began the prophetic career of the Holy
Prophet, who being himself an *Ummi* or "Unlettered
person" Laid the greatest stress on learning through reading

distressed, your God will, therefore, never let you down.”(2)

Allama Abdullah Yusuf Ali has described this event in his excellent style in the following words:

“And now behold; a dazzling vision of beauty and light over-powered his senses, and he heard the word “*Iqraa*;

C. 30. “*Iqraa!*”—which being interpreted may mean, “Read!” or “Proclaim” or “Recite!”

The unlettered Apostle was puzzled;

He could not read. The Angel seemed to press him to his breast in a close embrace, and the cry rang clear “*Iqraa!*”

And so it happened three times, until the first overpowering sensation yielded to a collected grasp of the words, which made clear.

His Mission; its Author, God the Creator,
Its subject, Man God’s wondrous handiwork,
Capable, by Grace, of rising to heights sublime;
And the instrument of that mission, the sanctified pen.

And the sanctified Book, the Gift of God,
which men might read, or write, or study, or treasure in their souls.

C. 31. The veil was lifted from the Chosen One’s eyes,
And his soul for a moment was filled with divine Ecstasy.... When this passed:

And he returned to the world of Time
and Circumstance and this world of Sense,
He felt like one whose eyes had seen
a light of dazzling beauty, and felt dazed
on his return to common sights.

The darkness now seemed tenfold dark;
The solitude seemed tenfold empty;

ISLAM AND KNOWLEDGE

1. "Read in the name of your Lord who created:
2. Created man from a clot.
3. Read and your Lord is Most Bounteous.
4. Who taught by the pen.
5. He taught man what he did not know."(1)

The above-quoted five verses of the Holy Quran are universally accepted as the first direct revelation from Allah to the Holy prophet Muhammad (peace be on him) given fourteen hundred years ago. This direct contact with the eternal message of Allah, has been described on best authority, by Bukhari, Muslim, Ahmad and other well known collectors of Hadith (Prophetic tradition).

Aishah, the wife of the Holy prophet, narrates that wahy or revelation to the Holy prophet (peace be on him) started with true dreams. Whatever he dreamt in those days came to be exactly true. This led him to incline more towards solitude and meditation. He would retire for days to the cave called Hira, where he spent his time in silent prayer and meditations. One day while he was in the cave busy in his meditations, an angel appeared before him and said *Iqra'* (Read). The prophet said, "I do not know how to read." The angel pressed him close to his bosom, and repeated the request (Read) thrice. The same was the reply from the prophet. Third time the angel recited the five verses of the *Sura 'Alaq* (quoted at the top). This new experience with the Eternal Truth thrilled the Holy Prophet, and once he returned to his wife Khadija, narrated the event, and expressed that he apprehended something serious. Khadija consoled him saying "you speak the truth, help your kith and kin, carry other people's load, you are hospitable to your guests, and protect the rights of the

40. Al- Buruj/ 21-22
41. Al- Waqi'ah/ 77-78
42. Al- Hjr/ 9
43. Al- Ra'd/ 31
44. Al- Hashr/ 21
45. Al- Saff/ 9, Al- Taubah/ 33, Al- Fath/ 28

References:

1. Al- Anfal/ 24
2. Al- Isra,/ 88
3. Hud/ 13
4. Younus/ 38
5. Al- Isra'/ 9
6. Al- Baqarah/ 2
7. Al- Baqarah/ 185
8. Al- Isra'/ 82
9. Fussilat/ 44
10. Yunus/ 57
11. Sad/ 29
12. Yasin/ 1-2
13. Al- Zukhruf/ 2-4
14. Yunus/ 1
15. Aal- Imran/ 58
16. Al- Qalam/ 52
17. Abasa/ 11-15
18. Sad/ 1
19. Al- Anbiya'/ 10
20. Yusuf/ 111
21. Fatir/ 31
22. Al- An'am/ 92
23. Al- Baqarah/ 41
24. Al- Baqarah/ 89
25. Al- Ahu'ara'/ 192-197
26. Al- A'raf/ 157
27. Al- Nahl/ 64
28. Aal- Imran/ 22
29. Al- Isra'/ 89
30. Yusuf/ 111
31. Al- Nahl/ 39
32. Al- Nahl/ 89
33. Al- Baqarah/ 185
34. Al- Nisa'/ 82
35. Al- Bayyinah/ 2-3
36. Al- Furqan/ 33
37. Al- Ahzab/ 40
38. Al- Ma'idah/ 3
39. Al- Ma'idah/ 48

"Muhammad is not the father of any of your men but he is messenger of Allah and the seal of the prophets. And Allah is ever knower of all things."(37)

"This day have I perfected for you your religion, and completed my favour on you and chosen for you Islam as a religion."(38)

"And we have revealed to thee the book with the truth, verifying what is before it of the book and a guardian over it."(39)

Guarded against Corruption:

"It is a glorious Quran in a guarded tablet."(40)

"Certainly it is an honoured Quran in a book that is protected."(41)

"We have revealed the Reminder and we shall surely be its guardian."(42)

A great moral force bound to conquer:

"And if there could be a Quran with which the mountains were made to pass away or the earth were traveled over, or the dead were made to speak-nay: the commandment is wholly Allah's."(43)

"Had we sent this Quran on a mountain, thou wouldst certainly have seen it falling down, splitting asunder because of the fear of Allah and we set forth these parables to men that they may reflect."(44)

"He it is who sent his apostle with the guidance and the true religion that he may make it prevail over all the religion."(45)

"Hast thou not considered those who are given a portion of the book? They are invited to the Book of God that it might decide between them, then a part of them turn back and they withdraw."(28)

Contain Clear Explanation of all Religious Principles:

"And certainly we have repeated for men in this Quran every kind of argument, but most men do not consent to aught but denying."(29)

"A distinct explanation of all things and a guide and a mercy to a people who believe."(30)

"So that he might make clear to them that about which they differ."(31)

"And we have revealed the book to thee explaining clearly everything, and a guidance and good news and mercy for those who submit." (32)

"A guidance to men and clear arguments of guidance."(33)

No Contradictions in the Quran:

"Do they not ponder over the Quran? Had it been from any other than Allah they would surely have found in it many contradictions."(34)

Brings Revelation to Perfection:

"And apostle from God reciting pure pages, wherein are all the right books."(35)

"And they cannot bring to thee a question, but we have brought thee the truth and best explanation."(36)

Confirms Previous Revelation:

“It is not a narrative, which could be forged, but a verification of what is before it, and a distinct explanation of all things and a guide and a mercy to a people who believe.”(20)

“And that which we have revealed to thee of the book, that is the truth, verifying that which is before it.”(21)

“And this is a book we have revealed, blessed, verifying the which is before it.”(22)

“And believe in that I have revealed, verifying that which is with you.”(23)

“And when therè came to them a book verifying that which they have.” (24)

Fulfils Previous Prophecy:

“And this is truly a revelation from the Lord of the worlds. The faithful spirit has brought it, on thy heart, that thou mayest be a warner, in plain Arabic language. And the same is indeed in the scriptures of the ancients. Is it not a sign to them that the learned men of the children of Israel known it.”(25)

“Whom they find written down them in the Torah and the Gospel.” (26)

Settles Differences of Previous Books:

“And we have not revealed to thee the book except that thou mayest make clear to them that about which they differ and as a guidance and a mercy for a people who believe.”(27)

"Say: It is to those who believe, a guidance and a healing."(9)

"O men! There has come to you indeed an admonition from your Lord and healing for what is (there of disease) in the hearts."(10)

A Book of Wisdom:

"A blessed book have we sent down to you, that men may reflect on its verses, and those endowed with reason, may bear it in mind."(11)

"O man: consider the Quran full of wisdom."(12)

"Consider the book that makes manifest. We have made it an Arabic Quran that you may understand. And it is in the original of the book with us, truly elevated, full of wisdom."(13)

"These are the verses of the book full of wisdom."(14)

"This do we recite to thee of the communications and the reminder full of wisdom."(15)

A Source of Eminence:

"And it is naught but a source of eminence to the nations."(16)

"Nay! Surely it is a source of eminence, so let him who pleases mind it in honoured books, exalted, purified, in the hands of scribes, noble, virtuous."(17)

"Consider the Quran possessing eminence."(18)

"Certainly we have revealed to you a book in which is your eminence."(19)

THE HOLY QUR'AN

A living miracle for all ages:

"O ye who believe, respond to Allah and His messenger, when he calls you to that which gives you life."(1)

Qur'an:

"If man and *jinn* should combine together to produce the like of this Qur'an, they could not produce the like of it, though some of them were aiders of others."(2)

"Do they say, he has forged it. Say,, then bring ten forged chapters like it and call upon whom you can besides God, if you are truthful."(3)

"Do they say, he has forges it. Say, then bring a chapter like it, and invite whom you can besides God if you are truthful."(4)

A Guidance:

"Surely this Quran guides to that which is most upright and gives good news to the believers, who do good, that they shall have a great reward.:(5)

"This book, there is no doubt in it, is a guide to those who guard against evil."(6)

"The month of Ramadan is that in which the Quran was revealed, a guidance to men and clear proofs of guidance."(7)

Heals moral and spiritual diseases:

"And we reveal of the Quran that which is a healing and a mercy to the believers."(8)

6. Qazi Suleiman Mausoorpuris Rahmatul -Lil- Alamin, 3, Page-264
7. Al- Baqarah/ 185
8. Al- Qadr/ 1-5
9. Al- Isra, /106
10. Al- Ma'idah / 3
11. Al- Alaq /1-5
12. Al- Hjr / 9
13. Al- Qiyamah / 17- 19
14. Smith, Bosworth Life of Muhammad

“Surely We have revealed the ‘Reminder’ (Al- Qur’an), and surely We are its Guardian”. (12)

Another assurance of its preservation is given by Allah in the following verses:-

“Surely on Us rests the collecting of it and reciting of it. So when We recite it, follow its recitation. Again on Us rests the explaining of it”. (13)

The Qur’an has been claimed as a miracle on account of its superb diction and style. No doubt it is so. But the real miracle lies in the overall revolution it wrought in the Arab society, and its potential capacity to remould the destiny of nations. Bosworth Smith rightly remarked in his ‘Life of Muhammad’:-

“It is the one miracle claimed by Muhammad his standing miracle he called it – and a miracle indeed it is”. (14)

It was in the blessed month of Ramadan that the Holy Qur’an was revealed. Let us all, in the month of Ramadan turn towards the Book of Allah, hold it fast, and try to mould our lives, individually and collectively, in accordance with its teachings and guidance. Let the 14th Centennial Anniversary of its Revelation be an occasion for a solemn determination of the Muslim nations, to follow the light of the Qur’an, to disseminate it to the nations of the worlds, and to give this important task the first place in our priorities list.

References:

1. Al- Shu’ara/ 192-196
2. Al- Baqara/ 2
3. Aal- Imran/ 4
4. Aal- Imran/164
5. Al- Ira' / 13

{emigration of the Prophet (peace be on him) from Makka to Medina}, when he was in the forty first year of his age.

According to the lunar calendar we are now in the 1387th year after the Hijrat. The revelation of the Holy Qur'an began thirteen years before the Hijrat. That makes fourteen hundred years in all. Hence the world of Islam is celebrating the fourteenth Centennial Anniversary of the Holy Qur'an was made by the Mo'tamar al-Islami, Karachi, Pakistan, and it has become as real revival movement. Everywhere in the world of Islam Committees are being set up, and arrangements are being made for the proper celebration of the 14th *Centennial* Anniversary of the Holy Qur'an. The Government of Pakistan has announced an International Conference of Scholars from the four corners of the world to discuss problems of vital interest to the Muslim nation today. This will be in commemoration of the fourteen hundredth anniversary of the Nuzul-ul-Qur'an. As the Qur'an was revealed in the month of Ramadan, the fast of the month and festival (Eid) of Fitr (or breaking fast) are in reality annual celebration of its revelation. These are held every year, but the proposed celebrations are centennial. Every Muslim Country has taken it up, especially great preparations are being made in Pakistan.

Unique Nature of Qur'an:

The celebrations in connection with the Holy Qur'an bear a great importance for the Muslims. This is on account of its unique nature. The Holy Qur'an claims to be a Book of guidance for all times and for all nations of the world. It is the only revealed book which has stood the test of time, and has continued to remain absolutely unchanged and unaltered. It claimed this unique feature of permanent preservation fourteen hundred years ago:-

The Qur'an also mentions the *laila-tul-Qadr* (the night of Majesty 'or' the night of Honour) in connection with its revelation, (8), and this blessed night is suggested, in the Traditions, to be the 23rd, 25th, 27th or 29th night of the month of Ramadan.

The complete Qur'an was not revealed all at once. It took about twenty three years to complete. Divine guidance was revealed sometimes with reference to particular events, sometimes as general directives of conduct and behaviour and as guiding principles of life in the various fields of faith and action.

"It is a Qur'an, which we have divided (into parts from time to time), in order that thou mightest recite it to men at intervals: We have revealed it by stages". (9)

Allama Khudri has calculated the period of revelation as twenty two years, two months and twenty two days. The last verse was revealed on the 9th Zil-Hijja in the year 10 A.H. It reads as followings:

"This day have I perfected for you your religion, and completed my favour to you, and chosen for you al-Islam as religion". (10)

It is historically agreed that first of all the following five verses of the Qur'an were revealed:-

"Recite in the name of thy Lord who created. He created man from clot. Recite and thy Lord is most generous, Who taught by the pen, taught man what he knew not." (11)

Nuzul-al- Qur'an

The exact date of the first revelation is not known with certainty. This is however, certain that the earliest revelation came in the thirteenth year before Hijrat,

NUZUL -UL - QUR'AN

“And surely this (the Qur'an) is a revelation from the Lord of the worlds. The trustworthy spirit has brought it, on thy heart that thou mayest be a warner, in plain Arabic language. And surely it is (found mentioned) in the scriptures of the ancients.”(1)

Al-Qur'an is the name of the sacred scripture of the Muslims, and it literally signifies “a widely read book”. In fact it is the most widely read book in the world. In its holy text, it mentions other names for itself for example, *Al-Kitab*(2) (the book), *Al-Furqan*(3) (The discrimination between truth and falsehood), *Al-Hikmat*(4) (the wisdom), *Al-Huda*(5) (the guidance) and so on. Its most popular epithets are *Al-Majid* (the glorious), *Al-Hakim* (full of wisdom), *Al-Karim* (the bounteous). Qazi Salman Mansurpuri says in his book *Rahmatul lil Aalamin*, “The names of the Qur'an are ninety like the excellent names of Allah, but the most special name is *Kalam Allah* (the word of God), and the most popular one is Al-Qur'an.(6)

Revelation: The first revelation came to the Prophet (Peace be on him) in the month of Ramadan, as the Qur'an itself mentions:-

“The month of Ramadan is that in which the Qur'an was revealed, (as) a guidance for men, (containing) clear proofs of guidance, and (as) the criterion (for discrimination between right and wrong)”. (7)

References:

1. Al- Táubah / 36
2. Al- Baqarah/ 49

1. "Permit me to return to the quiet life of devotion at Makka."
2. "Allow me to go to the borders of the Muslim Empire and to die in the cause of Islam."
3. "Permit me to proceed to Yezid."

Husain had a small band of some seventy relatives and friends with him including the young and old and infants, men and women all. He wanted to persuade them to go away, but they would not. Finally this group of innocent people was surrounded. Access to the water of the river had been stopped. One by one the dearest relatives of Husain were killed in the struggle. The army of Yezid received orders from Ibn Ziyad that Husain should either be forced to take the oath of allegiance to Yezid or put to death. Husain said, "Death of honour is better than a life of disgrace," and decided not to submit. He spent his last night in prayers, and on the tenth of Muharram was very brutally martyred at Karbala. His tents were plundered and relatives were disgraced, and, alongwith his head on a spear, the looted caravan was sent to Yezid who, it is said, deeply regretted this unforeseen out come and had Husain's relatives, who had escaped the massacre, brought back to Medina and there generously provided for.

The generality of Muslims consider Husain as a great martyr in the cause of truth. Iqbal, the philosopher poet of the East, has said:

"Moses and pharaoh, and Husain and Yezid represent the struggle (of vice and virtue) in life."

"A believer does not worship anyone but Allah, and his head does not bow before any pharaoh."

"Husain rolled in blood for the cause of truth, and became the symbol of submission to the Unity of Allah."

According to the Jewish tradition this event took place on the tenth of Muharram, and the prophet of Islam (peace be on him) used to fast on this day, and he is reported to have said, "After Ramazan the best fast is that in Muharram".

It was on the tenth of Muharram in year 61 A.H. that the greatest tragedy of the history of Islam, i.e. the martyrdom of Imam Husain, the grandson of the prophet of Islam, took place at Krbala in Iraq. Imam Husain was a son of 'Ali the fourth orthodox caliph, and Fatima, the youngest and the most beloved daughter of the prophet. After the death of 'Ali, his elder son Hasan became caliph, but after six months he abdicated in favour of Mu'awiyah, who became the sole master of the Muslim Empire. Before his death Amir Mu'awiyah broke the honoured democratic tradition of Islam, and during his lifetime forced allegiance from the people for his son Yazid, who became Khalifa after his death. Orders were issued to the Governors of provinces to get the oath of allegiance from Husain. Husain knew that Yazid was not the type of man who would suit the standards of the Islamic Caliphate, which had seen men of highest calibre and piety. Moreover, the people of Kufa had written letters to Husain that they wanted him to be the "leader of the faithful". He moved from Madina to Makka, wherefrom, against the persuasion of some of his good friends, started for Kufa. The Kufans in the meanwhile deserted the cause of Husain under pressure of Yezid.

The news was received by Husain with great disappointment, and before he could retrace his steps he was surrounded by forces deputed by Yezid. The good-hearted among them wanted not to put Husain to trouble, but the overenthusiasts, greedy about worldly gains, did not pay any heed to the three terms offered by Husain which were:

MUHARRAM

The months of the Muslim year are lunar and the first of the month is reckoned from the sunset immediately succeeding the appearance of the new moon (*hilal*). The names of the months are: (1) Muharram; (2) Safar; (3) Rabi-ul-Awwal; (4) Rabi-ul-Akhir; (5) Jamada-ul-Ula; (6) Jamada-ul-Ukhra; (7) Rajab; (8) Sha'ban; (9) Ramazan; (10) Shawwal; (11) Zul-Qa'da; (12) Zul-Hijjah.

The Holy Qur'an says:

"Surely the number of months with Allah is twelve months by Allah's ordinance, since the day when He created the heavens and the earth Of these four months are sacred". (1)

The sacred months are Muharram, Rajab, Zul-Qa'dah, and Zul-Hijjah. Muharram is the first month of the Muslim calender, and this year the new year day of the year 1387 A.H. fell on 12 April 1967.

Muharram literally means "that which is forbidden," i.e. "anything sacred". This month is so called because both in the pagan age and in the time of Islam, it was held unlawful (*haram*) to go to war in this month. Muharram was held sacred and auspicious earlier by the Jewish tradition also, and it was believed that Bani Israel under the leadership of Moses (peace be upon him) got their liberation from the tyrannies of the pharaoh during this month. The Holy Qur'an mentions this in the following words:

"And when we delivered you from pharaoh's people, who subjected you to severe torment, killing your sons and sparing your women, and in this was a great trial from your Lord".(2)

Are not some Muslim nations fighting against each other? Are not the superb teachings of the Qur'an being flouted? All the Claims of faith based on peace get falsified, when its followers themselves do not sit down to find out how to establish peace among themselves. Enemies of religion have a justification in saying that the sermons from the pulpit are not seriously intended to be followed in life.

Now take the case of those who do not believe in conventional religions, we mean the communists. They criticise religions because, in their view, peace is shattered by faith and belief. What is their record of achievement? They have failed to establish peace, and are at daggers drawn with each other. The same ideology has created two warring fronts and they are struggling against each other.

Now that the world is on the brink of a pit of fire, it is high time that the believers in Religion join heads and hearts, and consider it seriously why without peace the world has turned into a veritable hell. How to ameliorate its conditions? Cannot the religious forces pool their claims to peace, cooperate in working for it, and be 'the children of God' once again? Where is the common forum for it? Will the real lovers of peace rise to the occasion?

Without peace all progress is going waste. All thinkers and believers in Religion must unite and cooperate to bring about honestly an era of peace.

"Enable us, O Lord, to live in peace and make us enter the eternal abode of peace".

References:

1. Al- Room/ 41
2. Muslim, Al-gami, K. Salat, Bab Al- Masajid, II/ 94, 95
3. Aal- Imran/ 102
4. Aal- Imran/ 105.

not they come out to be called the children of God? Why is that message of peace being ignored, which the Gospel of St. Mark gave: "Salt is good, but if the salt has lost his saltiness, wherewith will ye season it? Have salt in yourselves and have peace one with another". (Mark 9:50). Why is life grown saltless? And how to season it again? These are big questions that face the believers in religion everywhere.

Take "the Religion of peace", i.e. Islām. Its root meaning is 'peace' and "submission to God". The conventional greeting of its followers is "As-Salam-u-alaikum" (peace be on you). Its followers daily recite the prayer of peace after their obligatory ritual prayers in the following words:-

"O Lord! You are peace. From you comes peace, and to you returns peace. Enable us, O Lord, to live in peace, and make us enter the eternal abode of peace".(2)

Are not the followers of this religion of peace themselves, instead of being in peace with one another, torn asunder. The Holy Qur'an enjoined on the Muslims:

"And hold fast by the covenant of Allah all together and be not disunited. And remember Allah's favour to you, when you were enemies, then He united your hearts, so by His favour you became brethren. And you were on the brink of a pit of fire, then He saved you from it. Thus Allah makes clear to you His messages that you may be guided". (3)

How clear is the Qur'anic warning:-

"And be not like those who became divided and disagreed after clear arguments had come to them. And for them is a grievous chastisement".(4)

سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبِّ رَحِيمٍ

"Peace: A word from the Lord Most Merciful"

(Al-Qur'an, 36:58)

What is the world we are living in? Through our own doings, a world of mischief, misery and misfortune. Mad after development and progress, the necessity and utility of which can not be denied the world has forgotten that without peace our progress will create nothing but a veritable hell for us, and with peace we shall be living in heavens even before parting with the present life. Peace is the sole object and main purpose of religion. This is what we are told on Sunday from the Church, on the Sabbath from the Synagogue, and on Friday from the pulpit of the Mosque. What an enormous amount of eloquence and oratory is displayed in praise of peace, and yet the world is heading towards ruin and disaster.

"Mischief has appeared on land and sea because of (their) misdeeds that hands of men have earned, That (God) may give them a taste of some of their deeds: in order that they may turn back (from Evil)."(1)

Christianity that beautiful religion named after the "prince of peace" is full of all praise for peace: "Depart from evil, and do good; seek peace and pursue it." Says the Holy Bible (ps34:14). But who seeks peace and who is pursuing it? The great Christian powers are involved in monstrous bloodshed, that is, besmearing the face of earth. "Blessed are the peacemakers: for they shall be called the children of God" (Matt. 5:9). But where are they? Why do

undergoing this discipline is found to a great extent in the moral equipment which one gets through it, and which stands him in good stead during the difficult phases of life. It is for this reason that the Holy Book has described the act of fasting as a favour and not a calamity. It says:

"Allah desires ease and comfort for you, and He does not intend imposing hardship on you, (He desires) that you should complete the number of days, and that you should exalt the greatness of Allah for having guided you and (He desires) that you may offer thanks."(3)

It is this thanksgiving that is universally observed as Eid-ul-Fitr in the whole world of Islam in the form peculiar to Islam under such circumstances, i.e., by offering prayers to Allah and rejoicing, on the completion of an act of devotion and submission to him. The Muslims bow before their creator in congregation and thus the occasion besides conferring on us the benefits of worship and devotion affords an opportunity of demonstrating the true spirit of liberty, equality and fraternity through prayers and through fervour in meeting and embracing other Muslim brothers.

May the spirit of fraternity influence our lives more deeply, and may the significance of congregational devotion teach us more effectively the lesson of unity and peace. Peace be on all who observe the way of submission to Allah and peaceful cooperation among mankind.

Courtesy Pakistan Times Lahore. Jan. 12, 1967

References:

1. Al-Baqarah/ 183
2. Al- Baqarah/ 185
3. Al- Baqarah/ 186

Another point worth mentioning is the relationship between the month of Ramazan and the revelation of the Holy Qur'an. The Muslim theory of guidance is that revelation has been a universal phenomenon, in the sense that it has come to all nations. Messengers from Allah came to all people in all times and in all countries and climes. The sole aim of revelation was to enable the people to know and worship their creator, and to live peacefully in the world shunning all that is evil and sinful. In the line of revealed books the Holy Quran came the last, and stands unique because it is the only book which can claim cent per cent preservation and perfection. It claims to be a final guide for humanity on all matters pertaining to human welfare and progress. It was with these claims that the Holy Quran was revealed during the month of Ranzan, and it was this great advent which was required to be commemorated by the observance of fast during this month. The benefit of the revelation of the Book was moral and spiritual, and therefore the way of commemoration has also been prescribed in a spiritual form, i.e. fasting. The Holy Book states:

"The month of Ramazan is that in witch the Quran was revealed as a guidance for mankind and clear proofs of the guidance and distinction between right and wrong."(2)

All the worshipful activities during the month of Ramazan, as already explained, are in commemoration of the revelation of the last and the perfect message of Allah to humanity, and the Eid-ul-Fitr is the day of thanksgiving for the great favour conferred on man in the form of the Quran, and the consequent devotion during the month of Ramazan to which the revelation of the Holy Book has led.

Apparently the observing of fast seems to be a very arduous duty, but the moral and spiritual benefit that accrues from its discipline is very great. The reward of

EID-UL-FITR

Fraternity through congregational prayer

RAMZAN is the annual moral and spiritual refresher course for the Muslims, and Eid-ul-Fitr is the day of mass celebration on the completion of the course. Eid-ul-Fitr is one of the two universally accepted festivals of Islam, and it literally means the festival of breaking the fast.

Fasting is one of the five fundamental practices of Islam, and the spiritual efficacy of the institution is universally accepted by all religions. The history of Religions tells us that from the prehistoric periods down to the advent of Muhammad (peace be on him), people have been practising the institution of fasting as means of spiritual elevation. The institution has been recognised by both the Arian and semitic lines of religion. The "unlettered prophet of Islam" (peace be on him), without any access to the history of religions, announced this great historical fact, under revelation from Allah, in the following words:

"O believers, fasting has been enjoined on you as it was enjoined on the people before you, so that you get disciplined in warding off evil.(1)

The practice of fasting besides sublimating the inner self of man, and purifying his body and soul, inculcates a realisation of the pangs of need experienced by the poor and the needy. The lesson is brought home to, and the practice is enjoined on all-rich and poor, young and old universally, except of course those who are handicapped physically or circumstantially. It is the completion of this moral exercise which is celebrated on the day of Eid-ul-Fitr.

And hold fast by the covenant of Allah all together and be not disunited." (5)

Bringing about unity of Muslims for the service of humanity is our aim and object. Our policy is:

تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان

"Cooperate in righteousness and piety, and do not cooperate in sin and sedition." (6)

With trust in Allah and reliance on His beneficence and mercy we seek cooperation from all followers of the prophet (peace be on him) and extend cooperation and service to all those who work in the cause of Allah for the love and welfare of humanity, and for peace and prosperity of mankind. With this brief preface to our project, in this holy month of Ramzan, during which the Qur'an was revealed, we submit this humble present, "The Light of Islam" for your perusal and advice, and for passing it on to those who need it.

رب اشرح لى صدرى ويسر لى امرى واحلل عقدة من
لسانى يفقهوا قولى

"O My Lord! Expand my breast for me,

And ease my affair for me,

And loose the knot from my tongue,

So that they may understand my word." (7)

References:

1. Al- A'al/ 1-3
2. Taha/ 50
3. Al- Fatihah/ 2
4. Aal-Imran/ 103
5. Aal- Imran/ 101-102
6. Al- Ma'idah/ 2
7. Taha/ 25-28

soul in the world, if you are a true believer, you should not sit inactive".

Divine mercy kept the urge living. It is with the help and encouragement of the Muslims of Shah Chiragh Mosque in general and the group of a few sincere and honest companions in particular, that an organisation was set up in our Islamic Centre, Shah Chiragh Mosque, Lahore. This organisation has been functioning for the last so many years in the service of Islam, and is a body properly registered with government as "The World Mission of Islam". The writer of this note, through the kindness and favour of his companions, is working as the Honorary Director of the Islamic Centre, and the Life president of the World Mission of Islam. The Islamic center is a center of voluntary workers in the cause of Islam, and aims at the dissemination of the teaching and tenets of that glorious religion. Its object is to seek the pleasure of Allah through spread of his message. Islam with us is the original, rational, and liberal Islam as taught by the last prophet of Allah, Islam that has been inherited by us through our worthy forefathers, and is based on *Kitab* and *Sunna* (the Holy Book of Allah and the enlightened practical wisdom of his prophet). We do not specialise in controversies and schismatic tendencies. Nor do we intend wasting our meager energies in quibbles and quarrels. The task ahead is mighty and we are already late and weak. The Kalima of Islam "LA-ILAHA-ILL-ALLAH MUHAMMAD-UR-RASUL-ULLAH," (There is no God but Allah, Muhammad (peace be on him) is His Messenger) is our guiding star and working formula. All those who believe in the truth and verity of the prophet's final message, and claim to follow him are Muslims with us, for all purposes of service and cooperation. We try to abide by the Qur'anic injunction:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

"O you who believe, keep your duty to Allah, as it ought to be kept, and die not unless you are Muslims.

comes all help and succour. With Him lies the power to support or reject. To Him are known the beginnings and ends of all that we do. It is on His unbounded mercy that we have depended. It is His support that we have relied on. With very meagre and limited means of purse and pen at our disposal, we have started this humble effort for the dissemination of His eternal message, that He sent for the guidance of the whole of humanity, through His final messenger Muhammad (peace be on him). It is a mighty task and as I have said before, our resources are very humble and poor. May He enable us to perform the task for Him and His pleasure alone. May He open the minds of better equipped persons to cooperate with us and encourage us.

A poor mediocre, ill-equipped for the mighty task of carrying the word of Allah to His creatures, dreamt years before today to organise a group of sincere people who could take up the dissemination of Islamic teachings as the uppermost object of their lives. It was the persuasion of his good teacher that caused and encouraged the urge. The Eternal Lord has said:

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف
وينهون عن المنكر. واولئك هم المفلحون

"And from among you there should be a party who invite to good and enjoin the right and forbid the wrong. And these are they who are successful." (4)

Besides this commandment of Allah, two Persian verses of Allama Iqbal, the Hakim-ul-Ummat (philosopher of the Umma) have been the constant inspiration for the writer:

زانکه در تکبیر راز بودت حفظ و نشر لا اله مقصودت
تا نخیزد بانگ حق از عالمی گر مسلمانی نیا سائی دے

"The glorification of the name of Allah is the secret of your existence. The preservation and dissemination of LA-ILAHA-ILL-ALLAH (There is no God but Allah) is the object of your life.

"As long as the voice of Truth does not enrich every

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

In the Name of Allah, the Beneficent, the Merciful

Muhammad the prophet of Allah (peace be on him) said, "Begin all works in the name of Allah, the Beneficent and the Merciful," and so we do today. The Eternal Lord of heavens and earth created everything and assigned to it its assignment. So says He in the Holy Qur'an:

سُبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى

"Glorify the name of thy Lord, the Most High! Who created (everything) and perfected (it) and Who measured and guided". (1)

رَبَّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى

"Our Lord is He Who gave everything its creation, then guided and (directed) it." (2)

Everything happens according to the will of the Lord and according to the estimates He makes. He has assigned duties to all existing objects, and it is He who has equipped them for the efficient performance of their duties and functions. He created the Universe and fixed permanent and inalterable laws for its continued functioning. With Him are the stores of bounties, and He it is Who enables a person to benefit from them. On Him, therefore, should be all confidence, reliance, and from Him should we seek all that we need:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

"Thee do we serve (O Allah) and Thee do we beseech for help." (3)

He is the mainstay and the anchor for all projects of life. He is the Mover and Perfector of all schemes and undertakings. From him

Those who follow the Messenger the unlettered prophet whom they find described with them in the Torah and the Gospel.....Those who believe in him and honour him and help him, and follow the light which has been sent down with him, these are the successful." (11).

4. "But as to him who repents and believes and does good, may be he will be among the successful." (12).
5. "These are they into whose hearts He has impressed faith, and strengthened them with a Spirit from Himself and He will cause them to enter gardens, wherein flow rivers, abiding therein. Allah is well pleased with them and they are well pleased with Him. These are Allah's party. Now surely it is Allah's party who are successful." (13).

In short Islam exhorts its followers to struggle for all that is good, and shun all that is bad, and promises success (*falaah*), everlasting and eternal.

References:

1. Al- Baqarah/ 5
2. Al- Mu'minun/ 1
3. Laue, English Lexicon, VI/2439, 1877
4. Al- Ahzab/ 72
5. Abdullah Yousuf Ali, English Translation, p.1130
6. Ibid.
7. Al- Shams/ 7-10
8. Al- A'la/ 14-15
9. Al- Mu'minun/ 1-5
10. Al- A'raf/ 8
11. Al- A'raf/ 156-157
12. Al- Qasas/ 67
13. Al- Mujadilah/ 22

man carried it. Surely he is unjust and ignorant." (4).

Allama Abdullah Yusuf Ali, in his footnote on this verse, says:

"this was part of God's will and plan, but little did man realize then what a tremendous task he was undertaking, or question himself whether he will be equal to it..... man signally failed to measure his own powers or his own knowledge. But God's Grace came to his assistance. Where man did his best, he won through by God's Grace, even though man's Best was but a poor Good." (5)

Islam is thus the religion of effort and exertion, struggle and success. "By the soul and Him who perfected it" (6) Says the Qur'an, "He showed it the way of evil and the way of good. Surely he succeeds who keeps it pure, and he fails who corrupts it." (7). In another place it says "He indeed is successful who purifies himself, and remembers the name of his Lord, and prays (8). These verses very clearly indicate that success is the goal for our physical and spiritual struggle. The successful ones, in this respect, have been described as follows:-

1. "Successful indeed are the believers, who are humble in their prayers, and who shun what is vain, and who act for the sake of purity, and who restrain their sexual passions" (9).
2. "And the judging on that day will be just; so as for those whose good deeds are heavy, they are the successful." (10).
3. "My mercy encompasses all things. So I ordain it for those who keep their duty and pay the poor-rate, and those who believe on Our messages.

makes its followers conscious of the responsibility of human actions.

There are two types of religions in the world – those, which believe in ‘salvation’ as the final achievement of life, and those which aim at ultimate ‘success’ in this life and the life to come. Christianity and Hinduism can be cited as illustrations of the first type, while Islam according to its teachings and claims represents the second. As a matter of fact the difference is based on the respective teachings of these religions about the beginning of life. According to the dominant schools of Hindu philosophy life is like ‘an imprisonment’. The bird of human soul is a captive in the cage or prison of material self. With this understanding all efforts should be directed towards liberating the soul from the clutches of the material existence. Hence an ultimate desire is found to shun material life and its progress and development. The follower of this course is in trouble and difficulty in this life, and seeks ‘salvation’ from it. Now take the case of Christianity. That great religion believes in the original sinfulness of man, and which of its teachings are focussed on the point of ‘salvation’ from the consequences of the sin of Adam.

Islam neither takes life to be an ‘accident’ nor an ‘imprisonment’ from which an escape is needed. It also does not believe in ‘original sin’ and ‘fall of Adam’. According to Islam life, is an assignment of responsibility. This responsibility has to be fulfilled by effort and exertion, and the desired results are to be achieved according to a plan and a system. Man has accepted this responsibility and the results are to be finally judged by Allah the Creator – Lord of heavens and earth. The Holy Qur’an says:-

“Surely We offered the trust to the heavens and the earth and the mountains, but they refused to carry it and feared from it, and

ISLAM-THE RELIGION OF SUCCESS

Islam, which basically denotes 'submission' (to the Almighty Creator) and 'peace' (with His Creation), has ideals before it, both universal and eternal. In its programme it includes individual piety and social solidarity, and the ultimate object is a constructive move towards progress, success and eternal peace. The final goal of the believers is '*falaah*' or 'success' and the Holy Qur'an refers to this stage when it says "*Wa Ulaika Humul Muflihoon* (1)" (And these are the successful ones), In another place it says "*Qad Aflahal Muminoon*".(2) (Successful indeed are the believers).

Falah literally means 'to split, to crack, and to cut', and when used in connection with the earth it means 'ploughing the land to cultivate it.' The farmer tills the land to produce useful results of his labour. Thus *Falah* connotes labour to produce good results, and finally "*Falah*" and "*Falaah*" both mean "prosperity, success; the attainment or acquisition, of that which one desires or seeks, or of that whereby one becomes in a happy and good state; safety or security; and continuance, in a good, or prosperous state, and in the enjoyment of ease, comfort, or the blessings of life; and the continuance of good: and simply continuance, permanence, lastingness, duration or endurance. There is not in the language of the Arabs any word more comprehensive in its signification of what is good in the present life and in the final state than *al-falaah*" (3).

Falah (Perfect success achieved through effort and exertion) is the destination of life for a Muslim, and this feature of Islam distinguishes it from other religions, as it

Azad, that savant of Qur'anic learning: "The primary aim of religion was to keep mankind united and never to promote disunity. The greatest tragedy of man was that he turned an instrument of unity into a weapon of disunity"(17). The fundamental policy of Islam has been announced in the following words of the Qur'an, "Call unto the way of your Lord with wisdom and fair exhortation, and reasons with them in the best way. Lo! Your Lord is best aware of him who strayeth from His way, and He is best aware of those who go right" (xvi.125).(18)

References:

1. Al- Baqarah/ 148
2. Al- Muominun/ 53
3. Al- Baqarah/ 256
4. Al- Baqarah/ 154
5. Yunus/ 9
6. Al- Ma'idah/ 69
7. Al- Hajj/ 17
8. Encyclopaedia of Religion and Ethics, article on toleration page 366 vol. XII,- 1934
9. Al- Ankabut/ 46
10. Encyclopaedia of Religion and Ethics, article on toleration page 366 vol. XII,- 1934
11. Al- Watha'iq al- Siyasiyah,
12. Muhammad Ali, Introduction to Buqlish Translation of Qur'an
13. Al- Insan/ 3
14. Al- Kahf/ 24
15. Al- An'am/ 104
16. Encyclopaedia of Religion and Ethics, article on toleration page 365 vol. XII,- 1934
17. Abdul Kalam Azad, Tarjuman al Quran I, 181 (English Translation) Sindh Sagar Academy, Lahore.
18. Al- Nahl/ 125

The writer intends to give a detailed study of the attitude inculcated by Islam towards differences in detailed beliefs and opinions within its fold, in another article. To summarise the position a passage is quoted here from Hastings Encyclopedia of Religion and Ethics:

“Within the circle of the Muslim Church the basis for toleration is found in the saying traditionally attributed to Mohammad: ‘Ikhtilafu Ummati rahmatun’ Difference of opinion in my community is a (manifestation of divine) mercy.’ In accordance with this principle, it has been possible for the four school (madhahib) of theologians and legists into which the Sunnis are divided, viz., Hanafi, Maliki, Shafii, and Hanbali, to exist side by side, and for each of them to permit difference of opinion even in its own midst. There has been abundance of controversy between these schools, but instances of open violence have been rare. A similar basis for toleration was found in the traditional saying of the Prophet: ‘my community will become divided into 73 sects, and rendered possible the ample sectarian development in the Mohammedan world. Instances have occurred from time to time of the persecution of one sect by another, but a more characteristic feature of the Muslim church has been freedom allowed to the exposition of religious doctrine, and the common sentiment of princes and people has generally condemned intolerance on the part of professed theologians.” (16)

In conclusion let us remember the memorable words of Maulana Abul Kalam

there be not compulsion in Religion, and forcible conversion is condemned in the words:

“But if thy Lord has pleased, verily all who are in the world would have believed together. Wilt thou then compel men to become believers? No soul can believe but by the permission of God,”(10)

“In harmony with the injunctions of the Qur'an is Mohammad's letter to the bishops, priests, and monks of Najran promising them the protection of God and His apostle for their Churches, their religious services and monastic institutions and freedom disturbance or any interference with their rights so long as they remained faithful to their obligations. He permitted the Jews in Medina to practise their own faith until their implacable hostility led to their expulsion from the city, and he gave instructions to Mu'adh b. Jabal, whom he sent on a mission to Yemen in 10 A.H., that he was not to compel any Jew to abandon his religion.”(11)

“Tolerance is not in fact the word that can sufficiently indicate the breadth of the attitude of Islam to other religions. It preaches equal love for all, equal respect for all and equal faith in all,”(12) says Muhammad Ali in his Introduction to the English Translation of the Qur'an. The Attitude of the Qur'an towards diversity of beliefs is clear from the following verses:

“We have shown him the way, he may be grateful or disbelieving”(lxxvi.3).(13)

“The truth is from your Lord; then whosoever will, let him believe” and whose ever will, let him disbelieve.(14)

“Proofs have come unto you from your Lord, so whoso seeth, it is for his own good, and whoso is blind is blind to his own hurt”.(15)

Lord. It asked them to revive their true and original spirit, and to co-operate in that which was common to them all, that is, service of God. Their actions are to be judged by God. Man is not to force convictions. All will have results of their thought and action.

"Those who believe (in Muhammad's message), i.e. the Muslims, and those who are Jews and Sabeans and Christians and Magians and the who set up gods (with Allah) --- Allah will decide between them on the day of Resurrection. Allah is surely a Witness over all things".(7)

Reviling and maligning each other was the practice of the day among the followers of different religions, when Islam appeared on the scene. It advised them not to do that. "The recognition of rival religious systems as possessing a divine revelation gave to Islam from the outset a theological basis for the toleration of non-Muslim,"(8) says the encyclopedia of Religion and Ethics. Judaism and Christianity are represented in the Qur'an as form of faith brought to man by Divine Messengers. The recognition of a common Creator-Lord for all is put forth as the basis for friendly relations with the followers of rival creeds.

"Dispute ye not, save in kindest sort, with the people of the Book, save with such of them as have dealt wrongly (with you), and say ye, 'we believe in what has been sent down to us and hath been sent down to you. Our God and your god is one, and to Him are we self-surrendered'"(9).

Passage after passage in the Qur'an recommends toleration of religions other than Judaism and Christianity. "The clearest injunction of toleration," says again the encyclopedia of Religion and Ethics, is in the verse 'Let

Islam and Toleration

All great religions have contributed toward human peace and progress. Religious scriptures abound in valuable teaching. Humanity would have been deprived of the light of life, if religions were not there. Their outer forms may differ, their core and kernel is the same.

"There is one Lamp in this world, and through its illumination where I see, different assemblies are flooded with light"--- Faghani.

To benefit from light was easy, but to appreciate that there is a common source of light took ages for man to realise. Gradually it is dawning now on man that religion is a common asset of humanity. Its variety is its beauty. There is unity in diversity. The contribution of Islam in this connection is manifold. The greatest trouble that arose among religions sprang up from lack of accommodation and toleration. Islam, the most maligned religion of the world, initiated a new era of toleration. Draper in his *History of the Intellectual Development of Europe* says: "With a liberality to which the world had of late become a stranger, he (Muhammad) admitted the salvation of men of any form of faith provided they were virtuous". Draper's observation is based on the appreciation of the Qur'anic teaching:

"Verily, They who believe (in Muhammad's Message), i.e., the Muslim, and they who follow the Jewish religion, and the Christians, and the Sabeans—whosoever believes in God and the Last Day, and performs right action, shall have their reward with their Lord: fear shall not come upon them, neither shall they grieve"(6).

Original Spirit

Islam never aimed at the extermination of religions other than itself. It allowed them a position of honour and respect as systems based on messages from the Almighty.

Religion has come to reveal good, so that it enlightens the path of life. Man, the masterpiece of Divine dexterity is here, on the noble mission of love and mercy. That is the essence of religion and spirit of morality. Religion rightly understood is the greatest gift of God and the most valuable asset of man. Religion misunderstood in the worst weapon in the human hand, and can be used for murder and suicide. Are not the lessons of history sufficient for man, to deter him from ignoring the true spirit of religion? It is an accepted theme that life, property and honour of any person, in spite of difference of form, magnitude and value, have to be honoured by all and not molested by any. The same applies to religion. If it is not your religion, it is the religion of someone else. If you do not accept it, respect it as the other person's property. You consider it wrong, but he considers it right. Force and compulsion will not determine the truth. The man with the "wrong" religion is your ailing brother. Would you throw him away? Can you hate him for difference of temperature? Can you crush him and finish him? No, you cannot. Why should not then the believers in religion respect difference of opinion? If other rights of man are accepted, why should not his right to choose freely a course of life, and to stick to it faithfully, be accepted, provided that right is not exercised to damage human interest? If one sincerely believes that the other man is wrong, the best course is to apprise him of the ditch, and warn him of the fall. But you cannot push him into the ditch. You have to save him. Use all persuasive methods and leave him to his destiny.

"And if your Lord had pleased, those who are in the world would have believed, all together. But will thou force men till they become believers? And it is not for any soul to believe except by Allah's permission"(5).

darkness. The "persecuted" have lived and the "persecutors" are lost. No sword or dagger has ever won the hearts. Voracious lions could eat the flesh and crush the bones of the early Christians, but could not crush the love for their faith and the urge to make personal sacrifice for their religion. Like other early histories of religions the early history of Islam abounds in instances of sacrifice and martyrdom.

The persecutors killed them, but the martyrs never died. They still live in history. They live in the mind of man extolled on the highest pedestal of esteemed memory. They lived for their religions. They could die for them but would not abandon them. They died, but "do not call them dead." Says the word of God, "they live eternally but you do not understand"(4). Persecution and toleration have been changing pans and crossing floors in history. Through these bloody scenes have passed the great faiths of mankind, and if we care to learn the lesson, it is clear, that compulsion failed, and failed invariably. Faith cannot be uprooted by force.

Aim of Religion

Religion came to sublimate hearts, to elevate minds, and to unite mankind for love and peace. Patriarchs and prophets all stood for one aim, and that was to make man realise the divine plan of things, to facilitate his life here and hereafter, to tie mankind in bonds of fraternal love for a smooth sailing of human life in the ocean of peaceful progress. Religion came to cement humanity and not to disintegrate it. It came to unite hearts and not to tear them asunder. The great mystic of Islam, Maulana Jalaluddin Rumi says:

"You have come to combine and unite the hearts. You have not been missioned to segregate and isolate them"

RELIGION AND TOLERATION

Religion is a set of meanings and behaviors having reference to individuals who are satisfied by accepting their truth.

“Everyone has a direction towards which he turns”(1).

“Every one rejoices in that which is with him”(2)

Religion, in whatever form, is the greatest asset and treasure for its believers, and no amount of force and persecution can up-root it. Loving persuasion may win the hearts but compulsion can never succeed. “There is no compulsion in religion,”(3) is the verdict of God, and should be the ideal of all truly religious people.

Religion is a way of life. It is a set of guiding principles. We believe in the verity of these principles and hold them high in esteem. We attach the greatest amount of importance to our religion. We love to live for it. We are prepared to die for it. That is our right, and no one has the right to snatch away that right from us. This is called religious liberty, and is accepted to be the highest achievement in religious thought. The world with its vast resources to know things at large is coming round to a realization of this much-needed lesson.

Persecution

All religions have had periods of persecutions, when the accepted truth was tried to be extracted from the minds of the faithful by force. All kinds of atrocities were perpetrated.

On innocent people simply because they could not make their “faith pattern” conform to the will of the persecutor. Martyrs of all religions still serve as beacons of spiritual enlightenment for those who love light and shun

house of Peace. O Lord of Glory and Grace
thine is the Bliss and Elevation."

References:

1. Al- Tin/4
2. Al- Baqarah/ 30
3. Al- Mulk, 1-2
4. Al- Mu'minun/ 115
5. Al- Hashr/ 24
6. Al- Hashr/ 24
7. Al- A'la'/ 1-3
8. Al- Tin/ 4
9. Al- Nisa/ 1
10. Al- Shams/ 7-10
11. Al- Baqarah/ 38
12. Fatir/ 24
13. Al- Nahl/ 36
14. Al- Nisa/ 164; Al- Mu'min/ 78
15. Yunus/ 47
16. Al- Nahl/ 36
17. Al- Nahl/ 36
18. Al- Baqarah/ 256
19. Al- Hajj/ 39-42
20. Al- Baqarah/ 190
21. Al- Nahal/ 36
22. Al- Baqarah/ 4
23. Al- Baqarah/ 136
24. Al- Baqarah/ 285
25. Aal- Imran/ 63
26. Al- Baqarah/ 62
27. Al- Imran/ 63
28. Al- A'raf/ 158
29. Al- Baqarah/ 115
30. Encyclopaedia of Britannica, article, Bible
31. Al- Baqarah/ 115
32. Al- Hajj/ 40
33. Al- Jinn/ 18
34. Al- Baqarah/ 256
35. Al- An'am/ 108

like, or to practise whatever they deem fit. The difference of faith or creed does not hamper anyone's chances of progress of development in a country where Islam wields power. Islam strictly prohibits the disparagement of any faith whether true or false. Even false gods cannot be abused.

"And abuse not those whom they call upon besides Allah, lest exceeding the limits they abuse Allah through ignorance. Thus to every people we have made their deeds fair seeming; then to their Lord is their return, so he will inform them of what they did."(35)

Conclusion

In conclusion it may be stated that through its teachings regarding fundamental unities, viz., the unity of creation, the unity of mankind, the unity of Divine guidance and the unity of purpose of life, Islam initiated an era of inter-religious, interfaith, international toleration and goodwill. Islam as its Arabic form denotes is Religion of Peace-peace with the Creator and peace with the creation. It's primary consideration and ultimate goal are to bring about peace in the world. The recognition of one Creator, and one cosmically well-knit and well-organized universe, one fraternity of mankind, one sisterhood of religions, and one purpose of life, means peace for all. Islam aims at bringing about a society which would live with open eyes, open mind, open heart and open avenues of progress towards the goal of universal peace. Islam is the religion of peace, stands for peace, works for peace and aims at peace. The well known prayer which is recited by all Muslims so many times during the day says:-

"O Lord you are Peace, from you comes Peace, and to you returns Peace, make us, O Lord, live in Peace and allow us to enter the

Here protection of the places of worship to whatever religion they belong is described as helping God, i.e. serving the cause of God the cause of peace and general welfare of Humanity. Thus Islam not only inculcates the spirit of tolerance towards temples of other religions but also makes it a bounden duty of the Muslims to protect them. The Muslims have generally been following this policy during the days of their glory.

As for the Muslim places of worship, the Prophet of Islam is reported to have said that "the whole world has been made a mosque for him," meaning thereby that God can be worshipped anywhere and everywhere. But when particular places of worship are raised in the name of Allah, which are called the Masajids or the mosques, they are only to be used for His and only His worship⁽³³⁾. Mosque could be thrown open to members of other faiths for Divine worship, provided that did not create any awkward situation for any one of the two concerned faiths. It is a well-known fact that the Holy Prophet of Islam, (peace be on him), permitted the deputation of Najran to hold their service in the *Masjid-e-Nabawi* at Madina which is one of the most sacred mosques of Islam.

In conclusion, Muslims are required to respect all places of worship, whether they belong to their own religion or other religions.

Islam and Freedom of Religious Practice for Other Religions

Islam does not interfere with anyone's faith or conviction. It opens new vistas of religious understanding for believers of other faiths, but "there can be no compulsion in religion", says the Holy Qur'an (34). A non-Muslim under no circumstance can be forcibly converted to Islam or can be victimized for his adherence to any other religion. Non-Muslims are free to believe in whatever they

Islam thus respects Divine guidance and revelation, but is cautious enough to discriminate between the authentic records and the less correct versions. But whatever form or contents religious scriptures may have taken, a Muslim is duty-bound to show respect to these books because they are respected by others.

Islam and places of worship of other religions

Islam does not believe that one particular geographical spot is sacred; or one particular direction is specifically the direction towards Allah. The Qur'an says, "To Allah belongs the East and the West" and therefore to whatever side you turn you will find God there"(31). God is omnipresent and because He is omnipresent the sanctity of His presence makes the whole universe holy and sacred. Monopolies of sanctity and holiness are not acknowledged. There may be certain places which are sacred on account of their association with prophets and holy personalities, but so far as Divine presence is concerned, God does not particularly live or dwell in a particular place. The places of worship that men have raised for the worship of God and glory of His name all deserve people's respect, provided such places are not used for the glorification of beings other than the supreme being. Muslims are duty bound to protect these places of worship, whether they are synagogues, churches, temples or mosques which are used for the glorification of the Divine Name of Allah. The Holy Qur'an says:

"And if Allah did not repel, some people by others, cloisters, and synagogues, and mosques in which Allah's name is much remembered, would have been pulled down. And surely Allah will help him who helps Him."(32)

A question naturally springs up there, that if all religions are acceptable, what is the need for the Islam of Muhammad (Peace be on him). We have already explained that Islam recognises all religions in their true form to be Islam. Muhammad (Peace be on him) according to Islam is one of the Prophets. He preached the true religion of God like hundreds of his predecessors. He invited the followers of religions to a common platform (27), reminding them that that was the real purpose of revealed religion. It is this universal invitation for co-operation in righteousness and piety" that makes him a "Universal Teacher"(28) and a "Mercy for all nations"(29). The Muslim point of view is that without accepting this universal invitation real understanding of religion is behind date. It is this need which necessitates the acceptance of the teacher, who stood for the final collaboration of the work of the great teachers before him. By accepting Muhammad (Peace be on him) all Prophets are accepted and respected. To a muslim the belief would be incomplete if all are not accepted.

Islam and Scriptures of other Religions

Having accepted the universality of Divine revelation Islam respects the revelations given to other religions. The position in this connection needs a bit of explanation. Islam believes that before it, other religions had their scriptures, which were the records of Divine revelation given to their respective founders, but these have not been properly preserved and in their present form they are not without the impress of the vicissitudes of time. This statement though very seldom properly appreciated by the followers of other religions, is historically and scientifically very very true and correct.(30) Latest researches in comparative religion have led to the same conclusion as arrived at, through revelation, by the Prophet of Islam. (Peace be on him)

and Isaaq and Jacob and the tribes, and (in) that which was given to Moses and Jesus, and in that which was given to the Prophets from their Lord, we do not make any distinction between any of them and to him do we submit".(23)

"The messenger believes in what has been revealed to him from his Lord, and (so do) the believers. They all believe in Allah, make no difference between any of his messengers."(24)

This teaching of accepting truth in its universal form, and respecting the great teachers of truth provides an opportunity to the Muslims to extend the hand of goodwill and co-operation to religions other than their own.

"Say : People of the Book, come to a word common between us and you, that we shall not worship anyone, but Allah and that we shall not associate aught with him, and that some of us shall not take others for Lords besides Allah." (25)

Islam and standard of acceptance with God

Islam is a liberal religion, and has, therefore, not denied rewards to the followers of religions other than itself, for right beliefs and good actions.

"Those who believe in Islam, and the Jews, and the Christians, and the Sabians whoever believe in Allah and the last day and do good they shall have their reward from their Lord, and there is no fear for them, nor shall they grieve." (26)

Religions talk about salvation. The door of salvation, is considered by Islam, to be open for all people who have believed and acted rightly.

Islam and Prophets of other Religions

As already explained, Islam teaches that revelation is a universal phenomenon and that Divine Guidance has never been, and is not the monopoly of one particular nation. The rays of the sun of revelation have been illuminating the paths of life of various nations in the world. Those whom Divine Mercy selected specially to guide others, and to whom the Divine message was given directly, are the real benefactors of Man, who learnt morality, law and ethics through them. The Holy Book of Islam mentions by name less than 30 of such Prophets. But has at the same time stated that there were other Prophets whose names have not been mentioned in the Qur'an:

"And verily we sent messengers before thee, of them are those we have mentioned to thee and of them are those we have not mentioned to thee." (21)

The revelation given to the Prophet of Arabia seems to mention by name only those Prophets with those names and fames the Arabs were fully conversant. There is a tradition of the Holy Prophet which describes the number of Prophets in thousands. A Muslim has to believe in all these Prophets and to revere and respect their sacred memories. The Qur'an says :

"They (the muslims) believe in what has been revealed unto you, and also in that which was revealed before you." (22)

There are other verses too which repeat the purport and substance of this verse. A Muslim cannot be a Muslim unless and until he respects the memory of all the Prophets, the great leaders of religious thought.

"Say : We believe in Allah and (in) that which has been revealed to us, and (in) that which was revealed to Ibrahim, and Ismael

Prophet and his immediate followers acted according to this spirit and the light of Islam spread out in the world. Islam spread out in the world through its golden teachings, which included basically the respect of Religion and the respect of Man. Compulsion in religion is prohibited in Islam.

"There is no compulsion in religion. The right way is indeed clearly distinct from error. So whoever disbelieves in the devil, and believes in Allah, he indeed lays hold on the firm handle which shall never break." (18)

Islam and Religious Wars

Islam never fought against any religion. Muhammad, (peace be on him) never fought any battles against Judaism or Christianity or any other religion. He was always prepared to let them live, provided they let Islam and its followers live also. So the battles that we have in Islam in its earliest period were not battles between religion and religion. They were battles between the followers of one religion and the followers of other religions, while the former were tormented and tortured to the extremest extent. One can clearly say that Islam never fought, but its followers were forced to fight against those who fought against them. The permission was definitely based on self-defence.

"Permission (to fight) is given to those on whom war is made, because they are oppressed. And surely Allah is able to assist them those who are driven from their homes without a just cause except that they say: Our Lord is Allah." (19)

"And fight in the way of Allah against those who fight against you, but be not aggressive. Surely Allah loves not the aggressors." (20)

Religion? It is respect for the 'Commandments of God and mercy and kindness for His Creation.' Religion is the Code of selfless service to the whole of Divine creation, especially man.

With this realisation of joint and collective responsibility, a Muslim cannot disparage any system of life and guidance, and cannot hate any specimen of Divine Creation. This brings us to the very specific attitude of Islam towards other religions. Islam believes that true religion is one in origin. It is the emanation of the one Eternal Light.

"There is one lamp in this Universe and from the light of that one lamp, wherever I see, I find assemblies illuminate." (17)

Islam, therefore, inculcates an understanding and realization of the basic truth. A Muslim, if he understands what Islam is, can never talk of any religion disparagingly. He has to respect all religions, and the Prophets of all religions. He has to show respect to the leaders of religious orders. In respecting religions the question of true and untrue and good or bad does not arise. Man is respected in Islam as Man, and Religion is respected as Religion. Just as we have good men and bad men and in spite of that fact the dignity of man does not lose its importance and respect, similarly there may be religions which retain their original intrinsic truth and there may be religious systems which unfortunately through circumstances have swerved away from the original pattern. As religions they have to be respected. This was the ultra noble tradition of religious toleration and mutual understanding initiated by the great Prophet of Arabia. (peace be on him)

Islam and Tolerance of religious differences

This basic toleration of differences of opinion underlies the complete goal of life set by Islam. The

also basically one, i.e. "Allah be worshipped and evil be shunned!" (16)

This gives us the third unity according to Islam that is the unity of Divine Guidance. The Creator being one, and the nature being one, there could not be two guidances. So according to Islam the basic guidance behind all true religions, and underlying the messages of all true Prophets was one. True religion in its essence is one and the same everywhere. The difference in form is either on account of the geographical environment or the immediate human circumstances. This would explain the variety of juristic details in the theologies of various religions. In Islamic Phraseology this is called *Sharia* or "*Minhaj*." Hundreds of Sharias are found in history but the basic religion behind them all is one.

Islam and Unity of purpose of life

We have already explained that according to Islam there is one Creator of the whole creation. There is a well-knit, well-integrated, cosmic unity behind all orders of existence. Man, the soul of all creation, has one origin, has one source of maintenance and again one source of guidance. Having had one origin of existence and guidance man has to possess essentially one purpose of life. That purpose of life has been very definitely given by the Qur'an, as the realization of the supremacy of the Supreme Being, and the effort to avoid all evil so that the Universe and the Mankind both move according to the Divine Plan

Respect for Religion and Religions

With the aforesaid four fundamental unities, i.e. the Unity of Creation, the Unity of Mankind, the Unity of Guidance and the Unity of Purpose, Islam puts a joint responsibility on man to realise and understand the plan of the Creator, and to help and serve His creation. "What is

thus had to bear a stamp of permanent basic unity plus transitional environmental demands. Wherever man lived, his cravings and longings had two aspects. The basic urges of man were similar everywhere, but besides these, there were cravings cropping up from immediate local needs of his life. Islam says that the basic guidance was given by the Creator Himself.

"And the soul and its perfection! So, he revealed to it, its way of evil and its way of good; he is indeed successful who keeps it pure, and he indeed fails who buries it." (10)

Mankind with this basic guidance spread out in the vast world. Whenever the basic guidance was ignored or lost sight of, the Creator Lord sent reminders to revive the forgotten guidance.

"Surely there will be coming from me guidance to you, then whoever follows my guidance, no fear shall come upon them, nor shall they grieve." (11)

This guidance was sent through those chosen ones whom we generally call Prophets. Prophets, according to Islam, were raised in all nations.

"Verily we have sent thee with the Truth, a bearer of good tidings and a warner; and there hath not been a nation but a warner hath passed among them." (12) "And certainly We raised in every nation a messenger, saying: Serve Allah and shun the devil." (13) "And verily We sent messengers before thee, of them are those we have mentioned to thee, and of them are those we have not mentioned to thee." (14)

"And for every nation there has been a messenger." (15)

Thus Islam believes that Prophets were raised for the guidance of mankind wherever it lived. Not only this but it stresses that the main object in raising Prophets was

therefore, takes all existence as one whole, and thus prepares itself to consider all problems regarding the Universe as pivoted upon one central power.

Islam and Unity of Mankind

After the Unity of Creation, Islam invites attention to the Unity of Mankind. Man, as is already mentioned, has been described as the vice gerent of God, and the Masterpiece of His creative capacities.

"Verily we have created man in the best make."(8)

This masterpiece of creation, although found in various colours and shades in the expanse of this vast inhabited world, has had one origin. The Holy Qur'an says:-

"O people of the world be mindful of your duties towards your Lord, who created you from a single being, and created its mate from the same kind and spread from these two, men and women."(9)

This verse of the Qur'an definitely throws light on the common origin of mankind. The Holy Prophet of Islam is reported to have said "Mankind is the family of God." As there are not two Gods there could be no two families. Humanity is basically one. The nature of man is one. It's fundamental needs and urges are one. This unity of mankind, socially and politically enables us to appreciate the common origin of man in the East and the West, and the South and the North. It also throws light on the fact that mankind while spreading out in the world acquired various habits and customs on account of its different geographical and anthropographical environments.

Islam and Unity of Guidance

Human nature being one, the basis of internal demands of man always remains unswervingly one, but the immediate needs under pressure of circumstances and environments remain changing. The way of life for man,

has not been created aimlessly. There is a definite purpose of life, and a very specific goal set before it.

"Do you then think that we created you in vain, and that you will not have to return to us."(4). Life has thus a plan behind it. Let us, therefore, study it from the point of view of Islam.

Islam and Unity of Creation

The basic plan of life is explained by Islam by the pronouncement of certain unities. The first and the basic unity described by Islam is the Unity of Creation. The Holy book of Islam says:-

"He is Allah, the Creator, the Maker, the Fashioner. His are the most beautiful names. Whatever is in the heavens and the earth declares His glory; and He is the Mighty, the Wise." (5)

"Our Lord is He who gave to everything its creation (i.e. created it) and then guided it".(6)

"Glorify the name of the Lord, the most high. Who created, and perfected, and who measured and guided (Everything)"(7)

God brought this Universe into existence from non-existence. All creation had its source and origin in the creative powers of the Supreme Being. All that we see and observe and all that exists whether we see it or not, has been brought about by God. This Unity of Creation is the fundamental belief about the relation of God and the Universe in Islam. God created this Universe and has not severed relations with it, but is maintaining and retaining it by providing facilities of progress and evolutionary development. This attribute of God is called "Rububiyat". There is one Rabbul Alamin that is the Maintainer of the Universes. This again leads to the same conclusion that the Universe is the outcome of one creative power and is being maintained in development by the same power. Islam,

together, in a much more agreeable atmosphere than the one we are living in. It is beyond the scope of this paper to deal with all or even the major living religions of the world. The present study is devoted only to the attitude of Islam towards other faiths.

Islam - the significance of the name

One peculiar feature of Islam is that its name is not based on an attachment with a person (as we find in most of other religions). The word Islam, which means "Peace" or "Submission" has always been explained to be a system aiming at peace between "Man and God" and "Man and Man" or a system of thought and action based on "Submission" to the overall Divine plan of life.

Islam and the plan of life of man

In order to ascertain the relation that Islam as a religion wants to maintain with other religions, it is essential that the basic theory of life and its social responsibilities as enunciated by Islam should be studied. Islam attaches very great importance to man. "Certainly we created man in the best make."(1)

Man is the vice-gerent of God in this world. "And when thy Lord said to the angels, I am going to appoint on earth a vice-gerent."(2). Man has to deputize for the Almighty Lord in this world according to the plan of life, and the plan of the working of the universe, as given by God himself. He has a goal and a destination definitely set before his eyes. He is duty bound to move towards that destination with a clear intention and definite struggle:

"Blessed is He in whose hands is the Kingdom, and He is possessor of power over all things. Who created death and life that He might try you which of you is best in deeds"(3). The Holy Book again and again affirms that life

cannot they, working together, bring about Peace? That is serious question before everyone who believes in Religion.

Misunderstandings

We have mentioned Religion as one of the means which can be usefully employed for bringing about the much coveted and long desired peaceful atmosphere in which nations of the world can live healthily without apprehension of suffocation through ignorance and intolerance. But history says that the record of religion, itself is not without stigma. Haven't we fought battles in the name of religion? To quote one instance, which has not yet, unfortunately, submerged into oblivion, one can mention the crusades. Didn't the followers of two great religions kill each other in the name of the "Religion of Peace" and the "Prince of Peace?" Have other religions not fought against each other for the supremacy of one over the other, and has humanity not seen massacres at the hands of those followers of religions, who have been afterwards extolled to the eminent positions of national heroes and defenders of faith? The charge does not seem to be wholly unfounded. Apparently Religions have broken peace. May be that an unbiased and unprejudiced scrutiny of the case might refute the charge, and say it wasn't Religion. It was misuse of Religion. All good things can be put to wrong use. Religion was intended to be a means to Peace. In fact religions never clashed. Misunderstanding and exploitation in the name of religion created clashes. "Religion has to be distinguished from what is not Religion".

Study of attitude

In order to ascertain the utility of religion in present or future pattern of life, a study of original attitudes is essential. May be that will enable suffering humanity to find out ways and means to sit together, and agree to live

to supersede each other, but sooner or later time will determine which one of them wins the race.

Apprehended clashes

The great struggle for existence and supremacy that exists today has essentialized serious clashes. Sometime one shudders to imagine the magnitude of harm which these clashes might lead to. There are clashes between ideologies and methods both. Sane people have very rightly begun to foresee the catastrophies and disasters that these clashes in the thought and action might entail. The sound of a clash between science and humanities is dinning deep in every body's ears. The efforts to recover from the shock have also begun. The inclination to set the balance again is very marked. One fortunate feature of this inclination in thought is that, having realised that science in the name of progress is heading towards the cliff of disaster, greater attention than before has begun to be paid to humanities.

Turn towards Religion

Jealousies and rivalries seem to be cutting mankind to pieces. But some branches of learning in the field of humanities are trying to bring about peace between the warring camps. The alarming situation has necessitated reinforced keen interest in the study of Religion and Philosophy. Perhaps this may enable mankind to ward off the impending clash and disaster. More attention is being devoted to the study of Religion. Religions of late, have begun to review their records, to dig out their originals, study their rivals, and to find out the way to mutual understanding if possible. To the writer of these lines it seems to be a healthy sign - a right step in the right direction, but the results would depend on right intentions and right method. Religions have preached peace. Why

THE ATTITUDE OF ISLAM TOWARDS OTHER RELIGIONS

Man on the move

With new advancements in learning new avenues of research are opening before scholars and new branches of knowledge are cropping up rapidly. The chief demand of the time seems to be that all possible resources be exploited for progress and advancement. Man seems to be very enthusiastically devoted to the idea of progress. Though this idea is not new, yet the favour and enthusiasm shown today in this field seems to be surpassing previous records. While it is very useful and beneficial for the general interests of human progress that man should devote very great attention to his physical self and material progress, one unfortunate feature of our present day advancement sometime looks very alarming, and that is the apprehension of spiritual and moral values getting absolutely ignored. We cannot say that too much of materialistic progress has not yet had its reaction. It is there. Both in the East and in the West, there is a marked craving for keeping up the balance between the material and the non-material aspects of human progress.

Cycles of cultural advancement

Cultures and civilizations have always moved in cycles. One or two particular races always supersede the rest in the race of advancement. In history we find that very often knowledge and supremacy went with one particular people in a particular age or era. At present, we find that the West stands highest on the horizon of intellectual advancement. Our eyes see more than one nation struggling

References:

1. Fatir/ 24
2. Al- Baqrah/ 4
3. Al- Furqan/ 1
4. Al- Anbiya/ 107
5. Al- Fatihah/ 1
6. Yusuf/ 104
7. Al- Anbia / 107
8. Al- A'raf/ 157
9. Old Testament, Deut, 33/2
10. Gospel of St.John, chapter, I
11. Al- Saf/ 6
12. Encyclopedia of Britannica, article on Muhammad
13. Al- Baqarah/ 201
14. Mawatta / K. Husm al-khulq, 604
15. A.- Ahzab/ 21
16. Al- Maidah/ 3

solutions brought by the universal prophet were tried dispassionately to heal the sores of humanity.

The practical equality and fraternity preached by the universal prophet looks anxiously towards the "segregation problems" of the new civilisations. There is a lesson which only Muhammad (peace be on him) can teach. Under the glamour of modern culture and civilisation the world may ridicule today the strong stand taken by the Universal Teacher against drinking, gambling and womanising, but the moral and the cultural downfall of the modern man will soon make him shudder at the enormous loss that humanity has incurred on account of its immorality. Muhammad (peace be on him) said: "I have been sent to complete good morals and good actions"(14). He preached and practised good morals and good actions, and gave a unique system of thought and action based on them, which will always procure to humanity frank and straightforward solutions of the problems of life. Islam is a practical and practicable religion. It is the only religion which claims finality, and in this finality lies its universality, because only the final form of guidance can be advocated for all. Islam also claims that the life struggle of the prophet can serve as an excellent model of life for all. "Verily in the prophet of Allah you have the best example"(15) says the Qur'an. Thus the final and universal message of guidance was given to the world by Muhammad (peace be on him). "Today I have perfected your religion for you, and have liked Islam (the religion of peace) for you"(16). In short, according to the original claims of the Founder, Islam is the perfect and universal system of guidance, and Muhammad (peace be on him) is the universal Teacher for mankind.

"O Allah, send your choicest blessings on Muhammad, and on those who loved and followed him".

(courtesy the Pakistan Times, Lahore, dated August 2, 1963)

practical solutions of the problems of life which he taught. He preached neither extreme other-worldliness nor a passionate and selfish attachment to the materialistic gains. His message was a via media between extreme actions. He taught the prayer "Our Lord, grant us good in this world, and good in the next and save us from the torment of fire." (13)

Muhammad's mission was to enable humanity to live nobly and dignifiedly, and to co-operate for common good of the human race. Against this perspective, place his practical reforms, and you will realise the greatness of his vision in suggesting solutions for human ills and evils. What the prophets, philosophers, and saints taught in thousands of years, humanity is out, now, to ruin in no time. Suffering humanity is groaning under the rushing pressure of immoral politics. Hypocritical pacific utterances with crocodile tears conceal the worst devastating designs in the field of politics. The world needs the frank and straightforward teachings of the prophet of Islam, inculcating fair and honest deals, despite repeated treacheries from the other side. Peace under all circumstances and war, when pressed and dragged towards it, is the teaching of Muhammad. He was dragged to the scene of battle, and has left indelible marks of mercy and forgiveness on pages of History. In the field of economics, via media again is the teachings of the prophet. Extremes of capitalism and communism are deprecated, and socialistic adjustments in the interest of man in general are inculcated. It is high time that capitalism opened its eyes to see its impending disaster, which must come in spite of the monstrous bribes of the 'master capitalist's. It is time for communism to realise that it had succeeded in destroying 'peace' but had not been able to provide a balm to the wounds of suffering humanity. It is high time that the

Messiah". The Holy Qur'an mentions the prophecy of Jesus (peace be on him) about the prophet in the following words: "when Jesus, son of Mary, said: O Children of Israel, surely I am the messenger of Allah to you, verifying that which is before me of the Torah, and giving the good news of a messenger who will come after me, his name will be Ahmad".(11)

Universality of the Prophet's Teachings

The prophet of unity and universality preached, like his glorious predecessors, the message of universal truth, and announced a common platform for spiritual amity and religious unity. This offer of co-operation was extended to all 'lovers of truth' and 'worshippers of God'. Unity of God is the foundation-stone of true religion. The Prophet preached unity dauntlessly against severe opposition and hostility, and along with 'unity of God' he stressed 'unity of human race' and 'unity of Divine guidance.' He called mankind "the family of God" and laid foundation of human fraternity, based on a specific acceptance of the dignity of man'. Man as man was respectable to Muhammad (peace be on him), irrespective of artificial distinctions. He believed in, and worked for "the rise of man". "Fall of man" was no eternal handicap in his programme of "peace and progress." He preached the religion of peace for all human beings. Islam means 'submission to Allah and peace with His creation. The Prophet taught to live for peace, and to crave and pray for peace in this life, and in the life to come.

What imparts a unique importance to the universality of Islamic teachings, in their natural simplicity and practicability. Muhammad was not a dreamer. According to the description of Encyclopaedia Britannica, "of all the religious personalities of the world Muhammad was the most, successful".(12) His success which was undoubtedly a great divine favour was basically due to the

The Qur'an, is a "*Zikrun-lil-Aalameen*"(6) or a programme for the worlds, and Muhammad (peace be on him) is the "*Rahmatul-lil-Aalameen*"(7) or the embodiment of divine mercy to the worlds. Rahmat or divine mercy, is the most dominant attribute of God, and the prophet is declared to be an embodiment of *Rahmat*.

The Promised Prophet

The Qur'an stressess repeatedly that the advent of the prophet of Arabia was foretold in the previous scriptures. "They find him described in the Torah and the Gospel" says the Holy Book (8), The Muslims who accept the original intrinsic truth of the Bible believe that some of its verses point towards the prophethood of Muhammad (peace be on him). For instance, the book of Deutronomy says: "The Lord came from Sinai, and rose up from Seir to them; he shined forth from mount Paran, and he came forth with ten thousands of saints; from his right hand went a fiery law for them".(9)

The Muslims believe that Sinai, Seir and Paran stand for the places where Divine light shone through Moses, Jesus and Muhammad peace be on them. According to the Gospel of St. John(Chapter I), John, the Baptist when asked by the Jewish priests and levites, whether he was Christ, Elias or "that prophet," (10)denied being any one of these. This shows that Christ, Elias and "that prophet" were expected by the Jews. The Muslims believe that Jesus was "the Christ," and Muhammad was "the Prophet," for whom Beni Israel were anxiously waiting. These two references have been quoted just to show that the Muslims, on the evidence of the Bible and the Qur'an, have been believing since the beginning of their history, that a prophet was awaited by nations and that Muhammad was "that Prophet" mentioned in the Gospel of St. John. The Muslims call him "the prayer of Abraham" and "the promise of the

"Blessed is He who revealed the message of discrimination (between right and wrong) to His servant, that he might be a warner to the nations."(3).

Acceptance of a prophet is not acceptance of his biographical data, but it is acceptance of his fundamental claims and their historicity. It is important to know whether he himself claimed certain things or his followers and admirers haloed him with afterthought glamour. It is one of the unique features of the life of the prophet of Islam that authentic original material is available about the details of his life and mission. The Qur'an is the most authentic source of acceptable details of his claims. Those who study his life with the zeal of a devoted admirer, or with the scrutiny of a seeker after truth or even with the préjudice of one brought up in an atmosphere of dire animosity owing to political tussles of the Muslims and the non-Muslims they would all do well, if they turn to the Qur'an the original contemporary and comprehensive evidence of the claims and teachings of the prophet. For instance it will be the Qur'an which will establish, that even in the earliest Makkan revelations, which came in a period of dire adversity and helplessness, the prophet was declared by God to be a universal teacher and a universal guide. "And We have not sent you but mercy to the nations"(4). This is a very well known verse declaring the universality of his message, and the merciful and clement nature of his mission. It occurs in a Makkan chapter of the Qur'an, and was revealed in that period of his life when apparently the chance of his success seemed very remote.

Basic Concepts

It is a noteworthy fact that the basic concepts of the Islamic religion all point towards the universality of divine guidance. "Allah is *Rabb-ul-Aalameen*"(5) (Lord of the Worlds) and not the Lord of a particular race or a nation.

MUHAMMAD THE UNIVERSAL PROPHET

Islam believes in the universality of Divine guidance, which means two things. One, that revelation has been a universal phenomenon and no nation has been deprived of it. The other, that Muhammad (peace be on him) as corroborator of the previously delivered divine messages, is a universal teacher, whose message of 'unity of God' and 'unity of mankind' is a universal message, for the whole human race, irrespective of colour, class or creed.

The Holy Qur'an stresses again and again that Prophets were raised in all nations and that no nation was left without a warner(1). It is a bounden duty of each believer to accept along with the last one, the truth of previous revelations. The Holy Book describes Muslims as "believers in that which has revealed before you (i.e. the other prophets),(2). Islam recognizes revealed wisdom, as a universal asset, and accepts the complete galaxy of prophets, as a line of benefactors of human race. Recognition of the divine favour shown to others was an essential step for bringing about understanding between nation and nation, race and race, and man and man.

False Notions

It was necessary to remove the false notions of 'spiritual monopolies' and 'chosen races'. This was the greatest contribution of Islam, and the prophet of Islam who preached this universal message invited all to unite and co-operate in the 'worship of God' and 'service of humanity'. His message was for all without any exception.

References:

1. Al- Baqorah/ 183
2. Encyclopedia of Britannica, article on Fasting, vol.ix, Page 106, 1950
3. Mae culloch, Encyclopedia of Religion and Ethics, article on "Fasting" page 759 vol.V, 1934
4. S. Ameer Ali, The Spirit of Islam, Page 168, 1995
5. Ibrahim/ 34
6. Al- Baqarah/ 185
7. Bukhari, al-jami, K. al-Soum, 2/228

Where else does a nation exist in the world which has the chance of going through its complete code and perfect mode of life every year. Can there be a greater chance of mass moral education ? The establishment of positive relation between the "recitation of Book" and the "resuscitation of life" is a unique phenomenon full of immense spiritual possibilities.

Ramadan--the Month of Blessing

Ramadan is a sacred month for the Muslims. Its reverence is to be observed and its sanctity to be upheld by practising all that is good, and abandoning all that is bad. This is in addition to the prescribed fasting, to which there should be no exception except for the disabled and circumstantially handicapped. About the special blessings of this month, the Prophet of Islam, the great observer of spiritual realities, is reported to have said that "during this month the gates of Paradise are opened, and gates of Hell are closed, and the devil is chained and fettered". meaning thereby that the month brings in innumerable opportunities of acquiring moral discipline and spiritual efficacy.

The Prophet is also reported to have said: Ramadan and the Qur'an both will intercede with God for the believers, which clearly means that both of these, properly observed will carry weight in the final judgment. In one important and authentic report, the Prophet says: "He who observes the Fast with firm faith in Allah, and in obedience to His Command shall be pardoned of all his past sins." What a golden opportunity to us---the poor victims of ultra materialistic plagues. The Holy Prophet has very aptly observed.

"He who does not shun falsehood in word and deed, (must know) God is not in need of his hunger and thirst."(7)

(Courtesy, the Editor, the Pakistan Times, Lahore, W. Pakistan)

prophetic guidance the world would not have been so bright and brilliant in thought and action.

Islam believes in the universality of revelation, meaning thereby two things. One, that revelation came to all nations in different climes, and at different times in history. No nation was left without a guide or a warner.

The second significance attached by Islam to the idea of universality of revelation, is that just as there were separate revelations for different people, there is one common revelation for all and that is the Qur'an--the final book of revelation. It teaches reverence for all religions and their illustrious founders, and reiterates and corroborates their fundamental truth. It corroborates their moral and spiritual activities on a universal level.

Thus according to Islam, the revelation of the Qur'an is the greatest event in the spiritual history of man. For the commemoration of this great spiritual epoch a complete month of spiritual development and moral discipline is enjoined which is highly desirable for man as an individual and mankind as a whole, if they only understand.

Ramadan is the commemoration of the nuzul (sending down) of the Qur'an. "The month of Ramadan is that in which the Qur'an was revealed as a guide to mankind and as clear signs and proof of guidance and judgement between right and wrong, "says the Holy Book.(6)

Thus with the Muslims Ramadan and the Qur'an are inter-connected. One is the prescribed curriculum for human life, and the other is an annual refresher course for re-imbibing the spirit of guidance. The Qur'an is to be heard, read, recited and understood specially during Ramadan, and that has been the most popular practice of the Muslims.

prescribed; and where it is not required it is nevertheless practised to some extent by individuals in response to the promptings of nature."(2)

Mac Culloch in his article on 'Fasting' in the Encyclopaedia of Religion and Ethics remarks:

"Thus, fasting or abstinence, more or less complete, may be regarded as a well nigh universal practice..."(3)

The Babylonians, the Egyptians, the Aryans, and the Semites all observed fasts.

In the Semitic line the immediate predecessors of Islam, i.e. Christianity and Judaism had extolled and observed the practice with full spiritual enthusiasm. Islam, the universal religion of man, thus took due notice of the spiritual and moral efficacy of the universal institution of fasting, but it added new import and significance to it as a moral discipline.

The ancient people attached to fasting the idea of penitence more than abstinence. "The institution of fasting in Islam," says Amir Ali, "on the contrary, has the legitimate object of restraining the passions by diurnal abstinence for a limited and definite period, from all the gratifications of the senses, and directing the overflow of the animal spirits into a healthy channel. Useless and necessary mortification of the flesh is discountenanced, nay, condemned."(4)

Ramadan the Month of Recitation

"If you count the bounties of Allah you can never comprehend them all."(5)

Life is surrounded by divine favours--physical and spiritual both--which enable man to tread peacefully on the creative and progressive way of all round development.

The greatest of all Divine favours and bounties is Revelation, which came to the Prophet, who guided the world on the path of constructive righteousness. Without

RAMADAN

THE MONTH OF FASTING

Ramadan is the ninth month of the Muslim lunar calendar and is observed as a strict fast from dawn to sunset of each day in this month.

Fasting during Ramadan is one of the pillars of religious practice in Islam. The Holy Qur'an and the sayings of the Holy Prophet (Peace be on him) have laid great stress on the observance of fast for all able-bodied adults, male and female, who are not ill or travelling. Fasting has been exceedingly praised in Islam, although it is not claimed to be new.

Fasting ---- A Universal Institution

The institution of fasting has existed more or less among all nations of the world. This is borne out by history of religious institutions. How surprising it is that the unlettered Prophet of Arabia, who had no access to the history of nations, communicated this divine revelation to the world that the institution was universally known and practised.

"O you who believe, fasting is prescribed to you as it was prescribed to those before you."(1)

Explaining fasting as "complete abstention from food and drink" the author of the article on "Fasting" in the Encyclopaedia Britannica observes:

"Commonest by far, however, of all the uses of voluntary fasting, in the past, and at the present time, is its practice as an act of self-denial with definite religious intention. By the greater number of religions in the lower, middle and higher cultures alike, fasting is largely

interest to every thoughtful observer of the destinies of mankind.... We may well say the Qur'an is one of the grandest books ever written because it faithfully reflects the character and life one of the greatest men that ever breathed".(13)

"Sincerity," writes Carlyle "Sincerity, in all senses, seems to me the merit of the Koran".

"This same sincerity, this ardour and earnestness in the search for truth, this never flagging perseverance in trying to impress it, when partly found, again and again upon his unwilling hearers appears to me as the real and undeniable "Seal of Prophecy" in Muhammad".(14)

"This blessed book" says Allah "We have revealed (for you). Follow it, and fear God, so that you merit His mercy".(15)

(Courtesy, the Editor, the Pakistan Times, Lahore, W. Pakistan)

Reference:

1. Maurice A. Canney Encyclopedia of Religion, 305
2. Al- Nahl/36
3. Fatir/24
4. Al- Bayyinah/ 1-3
5. Al- Hjr/9
6. Al- Takwir/26
7. Ibn Hisham, Al-Serah al-Nabawiyah,
8. Draper, History of Intellectual Development of Europe, 1/27
9. Al-Baqarah/185
10. Bosworth, smith, Life of Muhammad,
11. Steingas, Dictionary of Islam, Article, Qur'an
12. Ibid
13. Ibid
14. Dictionary of Islam, 526
15. Al- An'am/ 155

Bosworth Smith wrote in his book 'Life of Muhammad', "Qur'an is the one miracle claimed by Muhammad – his standing miracle, he called it – and a miracle indeed it is." (10)

Dr. Steingass, the learned compiler of the English – Arabic and Arabic-English Dictionaries wrote in the article on Qur'an in Hughes, Dictionary of Islam; - "Invited to subjoin in a few further remarks on the composition and style of the Qur'an,..... I can scarcely introduce them better than by quoting the striking words of Goethe, which Mr. Rodwell places by way of motto on the reverse of the title page of his Translation. These words seem to me so much the more weighty and worthy of attention, as they are uttered by one who, whatever his merits or demerits in other respects may be deemed to be, indisputably belonging to the greatest masters of language of all times, and stands foremost as a leader of modern thought and the intellectual culture of modern time". (11)

Speaking of the Qur'an in his West Oestlicher Divan, he says:

"However often we turn to it, at first disgusting us each time afresh, it soon attract, astounds, and in the end enforces our reverence. Its style, in accordance with its contents and aim, is stern, grand, terrible – ever and anon truly sublime... Thus this book will go on exercising through all ages a most potent influence." (12)

"A work, then, which calls forth so powerful and seemingly incompatible emotions, even in the distant reader – distant as to time, and still more so as to mental development – a work which not only conquers the repugnance with which he may begin its perusal, but changes this adverse feeling into astonishment and admiration. Such a work must be a wonderful production of the human mind indeed and a problem of the highest

best of leather – perennial in durability, but not conducive to personal purity – a state in which the pomp of royalty was sufficiently and satisfactorily manifested in the equipage of the sovereign, an ox-cart, drawn by not less than two yokes of cattle, quickened in their movements by the goads of pedestrian serfs, whose legs were wrapped in wisps of straw; from a people, devout believers in all the wild fictions of shrine-miracles and preposterous relics; from the degradation of a base theology, and from the disputes of ambitious ecclesiastics for power, it is pleasant to turn to the south-west corner of the continent, where, under auspices of a very different kind, the irradiations of light were to break forth. The Crescent in the West was soon to pass east-ward to its full.”(8)

This was the influence of the Qur'an. The potentialities of its teachings are not lost. Suffering humanity whose description is not different from the one given above by Ja'far b.Abu Talib in connection with the pre-Islamic Arabia, needs a pause to ponder over the new state affair. Do we need peace? Do we need moral rehabilitation? Do we need spiritual satisfaction? Do we need a happy future for all sons and daughters of Adam? If so, we need turning to the Book, which claims to be the “guidance for mankind”.(9)

The Qur'an and Non-Muslims

The sons of Islam dazzled by the glamour of the West, are getting oblivious of their duty towards the eternal word of God, and towards presenting it properly to their brothers outside. We ought to be really grateful to some of the Western Islamists who have devoted their lives and have frankly stated their appreciation of Islam and the Qur'an.

us monotheism, stopped us from idolatry, preached truth, honesty and good treatment to our kith and kin, and trained us to be kind and helpful to our neighbours. He checked us from falsehood, sins and usurping the property of the orphans. He stopped robbery and plundering, and persuaded us to worship the Almighty Lord. We accepted his message and obeyed him. It is for this change that our people are angry with us. They tortured us and we have sought refuge in your kingdom.”(7)

This was the beginning, and after just a few years the whole of Arabia was under the influence of the new revolution. The enemies became its torchbearers, and it became, the greatest civilizing force of the world. It changed the destinies of nations, and under the influence of this great Book humanity achieved new standards of spiritual and material attainments. Where great religions and ideologies failed, the new Book of Islam worked wonders in reclaiming nations from the clutches of barbarism and savagery, and raising them to the highest pinnacles of cultural glory. It was under the influence of the liberal spirit of the Qur'an, and its cultural potentialities that the Muslims in a few centuries became the arbiters of the destiny of nations. For a contrast with the cultural status of other nations, let us hear the testimony of Draper, who while describing the cultural attainments of the followers of the Qur'an says:

“From the barbarism of the native people of Europe, who could scarcely be said to have emerged from the savage state, unclean in person, benighted in mind, inhabiting huts in which it was a mark of wealth if there were bulrushes on the floor and straw mats against the wall; miserably fed on beans, vetches, roots, and even the bark of trees; clad in garments of untanned skin, or at the

It invites all those who seek truth to come and have it. "Where are you going?" says the Book, "This is nothing but a Reminder for the people of the world, for everyone amongst you, who wishes to walk straight; and you will not wish except as Allah, the Lord of the worlds, wishes." (6)

"The Glorious Qur'an, that inimitable symphony," in the words of Pickthal, "the very sounds of which moved men to tears and ecstasy" did not only capture the literary and linguistic attention of the Arabs, who were rightly proud of their language and poetry, but also overhauled their mental structure, revolutionized their moral and social environment.

The transformation wrought by the Qur'an in an incredibly short period of time stands unique and unparalleled in human history. Let us hear the story from a son of the desert brought up in the truly pre-Islamic Arab surroundings.

The Makkans victimized the small band of believers for accepting the new faith of Muhammad (Peace be on him). Under the pressure of these tortures some of them, with the permission of the Prophet, migrated to Ethiopia. The Quraishite enemies of Islam followed these refugees to that distant country, and asked the Negus, the king of the land, to repatriate the men whom they called their run-away slaves, who had accepted a new faith. The Negus summoned them to his presence and asked them about their new religion. Jafar son of Abu Talib who was the spokesman of the immigrants spoke thus:

"O King! We were ignorant people who worshipped idols, ate dead bodies, committed sins of all type, and maltreated relatives and neighbours. The strong among us usurped the rights of the weak. Then God raised among us a Rasul (Messenger). His family and his qualities of head and heart, were fully known to us. He taught

Besides declaring the Qur'an as a Divine Message, the verse, quoted at the top, makes three positive assertions about the Holy Book: -

- (1) It is a guidance for mankind.
- (2) It contains clear and self-evident proofs of guidance.
- (3) It is a criterion or standard of judgment between right and wrong or good and evil.

Islam teaches that Divine Guidance came to all nations: "Certainly we raised in every nation a messenger, saying: Serve Allah and shun evil. Then of them was he whom Allah guided, and of them was he who had error as his due."(2)

At another place the Qur'an declares: "And there is not a people but a warner has gone among them."(3)

Thus Islam admitting the revelation of truth to all nations, makes it incumbent on its adherents to believe in the fundamental truth of the messages previously revealed, alongwith the acceptance of the Divine Message revealed, to the Prophet which supported and corroborated the previous ones. But because previous messages had been ignored and deviated from, a 'comforter' and a 'collaborator' was needed to establish the truth universally.

"Those who disbelieved from amongst the people of the Book' and the idolators could not have been heed till clear evidence came to them - A Messenger from Allah, reciting sacred pages, wherein are present all right scriptures". (4)

The Qur'an claims to be the guardian or Muhaimin of the truth preached by the previous scripture, into which distortion and interpolation had crept over centuries. It makes positive claims regarding its own preservation:

"Surely we have revealed the Reminder (The Qur'an) and we are surely its Guardian."(5)

AL-QUR'AN

A Guidance For Mankind

Al-Qur'an (from qara, to read, to recite) is the name of the Holy Book of Islam, also called al-Kitab, the Book.

It is the compilation of the Divine messages, which the Prophet Muhammad (Peace be on him) received from Allah through angelic agency. It contains 114 Chapters called Suras of varying lengths covering in all more than 6,000 'Ayats' or sentences. The messages contained in the Book were revealed at intervals during the last 23 years of the Prophet's life.

The Muslim scholars have distinguished between "the recited revelation" and "the unrecited revelation". In the first case direct revelation of the text is meant and in the second, indirect revelation of the sense or substance of the Divine message is intended. The Qur'an is unanimously and universally recognized by the Muslims as the 'recited' revelation or the direct textual revelation of the eternal divine message, i.e. the words and the sense they convey are both from the God, and the Prophet was their recipient for his own enlightenment and also for onward transmission and communication to his fellow beings.

"It is a firmly rooted conviction," says Maurice A. Canney in his Encyclopedia of Religions, "that apart from the knowledge which man obtains in any ordinary way, there is a divine knowledge which is revealed to him by inspiration. Psychology is lending more and more support to this belief or conviction"(1). The verse quoted above, and many others like it describe the Qur'an as a Divine Message, which was verbally revealed to Muhammad (Peace be on him).

not all that influence, in turn the influence of Abharamic traditions on world history? It certainly is.

References:

- (1) O.T, (Tenesis); Al-Qur'an (repeated references); Al-Khutuba al-Arab was-Seerat al-Muhammadiya (al-Khutba tul Ula).
- (2) O.T. (Genesis)
- (3) Encyc. Britannica Vol. II Art. Bible.
- (4) Encyc. of Religion and Ethics, Vol. VI, P. 657.
- (5) M. Rollins "Ancient History of the Egyptians etc" Vol. I, P.250.
- (6) Historians History of the World Vol. II, P. 56.
- (7) Ibid.
- (8) Ibid.
- (9) Ibid.
- (10) Cecil Roth, Jewish Encyclopeadia, P. 10-11.
- (11) Encyclopeadia Biblica Vol. I, Column 25
- (12) Ibid. Vol. I, Column 26
- (13) Historians' History of the World Vol.II, P. 168.
- (14) Peakes' Commentary on the Bible, P. 14.
- (15) Al:Qur'an, 6:74.
- (16) Al-Qur'an, 2: 124.
- (17) Al-Qur'an, 16 :120-123.
- (18) Al-Qur'an, 6: 162.
- (19) Prof. H. Greatz, History of the Jews, Vol, III, P.71.
- (20) Historians History of the World Vol. II, P. 56.
- (21) O.T.Gen. XV.5.
- (22) O.T. Gen. XXII. 17.
- (23) N.T. Matt. III,9.
- (24) N.T. Luke XVI 22.

This is in no way a correct appraisal of the historical contributions made by Muslim historiographers, but throws some light on their attitude towards the people of Scriptures.

Conclusion:

Thus we see whether all the available documents about Abraham are correct, partially correct, or mythological, one thing is established that the name and fame of Abraham has influenced a major part of human population of the globe through the three great Semitic Religions, viz: Judaism, Christianity and Islam. Abraham is according to Jewish tradition the progenitor of their race and founder of Jewish religion, and it is the promise of God with him to bless his progeny, that is keeping alive the enthusiasm of Beni Israel. Jesus, the great founder of Christianity, is accepted by the Christians to have come in fulfilment of the prayers and prophecies of the Jews, the descendants of Abraham and the claimants of the promise made by God to their ancestor regarding his progeny who were to be as numerous as "the stars in the sky" and "the sand on the sea shore" "in the New Testament it is declared that God can raise up children unto Abraham from stones". To rest in Abraham's bosom, the bosom of the progenitor of the race, was the summit of eternal peace.

It, therefore, cannot be denied that the Christian tradition is basically Jewish in nature.

After the Christians comes the turn of the Muslims, who claim their Prophet to be one of the descendants of Abraham, who is asked by God to follow and preach the religion of Abraham, which was Islam itself. The world owes a great deal to Semitic thought, and the influence of the Bible and the Qur'an has been changing the course of history since the days of their appearance in the world. Is

was sent to Abraham and his people. Hajj or pilgrimage to Ka'aba in Mecca is one of the five fundamental practices of Islam. Ka'aba is believed to be the house of worship of Allah, raised by Abraham and Ishmael, the ancestors of the Prophet (Peace be on all of them). Hajj is performed in commemoration of the sacrifices made by the house of Abraham. Thus we see that Abraham, his personality, his faith and his miracles are a part and parcel of the Islamic religious tradition.

For the Muslim historians Abraham is a historic personage, but their detailed histories are mostly based on the history and folklore of the Israelites. It was natural that the Muslims should be asking details from the Jews and Christians, about persons and events, which belonged to their history and were mentioned in the Qur'an. The Qur'an had mentioned some names, but natural curiosity to know more turned the Muslims to be Jewish traditions, which were not always reliable, and about the acceptance of which the Prophet had given a word of warning.

Muslim historians like Tabari, Ibn Khaldun and others who have generally critically weighed the historical versions available to them, in respect of Jewish history, except for the sacrifice of Ishmael or Isaaq, simply quote from Jewish sources, and we have already discussed Jewish sources and their position in historiography.

In this respect, one is constrained to say that the following remarks, though certainly not true in all cases, do certainly apply to our historians in connection with Jewish history.

"Even to this day, the Arabic historian, for example, has no hesitancy in putting together the works of various of his predecessors and contemporaries with the most airy disregard of the fact that his various authorities are often quite contradictory".

“Abraham was an exemplar, obedient to Allah (and) upright; and he was not of the polytheists. He (i.e. Abraham) was grateful for Allah’s favours. He chose him and guided him on the right path. (Allah says) We gave him good in this world, and in the hereafter he will surely be among the good. Then (O Prophet) We revealed to thee: “Follow the faith of Abraham the upright one; and he was not of the polytheists”.

“Say (O Prophet) My Lord has guided me to the right path, (and) the right religion, the faith of Abraham, the upright one, and he was not of the polytheists”. This high opinion about Abraham expressed in the Qur’an has perhaps moved Prof. H. Graetz to say:

“Judaism not only won over to its side many tribes in Arabia and taught the sons of the desert certain indispensable arts, but it also inspired the founder of a religion, who played an important part in the great drama of the World’s history, and whose influence survives to this day. Mahomet, the prophet of Mecca and Yathrib, was, it is true, not a loyal son of Judaism, but he appreciated its highest aims, and was induced by it to give to the world a new faith, known as Islam, founded on a lofty basis. This religion has exercised a wonderful influence on the course of Jewish history and on the evolution of Judaism”.

Prof. Graetz is not a Muslim, and is thus not expected to agree essentially with the Muslim view of revelation. He has been quoted just to show the link of traditions.

Next to the Qur’an in Muslim lore comes the position of Hadith. The authentic traditions go in the wake of the Qur’anic assertions about Abraham. In these he is described as one of the best creatures. The prayer which is suggested to be recited in the daily regular prayer service, before ending it with a salaam, specially invokes divine bliss for Muhammad and his people, like the bliss which

Abraham and the Islamic Tradition:

The fundamental source of Islamic information is the Holy Qur'an. Hadith and History come after that. So far as the Qur'an is concerned, it does not give, and does not claim to give, connected historical accounts of events. It mentions incidents from the lives of the Patriarchs and the Prophets and hints at isolated events in the history of nations by way of illustration of some moral precepts or for bringing home some ethical lessons. It is, therefore, not expected to get a coherent biographical data concerning Abraham from the Qur'an. It describes Abraham to be a friend of Allah, His prophet and apostle, and a very true and obedient servants of His Will. He is mentioned as the ancestor of the Jews, Christians and the Arabs. His devotion to the cause of monotheism and repulsion from shirk (Polytheism) and idolatry are stressed repeatedly. His father whose name or title Adhar is mentioned in the Qur'an, is described as an idolator, but his sons Isaac and Ishmael, and grandson Jacob, and great grandson Joseph, are all monotheists and Prophets of Allah. Moses, and Jesus through Mary, and Muhammad through Ishmael, (Peace be on all Prophets) are descendents of Abraham. In the Qur'an the Muslims and the people of the scripture i.e. the Jews and the Christians are exhorted to follow in the footsteps of their ancestor Abraham "who was not a polytheist". Abraham's discussions with his father and the polytheistic people of his time, are also briefly narrated. His miraculous escape from the fire in which he was thrown by orders of the king is described in the Qur'an. His readiness to sacrifice his son is also described as an illustration of his devotion to Almighty Allah. According to the Qur'an Allah declared Abraham to be leader of nations.

The religion of the Prophet of Arabia is described as the continuation of the faith of Abraham, and the Prophet is declared to be a reviver and preacher of the same.

conception of the character of this literature, it has only emphasised the crucial importance for humanity of the religious movement of which this remarkable people was the channel".

"To the first Christians, who were Jews", says the writer of the article 'Bible' in the Encyclopaedia Britannica" the law and the prophets were already sacred. Their national sacred writings were to them the oracles of God, though they could no longer be regarded as containing the whole truth of God. The coming of the Messiah had revealed God with a completeness that could not be discovered in the Old Testament.

The word of the Lord was authoritative as even Moses and the prophets were not. Yet since all the hopes of the Old Testament seemed to those Jewish Christians to be fulfilled in Jesus Christ, they more than ever were convinced that their national sacred books were divinely inspired. From this source they drew, if not the articles of their creed, at least the proofs and supports of their doctrines. Christ died and rose again, according to the Scriptures.

All the writings of the Old Testament spoke of Christ to them. Legal enactment, prophetic utterance, simple historical record, and more emotional psalm- all alike could be covered by the phrase "the scripture says", all were treated as of one piece, and by diligent use of type all allegory single passages torn from any context could be used as proof-texts to commend or defend belief in Christ.

It is not strange that Jewish Christians claimed the Old Testament as their book and found in it the confirmation of their faith. It is more remarkable that the Old Testament in its Greek dress appealed to the Gentile world and became a valued weapon in the armoury of the Christian evangelist.

generation of Jesus Christ, the son of David, the son of Abraham." (Matt I : I) St. Luke gives the genealogy of Jesus at the end of Chap. 3 of his gospel. Thus the background of Jesus being the Messiah or the Christ, lay in the acceptance of the Old Testament version of the history of religion.

"The rule of the Romans, like that of the Seleucidae before them, made the Jews fall back upon their Messianic dreams. In these the Bible played the leading part. The prophets of old had merely been religious and popular tribunes; nevertheless, by the aid of fanciful interpretation they succeeded in making them soothsayers. They were made to predict the supremacy of the Jewish nation over all others; by taking some sentences of their writings apart from the context the people discovered allusions to their future deliverer, their Messiah. Like all mythological types this ideal figure of the Messiah grew more and more clearly defined. But at the same time it assumed a loftier significance, it became purely moral in character. In face of the vastness of the Roman power, a warrior king like David would not have been enough; what was needed was rather a revealer, like Moses, to set up the kingdom of God upon earth".

The link has been acknowledged by scholars of Bible. Principal E. Griffith Jones in his article on "The Bible, its meaning, and aim", in Peake's Commentary on the Bible says: Christianity is a historical religion, i.e. it is based on the validity and spiritual significance of a series of facts without which it could never have arisen at all, all with the discredit of which it would speedily and finally lose its influence. Some of these facts lie, as we have seen, in the historical career of the people of Israel, whose literary deposit is found in the Old Testament and apocryphal books; the main fact; the main fact indeed is Israel itself". Greatly as criticism has altered our

(Gen. 3318-20, 2811-22), and that of Beersheba with Isaac (2626 f.); while the story of the imperilled wife has at least as good (or as bad) a claim to be connected with Isaac (26-II). There remain-(a) the migration from Haran or from Ur Kasdim; (b) the close affinity between Abraham and Sarah, Abraham and Hagar (and Keturah), Abraham and Lot; (c) the abode and burial of Abraham near Hebron; and, underlying all these (d) the existence of an ancestor of the people of Israel bearing the name of Abraham or Abram".

The destructive historical criticism of the Bible during the 19th century cast a gloom on the truth of Abraham story in the Old Testament, but later on reconstructive criticism took the view that not only religiously, but even in a qualified sense, historically also, the narratives of Abraham have a claim on our attention. "The religious value is for all" says Encyclopaedia Biblica, "the historical or quasi-historical for students only".

Abraham and the Christian Tradition:

The Master figures in Christian history is Jesus, son of Mary. The available details of his life are given in the New Testament. Christianity is based on the fact that Jesus was the Christ, who was long awaited by the sons of Israel, to come and redeem them. The original conception redemption, with the Jews, was perhaps political. They were waiting for a saviour to come and relieve them of their down-trodden position and to restore to them the lost glory of Israel. Gradually all hopes of moral and spiritual rejuvenation of the Israelite nation also centred in the saviour, whom they called Messiah in Hebrew or Christ in Greek translation. This "awaited one" had to appear from the house of David and line of Abraham. This hope for the advent of a saviour justifies the necessity of giving genealogical tables of Jesus in the Gospels. St. Matthew begins his gospel with the words, "The book of the

of Terah and the father of Isaac (by Sarah) and Ishmael (by his concubine Hagar). He left his birthplace in Ur of the Chaldees and pitched his tent among the Canaanite and Philistine inhabitants of Palestine, visited Egypt, and returned to dwell in Hebron. He fought to deliver Lot from CHEDORLAOMER king of Elam, AMRAPHEL king of Shinar, and their allies. God appeared to him in a vision and promised that his seed would inherit the land "from the river of Egypt to the Euphrates," made a covenant with him, and tested his loyalty by ordering the sacrifice of Isaac. On the death of his wife Sarah, Abraham purchased the cave of Machpelah as a family burial place. He married a second wife, Keturah. Abraham died at the age of 175 and was buried in the cave of Machpelah. According to tradition Abraham was the founder of monotheism (being called a "prophet" in Gen. 20:7), whilst later legends refer to him as the repository of all wisdom and science. He is the prototype of humility and kindness, famed for his hospitality. Circumcision is spoken of as "the Covenant of Abraham our Father" and Abraham is pictured as sitting at the gates of Hell not allowing any circumcised Jew to be brought there. According to hellenistic legend, he was king of Damascus. Arab legends claim that he laid the foundations for the sanctuary at Mecca. Modern biblical research is inclined to maintain his historical integrity. It is generally believed that he lived at the beginning of the second millennium B.C.E.

The writer of the article on Abraham in the Encyclopaedia Biblica says about the historical narratives of the Bible about Abraham:

"The Abraham traditions are twofold. Some belong exclusively to the great patriarch; others are almost attached to one or another of his successors. The latter we can disregard: the foundation of sanctuaries of Shechem and Behtel has a better traditional connection with Jacob.

The Biblical Record

With the above introduction we turn to the accounts of the patriarchs. Some historians would take from him his historical personality. They believe that he was originally a local deity of Hebron, or other place; and that in the course of time he was transformed, through legendary alchemy, into one of the fathers of his race. But the chief value of Abraham's character is not historical; it is religious. The Old Testament makes him the hero of faith whose confidence in the goodness and justice of God cannot be shaken.....

“Even at the beginning, religion was motive power in the history of Israel. Unshaken faith in God was the characteristic of all the patriarchs; and even if their knowledge of God was crude and imperfect, their faith in Him was sublime.

“If we consider the patriarchs as nomadic chiefs, at the head of one or more pastoral races, who willingly submitted to the command of men of superior wealth, courage, and energy, then we must look upon the wanderings of Abraham, and, Isaac and Jacob, and their successors, as a series of racial migrations, extending over centuries and resulting in frequent changes and reorganisations, with its final culmination into the historic nation of Israel”.

Abraham and the Jewish Tradition

The Old Testament records of Abram's life are part of the sacred scriptures of the Jews, and we therefore, depend on the standard Jewish Encyclopaedia edited by Cecil Roth, for giving us a brief resumé of the biblical record in this connection.

“*Abraham (Abram)*: Biblical patriarch to whom both the Jewish people and many Arabian tribes trace their ancestry. According to the biblical account, he was the son

history of any other nation. The Hebrew traditions according to which the race originated in Chaldea, and migrated thence under Father Abraham, are familiar to every one through the Bible records. There is no reason to doubt that here, as elsewhere, the national tradition represents at least a general outline of the historical truth. But the scientific historian of today looks askance at all unverified traditions of antiquity, and it is becoming more and more common to begin the history of Israel with the Egyptian sojourn. This attitude of a certain school cannot be better expressed than in the words of the Rev. A.H. Sayce, Professor of Assyriology at Oxford, who is recognised everywhere as one of the highest authorities on oriental archaeology".

In the preface to his *Early History of the Hebrews* Professor Sayce points out that "there is no infallible history any more than there is infallible philology". He declares that the history of the Hebrews, to be properly understood, must be dealt with precisely as we deal with the history of any other ancient people.

Professor Sayce lays special stress upon the fact that the oriental historians who were responsible for transmitting to us the biblical history were very different indeed from European historians of our own day. He does not hesitate to declare that for the historian it is necessary to regard the matter of the Old Testament from quite different points of view: first, archaeologically, or, in other words, critically; secondly, with the bias of the theologian, accepting the doctrines laid down by the Church.

"If so great an authority finds this attitude justifiable, surely it is open to everyone to read history of the Hebrews as interpreted according to modern ideas, and then to apply to it whatever prism of faith may suit his own fancy".

Arabs, although on page 47 Ishmael the son of Abraham and Hagar, has been mentioned just passingly.

On the other hand in Hastings Encyclopaedia, Abraham is discussed in the article "Heroes and Hero-Gods" (Hebrew), where before stating the researches of Hugo Winchler and Edward Meyer, the author of the article explains that 'there are at present in the field three main modes of interpreting the histories of Abraham, Isaac, Jacob, and Joseph. (1) They were real persons, and their histories are, in outline at any rate, true. If so, they head the list of the genuine Hebrew heroes of the purely human type, such as lie before us in the history of the conquest of Canaan and later times. (2) They are historic-genealogical—that is to say, they originally represented, not individuals, but tribes or clans. (3) They are mainly if not absolutely, to be regarded as mythological figures whose legends were later on set out in the form of human histories". After this Abraham is discussed as a mythological personality

Some historians have made mere passing mention about Abraham. M. Rollins in the Ancient History of the Egyptians, Carthaginians, Assyrians, Babylonians, Medes and Persians, Grecians and Macedonians says:

"Egypt had long been governed by its native princes, under one of whom called Pharaoh in Scripture (Gen XII. 10-20) (a name common to all the kings of Egypt), Abraham arrived there with his wife Sara."

The Archeological and the Theological Attitudes

Rothschild in "The History and Literature of the Israelites" gives a resume of the biblical records. The Historians' History of the World, that monumental work embodying a major portion of modern researches in ancient history says:

"The modern historian knows as little of the origin of the Hebrews as he knows of the beginning of the racial

ABRAHAM AND HIS INFLUENCE ON HISTORY

In this article it is not intended to give a life sketch of Abraham, the progenitor of the Jews and the Arabs, but the object in view is to show the marvellous influence that the name of this ancient personality has exercised on the three great traditions of Semitic origin. Judaism, Christianity and Islam, all the three have an established link with Abraham and his life experience, and thus more than half of humanity either through descent or on the basis of faith, have Abraham's name in the background of their convictions and religious traditions.

Historicity of Abraham:

For getting a knowledge about Abraham, we have to depend mostly on Biblical records and these sacred scriptures, according to recent researches, are not considered wholly reliable from the purely historical point of view, but the authenticity and reliability of the biblical records is beyond the scope of this paper. Historians have vacillated between acceptance and rejection of the historical data provided by the Old Testament. Some authors have gone to the extreme of ignoring the mention of Abram (afterwards called Abraham in the Bible). The well-known "Encyclopaedia of Religion and Ethics", edited by Hastings, though not a book of pure history, yet while it describes in detail the lives of religious personalities, fails to include an independent article on Abraham. The Arabs base their traditions on their lineage from Abraham, and the 'Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization, edited by Stephen and Nandy Ronart, does not contain even a small article on Abraham, the father of the

Muraqqa-i-Siddiqui

In memory of
Allama Ala-ud-Din Siddiqui

Compiled by
DR. JAMILA SHAIKAT

297.9924

ص 67 ج



* 7 2 1 9 1 - U - 6 7 *

Ilm Ulum-i-Islamiyyah

Punjab University Lahore, Pakistan

مرآۃ صدیقی

بیاد علامہ علاء الدین صدیقی

مرتبہ

پروفیسر ڈاکٹر چیمہ شوکت

مجلس ناظمین علوم اسلامیہ

جامعہ پنجاب لاہور، پاکستان